توضیح المسائل جدید

فقیہ وعارف قرآنی

آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی (رضوان اللہ علیہ)

ترجمہ وحواشی

آیت اللہ ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمٰن اور رحیم اللہ کے نام سے

فہرست مطالب

فرہنگ

ہر علمی کتاب کی طرح اس کتاب میں بھی بعض مقامات پر مشکل الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ ان الفاظ کے معنی دیکھنے کیلئے قارئین لغت کی کسی اچھی کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔تاہم وہ فقہی اصطلاحات جو اُردو لغت کی کتب میں موجود نہیں ہیں، اُن کے معنی اس فرہنگ میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

اعلم: علم میں سب سے برتر ۔

اتقیٰ: تقویٰ میں سب سے برتر۔

اہل خبرہ : وہ علماء جو مرجع تقلید کی شناخت کر سکتے ہوں۔

اجتہاد مطلق: فقہ کے تمام ابواب میں اجتہاد کرنے کی صلاحیت

استصحاب: جب کسی چیز کے بارے میں یقین ہو اور پھر اس کے بارے میں شک پیدا ہو جائے تو شک کو نظر انداز کر کے سابقہ یقین پر عمل کرنے کو استصحاب کہتے ہیں۔مثلاً اگر آپ کو اپنے لباس کے پاک ہونے کا یقین ہو اور پھر اس کے نجس ہونے کا شک پیدا ہو جائے تو اس شک کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی اور سابقہ یقین کی بنیاد پر آپ کا لباس پاک تصور کیا جائے گا۔اسے **استصحاب طہارت** کہتے ہیں۔

اثباتی: مثبت

اولویت: تقدم، فوقیت۔

انفاق : اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

اطلاق : غیر مشروط ہونا، غیر مقید ہونا۔

ایقاعات : ایقاع کی جمع ہے۔ یہ عقد کے برخلاف ایک عمل ہے۔ عقد میں فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے جیسا کہ عقد نکاح، جس میں جب تک مرد اور عورت دونوں راضی نہ ہوں یہ عقد وجود میں نہیں آسکتا۔ جبکہ ایقاع یک طرفہ عمل ہے جیسا کہ طلاق، جو عورت کی رضامندی کے بغیر بھی واقع ہو جاتی ہے۔

بیع مطلق: کسی قید و شرط کے بغیر بیچنا۔

بیع مشروط : شرط کے ساتھ بیچنا۔ جیسا کہ کتابوں کے ناشر کا کتاب بیچتے وقت شرط رکھنا کہ اس کتاب کی فوٹو کاپی کر کے بیچنا منع ہے۔

طلاق بائن: وہ طلاق جس میں مرد رجوع نہیں کر سکتا۔

طلاق رجعی: وہ طلاق جس میں مرد عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

بوالہوسی: ہوس پرستی

تعارض: ٹکراؤ

بطالت: بے کاری

تقصیر: حج یا عمرہ میں بالوں کا چھوٹا کرنا، نماز قصر کرنا۔

تبعیض : کسی حصے پر دلالت کرنا۔

تساقط: دو دلیلوں کا ایک دوسرے کو ساقط کر دینا۔ مثلاً اگر کسی حدیث میں ایک حکم بیان ہوا ہو اور اس جیسی ایک اور حدیث میں اس حکم کی نفی کی گئی ہو تو یہ دونوں حدیثیں ایک دوسرے کو ساقط کر دیتی ہیں اور دونوں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

ترائب: تریبہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سینے کی ہڈی۔

تقیید : قید یا شرط لگانا۔

خون جہندہ : وہ خون جو رگ کاٹنے پر اچھل کر نکلے۔

حلیت : حلال ہونا۔

سلس البول : پیشاب مسلسل قطرہ قطرہ بہتے رہنے کی بیماری۔

سلبی : منفی

سرقفلی : دکان کی پگڑی۔

شئون : امور، کام۔

عرفیات : معاشرے میں رائج اور معروف تصورات اور معیارات۔

عدہ رجعیہ : طلاق رجعی والی عورت کی عدت۔

عقود : عقد کی جمع۔

فقہ اکبر : عقائد کا علم، اصول دین کا علم۔

فقہ اصغر : فروع دین کا علم۔

فطام : بچے کا دودھ چھڑانا۔

قول حسن مطلق : سو فیصد صحیح قول۔

قاصر مطلق : ایسا جاہل جسے اپنے جاہل ہونے کا بھی علم نہ ہو۔

قصد انشاء : ایجاد کا ارادہ کرنا۔ جیسا کہ نکاح پڑھنے والا نکاح پڑھتے وقت مرد اور عورت کے درمیان زوجیت کا رشتہ ایجاد کرنے کے ارادے سے نکاح پڑھتا ہے۔

لواط : لواطت ، قوم لوط کا فعل۔

لعان : جب مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور اس کے پاس چار گواہ موجود نہ ہوں تو اس تہمت کے ثبوت یا عدم ثبوت کے لیئے مرد اور عورت کا مخصوص شرعی طریقے کے مطابق ایک دوسرے پر لعنت کرنا۔ اس کے بعد مرد اور عورت ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے ہیں۔

متنجس : نجاست سے متاثر چیز۔

منطوق: کسی جملے سے براہ راست سمجھا جانے والا مطلب۔

موالات: مسلسل، بغیر کسی وقفے کے۔

مساحقہ: عورتوں کی ایک دوسرے کے ساتھ جنسی بدکاری۔

متمرکز: مرکوز ہونا۔

مرجوح: وہ کام جسے کرنا گناہ نہ ہو لیکن ترک کرنا بہتر ہو۔ عام طور پر اسے مکروہ کہتے ہیں۔

موارد: مقامات

مستدل: دلیل سے ثابت شدہ۔

مفطر : وہ چیز جس سے روزہ ٹوٹ جائے۔

مضاربہ: نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر کاروبار۔

مجور: جسے اپنے مال وغیرہ میں تصرف سے روک دیا گیا ہو۔

محلل : تین طلاقوں کے بعد حلالہ کے لیئے نکاح کرنے والا مرد۔

موازین: میزان کی جمع ہے جس کے معنی ہیں معیار۔

نکاح موقت : نکاح متعہ

واجب کفائی: وہ واجب عمل جو چند افراد کے انجام دینے سے سب سے ساقط ہو جائے۔ جیسے اگر کچھ لوگ کسی مسلمان کی میت کو غسل وکفن دے کر جنازہ پڑھ کر دفن کر دیں تو یہ واجب پوری معاشرے کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بھی اسے انجام نہ دے تو سب گناہ گار ہوں گے۔

واجب عینی: وہ عمل جو ہر انسان پر واجب ہو جیسے یومیہ نمازیں اور ماہ رمضان کے روزے۔

یائسہ : وہ عورت جس کا حیض آنا بند ہو گیا ہو۔

☆☆☆

مقدمہ طبعِ اوّل

کتاب ''فقہی مسائل قرآن وسنت کی روشنی میں'' قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ کتاب دراصل آیت اللہ العظمٰی علامہ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی مدظلہ کی ''توضیح المسائل نوین'' کا ترجمہ ہے۔لیکن چونکہ اس کتاب میں دُوسرے رسالہ ہائے توضیح المسائل کی طرح صرف مسائل بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل پر بحث بھی کی گئی ہے، اس لئے ہم نے اُردو میں اس کا نام توضیح المسائل کی بجائے ''فقہی مسائل قرآن وسنت کی روشنی میں'' رکھا ہے۔

اس انفرادیت کے علاوہ کچھ اور خصوصیات بھی اس کتاب کو دُوسرے فقہاء کے رسالہ ہائے توضیح المسائل سے ممتاز کرتی ہیں۔ مؤلف موصوف اس کتاب کی تالیف سے قبل تیس جلدوں پر حاوی، عمیق اور تحقیقی مطالب پر مشتمل تفسیر ''الفرقان'' کی تالیف مکمل کر چکے تھے۔ یہ بات بھی مدِنظر رہنا ضروری ہے کہ مؤلف نے تفسیر کی اس عظیم الشان کتاب کے تمام مطالب اور مباحث حوزہ علمیہ نجف اور حوزہ علمیہ قم میں پڑھائے ہیں اور آپ کے درس میں قریب الاجتہاد طالب علموں کی نمایاں تعداد شرکت کرتی تھی۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ توضیح المسائل نوین کی تالیف سے قبل آپ پورے قرآن شریف کا

عمیق تحقیقی مطالعہ اور اس کے مطالب پر بحث کر چکے تھے جبکہ دیگر رسالہ ہائے توضیح المسائل اس امتیازی خصوصیت سے محروم ہیں۔ اس کتاب اور دیگر رسالہ ہائے توضیح المسائل کے مطالب میں اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔

علاوہ ازیں عام طور پر فقہاء میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ جب ان کی فقہی تحقیقات کا نتیجہ فقہاء کی اکثریت کے فتاویٰ سے مختلف ہو تو وہ اپنی تحقیق اور اجتہادی دلائل کو ایک طرف رکھ کر اکثریت کی تقلید اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن مؤلف محترم نے اس کتاب میں، نیز اپنی دیگر تمام تالیفات میں اس روِش کو مسترد کرتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں ثابت شدہ نظریات کو ہی اختیار کیا ہے، خواہ وہ علماء میں مشہور نظریات کے مطابق ہوں یا ان کے خلاف۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مؤلف محترم نے اپنے بعض شاگردوں کے بار بار اصرار کے بعد یہ کتاب لکھی۔ جب بھی شاگردوں کی طرف سے اس کتاب کی تالیف کا مطالبہ ہوتا تو فرماتے: ''میرے تمام اجتہادی نظریات تفسیر الفرقان میں آپ کو آسانی سے مل سکتے ہیں، لہٰذا توضیح المسائل کی قسم کی کسی کتاب کی تالیف کی ضرورت نہیں ہے''۔

لیکن طالب علموں کا اصرار تھا کہ اس کتاب کی تالیف اس لئے ضروری ہے کہ عوام کیلئے تیس جلدوں پر مشتمل عربی زبان میں لکھی گئی تفسیر کی طرف رجوع کرنا ناممکن ہے جبکہ یہ اُن کا بھی حق ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں روزمرہ کے مسائل سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

بہر حال یہ کتاب خاص طور پر ان تعلیم یافتہ لوگوں کیلئے لکھی گئی ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے فقہی مسائل کو جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اس کتاب کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو لکیر کے فقیر بنے رہنے اور صحیح وغلط کی پہچان کے بغیر اندھی تقلید کی راہ پر چلنے کو ہی عین دین سمجھتے ہیں۔

جب کتاب کا پہلا ایڈیشن طباعت کے مراحل سے گزر رہا تھا تو راقم نے اُستادِ محترم سے قلمی مسودہ حاصل کر کے اس کا ترجمہ شروع کر دیا تھا جو 31 جنوری 1990ء کو حوزہ علمیہ قم میں ہی پایہ

تکمیل کو پہنچ گیا۔ مئی 1990ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان آکر میری کوشش رہی کہ اس ترجمہ کو جلد از جلد شائع کیا جائے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ میری یہ کوششیں کسی نہ کسی رُکاوٹ سے دوچار ہوتی رہیں، یہاں تک کہ اب توفیق نے ساتھ دیا ہے۔ اس دوران اُستادِ محترم کے بعض فتاویٰ میں تبدیلی بھی رُونما ہوئی جو کہ مسلسل تحقیق، اعترافِ خطا کی جرأت اور فقط حق کی تلاش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

آخر میں افرادِ ملت سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اختلافات کو برداشت کرنا اور انہیں وجہِ مخالفت نہ بنانا، کسی بھی قوم کی ترقی اور سربلندی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جو قومیں اس خصوصیت سے محروم ہوتی ہیں، وہ چھوٹے چھوٹے اندرونی اختلافات پر آپس میں اُلجھ کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ قرآن سے بھٹکی ہوئی اُمت کو راہِ قرآن پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وہی توفیق دینے والا اور مددگار رہے۔

والحمد للہ رب العالمین

سیّد نیاز محمد ہمدانی

اکتوبر 1998ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

”اَلۡحَمۡدُلِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ وَ اَفۡضَلُ الصَّلَاةِ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ وَالنَّبِيّيۡنَ وَاَفۡضَلِ الۡخَلۡقِ اَجۡمَعِيۡنَ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّاهِرِيۡنَ الۡمَعۡصُوۡمِيۡنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ وَالسَّلَامُ عَلَيۡنَاوَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيۡنَ“.

یہ رسالہ اُن روزمرہ احکام پر مشتمل ہے جن کی تمام مکلفین کوضرورت ہوتی ہے۔ دُوسری طرف ان مسائل پرفقہاء میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ہم ان صفحات میں اوّلاً قرآن شریف اور ثانیاً سنتِ رسولؐ اللہ اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی روشنی میں اُن احکام کواس طرح بیان کریں گے کہ قرآن وسنت میں موجود ان کے دلائل کی طرف بھی مختصر اشارہ کریں گے تا کہ غیر مجتہد حضرات بھی احکامِ شرعیہ سے ان دلائل کی روشنی میں، جوکمل طور پر عرفی مفاہیم پرمبنی ہیں، شناسائی حاصل کرسکیں۔

دُوسرے رسالہ ہائے عملیہ کی ترتیب پر یہ رسالہ، جواُن قرآنی احکام کی فہرست ہے، جنہیں ہم اپنی تیس جلدوں پر مشتمل تفسیر ''الفرقان'' میں تفصیل سے زیر بحث لائے ہیں، ان طلابِ علومِ قرآن کے بار بار اصرار پرتحریر کیا گیا ہے جوتفسیر الفرقان سے درسی یا مطالعاتی آشنائی رکھتے ہیں۔

اگراس میں دُوسرے فقاء کے فتاویٰ کے ساتھ کسی حدتک اختلاف پایا جاتا ہےتو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اصلی محوراور مرکز قرآن شریف ہے یا پھروہ روایات ہیں جوقرآن کے مطابق ہیں یا کم از

کم اس کے خلاف نہیں ہیں۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ قارئین محترم ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حقیقت بینی اور منصفانہ نظر سے اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ ہم تمام مثبت اور تعمیری تنقیدات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنے اور جواب دینے کیلئے تیار ہیں، اس لئے کہ فقہ اسلامی ایک آزاد فقہ ہے جس کا صحیح راستہ صرف قرآن وسنت کے دلائل ہیں۔

اس رسالہ پر عمل کرنا انشاء اللہ تعالیٰ موجبِ رضائے خدا ہے۔

محمد صادق تہرانی
حوزہ علمیہ، قم
یکم شوال 1309 ہجری



مقدمہ طبعِ دوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

نَحْمَدُهٗ عَلٰى مَاكَانَ وَنَسْتَعِيْنُهٗ عَلٰى مَايَكُوْنُ وَنُصَلِّىْ عَلٰى عَبْدِهٖ وَرَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَآلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ

اکتوبر 1998 میں جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق سے آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی مدظلہ کے رسالہ توضیح المسائل جدید کا اردو ترجمہ ''فقہی مسائل قرآن وسنت کی روشنی میں'' کے نام سے شائع ہوا تو مختلف گروہوں کی جانب سے مختلف قسم کے ردعمل سامنے آئے۔ جن میں دو ردعمل زیادہ نمایاں تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جو اندھی تقلید کی راہ اختیار کر کے عقل وشعور کو تالا لگا کر چابی کو دور پھینک دینے کو ہی عینِ دین سمجھتا ہے۔ یہ کتاب ان کیلئے ایسے تھی جیسے بھارت کیلئے پاکستان کا ایٹمی دھماکہ یا امریکہ و اسرائیل کیلئے ایران کا ایٹمی پروگرام۔ اس گروہ کا ردعمل بھی ان کی اسی عقلی کیفیت کے مطابق ہی ہوسکتا تھا۔ جس طرح امریکہ اور اسرائیل ایران کے ایٹمی پروگرام کو روکنے کیلئے ہر حربہ استعمال کررہے ہیں اس گروہ نے بھی قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل شریعت کی تشریح کرنے والی اس توضیح المسائل کو روکنے کیلئے ہر ممکن حربہ اختیار کیا: گالی، الزام تراشی، فتوایٰ بازی اور جھوٹا پراپیگنڈہ۔ الغرض کوئی ہتھیار انہوں نے نہیں چھوڑا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اپنے عبا قبا اور عمامہ کے ''تقدس'' کا سہارا لے کر لاہور کے ایک بک سٹور کے مالک کو اس کتاب کے فروخت کرنے سے روک دیا۔ یہ ذلیل حرکت کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ مذہبِ شیعہ کی

امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر مجتہد کو قرآن وسنت کی روشنی میں رائے قائم کرنے اور اس رائے کے اظہار کی پوری آزادی حاصل ہے اور کسی مجتہد کو اس آزادی سے محروم کرنے کا صرف یہی مطلب ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند اور تحقیق حرام!!

یہ لوگ اس حقیقت کو بھی بھول گئے کہ ہمارے اصولِ دین میں سے ایک اصل عدل ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے، اس کے اصول سب کے لئے ایک ہیں۔ اگر اس کی شریعت میں اندھی تقلید کی گنجائش ہے تو سب کیلئے ہے، نہیں ہے تو کسی کیلئے بھی نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قیامت کے دن حنفی، شافعی، مالکی، یہودی اور مسیحی وغیرہ کو تو کٹہرے میں کھڑا کر کے یہ پوچھے کہ تم نے امام ابوحنیفہ، امام حنبل، امام شافعی، امام مالک، پوپ اور ربی وغیرہ کی اندھی تقلید کیوں کی لیکن شیعہ اثناعشری کو اپنے مجتہد کی اندھی تقلید کرنے پر اجر وثواب سے نوازے۔ اس دقیانوسی گروہ کے لئے ہدایت کی دعا یا تباہی کی بددعا کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو روایتی جمود سے اکتائے ہوئے ہیں اور روایتی فقہی نظام کی نارسائی سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان کے اذہان میں بہت سے ایسے سوالات موجود تھے جن کے جواب کی تلاش نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔ ان کیلئے یہ کتاب پیاسے کیلئے پانی کی مانند تھی۔ اس کتاب نے ان کے ذہنوں کی بہت سے الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا دیں۔ کئی مسائل جن پر روایتی علماء کی سوچ ان کو غیر منطقی اور غیر معقول معلوم ہوتی تھی مگر یہ اس کے بارے میں بولنے کی جرأت نہیں کرتے تھے، اس کتاب نے ان افراد کو ان مسائل پر کھل کر بات کرنے کا حوصلہ دیا۔ مجھے اس گروہ کے بہت سے افراد کی طرف سے خطوط، ٹیلیفون کالز اور ای میلز موصول ہوئیں جن میں انہوں نے اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔

تقریباً دس سال گزر چکے ہیں۔ حالات میں بہت تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ حجت الاسلام

ڈاکٹر محمد خاتمی کے دورِ صدارت میں جب ایران میں اظہار رائے کی آزادی کسی حد تک بحال ہوئی اور بعض کتب کی اشاعت پر عائد پابندیاں ختم کی گئیں تو اس کتاب پر لگی پابندی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے نتیجہ میں ایران میں اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے جس کا واضح سا مطلب یہی ہے کہ اس کتاب کے پیغام کو ایرانی عوام میں پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔ پاکستان میں بھی، غیر معقول اور غیر منطقی اندھی تقلید سے اکتائے ہوئے مومنین کی بڑی تعداد، روز بروز اس کتاب کی گرویدہ ہوتی جا رہی ہے۔ جو شخص بھی اندھی تقلید کی پٹی اپنی آنکھ سے اتار کر اس کتاب کے چند صفحات کا مطالعہ کر لیتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

بنیادی فرق

یہاں اس سوال کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی دام ظلہ کی اجتہادی سوچ اور روایتی فقہی سوچ میں بنیادی فرق کیا ہے؟ اس کا ایک سادہ اور چونکا دینے والا جواب یہ ہے کہ استاد محترم کی فقہی سوچ اور روایتی فقہی فکر کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اس سوچ کی بنیاد قرآن شریف ہے۔ یہاں ایک اور اہم سوال رونما ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر روایتی فقہی سوچ کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ہماری روایتی فقہ قرآن شریف کی بنیاد پر استوار نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ہمارے دینی مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ کے علمی اور فکری کام کی بنیاد قرآن شریف نہیں ہے۔ ہماری بات ماننا شاید بہت سے لوگوں کیلئے آسان نہ ہو لہٰذا ہم اپنے اس موقف کی تائید میں تین بزرگ علماء کے ارشادات نقل کرتے ہیں:

علامہ طباطبائی کی گواہی

1۔ استاد المفسرین علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی کتاب تفسیر المیزان شیعہ تفاسیر انتہائی بلند مقام رکھتی ہے۔ آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی دام ظلہ، آیت اللہ مرتضیٰ مطہری شہیدؒ اور آیت اللہ عبداللہ جوادی آملی دام ظلہ جیسی شخصیات کی

تربیت میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

علامہ ''تفسیر المیزان'' کی جلد 5،ص 276 (مطبوعہ قم) پر ایک طویل بحث کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولم يزل اهل البيت مضطهدين، مجهوراً حديثهم الى ان انتهض الامامان، محمد بن على الباقر و جعفر بن محمد الصادق عليهما السلام فى برهة كالهدنه بين الدولة الا مويه و الدولة العباسيه فبينا ما ضاعت من احاديث آبائهم و جد داما اندرست و عفيت من آثارهم.

غير ان حديثهما و غير هما من آبائهما و ابناء هما من آئمة اهل البيت لم يسلم من الدخيل ولم يخلص من الدس و الوضع كحديث رسول الله صلى الله عليه و آلهٖ وسلم. و قد ذكرا ذلک فى الصريح من كلامهما و عد ارجا لا من الوضا عين كمغيره بن سعيد و ابن ابى الخطاب و غير هما، و انكر بعض الآئمة روايات كثيره مرويه عنهم و عن النبى صلى الله عليه و آلهٖ وسلم و امروا اصحابهم و شيعتهم بعرض الاحاديث المنقوله عنهم على القران و اخذ ماوا فقه و ترک ماخالفه.

ولكن القوم (الاآحاد منهم) لم يجروا عليها عملاً فى حديث اهل البيت عليهم السلام و خاصه فى غير الفقه و كان السبيل الذى سلكوه فى ذلک هو السبيل الذى سلكه الجمهور فى احاديث النبى صلى الله عليه و آلهٖ وسلم. وقد فرط فى الامر الى حيث ذهب جمع الى عدم حجية ظواهر الكتاب و حجية مثل مصباح الشريعه و فقه الرضا و جامع الاخبار! و بلغ الافراط الى حيث ذكر بعضهم ان الحديث يفسر القران مع مخالفته لصريح دلالتهٖ و هذا يوازن ما ذكرة بعض الجمهور: ان الخبر ينسخ الكتاب. و لعل المتراء ى من امر الامة لغيرهم من الباحثين كما ذكره بعضهم: ''ان اهل السنة اخذوا بالكتاب و تركوا العترة، فآل ذلک الى ترک الكتاب لقول النبى صلى الله عليه و آلهٖ

وسلم ''انهما لن يفترقا'' و ان الشيعه اخذوا بالعتره و تركوا الكتاب، فآل ذلک منهم الی ترک العترة لقوله صلی الله علیه وآلہٖ وسلم ''انهما لن یفترقا'' فقد ترکت الامة القران والعترة (الکتاب والسنة) معاً.

وهذہِ الطریقة المسلوکة فی الحدیث احد العوامل التی عملت فی انقطاعِ رابطة العلوم السلامیة و هی العلوم الدینیة والادبیة عن القران مع ان الجمیع کالفروع والثمرات من هذه الشجرة الطیبة التی اصلها ثابت و فرعها فی اسما توتی اکلها کل حین باذن ربها. و ذلک انک اذاتبصرت فی امرهذہِ العلوم وجدت انها نظمت تنظیماً لا حاجة لها الی القران اصلاحتی انه یمکن لمتعلم ان یتعلمها جمیعا: الصرف والنحو والبیان واللغه والحدیث والرجال والدرایه والفقه والاصول فیاتی آخرهاثم یتضلع بها ثم یجتهد و یتمهر فیها و هو لم یقراالقران و لم یمس المصحف قط،فلم یبق للقران یجتهد و یتمهر فیها و هو لم یقراالقران و لم یمس المصحف قط،فلم یبق للقران بحسبِ الحقیقة الاالتلاوة لکسب

الثواب اوا تخاذہ تمیمة للا ولاد تحفظهم عن طوارق الحدثان! فاعتبر ان کنت من اهله.

''اہلِ بیتؑ اوران کی احادیث مہجور ومتروک رہیں یہاں تک کہ بنوامیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے درمیان امن وسکون کے وقفہ میں امام محمد باقر اورامام جعفرصادق علیہما السلام اٹھےاوراپنے آباءطاہرین کی ضائع شدہ احادیث کو بیان کیااوران کے مٹے ہوئے آثار کی تجدید کی۔

مگران کی اوران کے آباءاورابنا،آئمہ کی احادیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی طرح ملاوٹ، دسیسہ کاری اور جعل سازی سے محفوظ نہ رہیں اورانہوں نے اپنے کلام میں اسکی تصریح بھی فرمادی اورمغیرہ بن سعیداورابن ابی الخطاب وغیرہ جیسے جعل سازوں کی نشاندہی بھی کر دی۔اور بعض آئمہ نے ان سے اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی اور بہت سی روایات

کا انکار بھی کیا اور اپنے اصحاب اور شیعوں کو حکم دیا کہ ان سے منقولہ احادیث کو قرآن پر پیش کریں اور جو قرآن کے موافق ہو اسے قبول کرلیں اور جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دیں۔

لیکن اس قوم نے، سوائے چند افراد کے، اہلِ بیت کی احادیث میں، خاص طور پر غیر فقہ میں اس ہدایت پر عمل نہیں کیا اور انہوں نے وہی راستہ اختیار کیا جو جمہور نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث میں اختیار کیا۔

یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ ایک جماعت نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ظاہرِ قرآن حجت نہیں ہے جبکہ مصباح الشریعہ، فقہ الرضا اور جامع الاخبار جیسی کتب کو حجت تسلیم کرنے لگے اور یہ زیادہ روی اس حد تک پہنچ گئی کہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حدیث قرآن کی مفسر ہے چاہے اس کی صریح دلالت کے خلاف ہو اور یہ بات بعض جمہور کے اس نظریہ کی ہم وزن ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ شاید امت کا معاملہ غیر مسلم دانشوروں کو اس طرح نظر آتا ہو جیسا کہ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ: اہلِ سنت نے کتاب کو لے لیا اور عترت کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے کتاب بھی چھوٹ گئی اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ شیعہ نے عترت کو لے لیا اور کتاب کو ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے عترت کا دامن بھی چھوٹ گیا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے۔ پس ساری امت نے قرآن اور عترت، کتاب اور سنت، دونوں کو چھوڑ دیا ہے۔

حدیث میں اپنایا گیا یہ طریقہ ان عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے علومِ اسلامی کو، جو کہ دینی اور ادبی علوم ہیں، قرآن سے منقطع کر دیا حالانکہ یہ سب اسی پاکیزہ درخت کی شاخیں اور پھل ہیں جس کی جڑ ثابت اور شاخ آسمانوں میں ہے اور اپنے رب کے اذن سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ اگر آپ ان علوم کے بارے میں غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انہیں ایسے انداز سے منظّم کیا گیا ہے کہ انہیں سرے سے قرآن کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور حتیٰ کہ طالب علم کیلئے ممکن ہے کہ ان تمام

علوم، صرف، نحو، بیان، لغت، حدیث، رجال، درایہ، فقہ اور اصول کی تعلیم حاصل کر لے۔ ان میں تبحر حاصل کر لے اور ان میں مجتہد اور ماہر بن جائے اور اس نے قرآن پڑھا ہی نہ ہو اور کبھی قرآن کو چھوا بھی نہ ہو۔ پس در حقیقت قرآن کا یہی کردار باقی رہ گیا ہے کہ ثواب حاصل کرنے کیلئے اسکی تلاوت کر لی جائے یا بچوں کو حوادث سے محفوظ کرنے کیلئے اسے بطور تعویذ استعمال کر لیا جائے۔ پس اگر آپ اہلِ عبرت میں سے ہیں تو عبرت حاصل کریں''۔

آیت اللہ جوادی آملی کی گواہی

آیت اللہ عبداللہ جوادی آملی جو امام خمینی کی طرف سے گورباچوف کو اسلام کی دعوت کا پیغام دینے گئے تھے، اپنے مضمون ''ہدایت در قرآن'' میں (ماہنامہ ''پاسدارِ اسلام''، شمارہ 38، ص18 میں) یوں رقمطراز ہیں:

" لذا اعلام می کنم: باید در نظامِ حوزه علمیه تجد ید نظر شود یعنی باید تفسیر قرآن جزو در سهای اصولی و اساسی حوزه باشد چون الآن هر چه هست فقه و اصول است و استفاده از حدیث ولی از قرآن کمتر یاد می شود. کتابهای ادبی که درحوزه تد ریس می شود (نحو، صرف، بدیع، بیان، عروض وو.....) کاری با قرآن ندارد. هر جا هم استشهاد می شود از اشعار جاهلی است. البته اخیراً. بحمدلله. تلاشهای شد ه که بجای استفاده از اشعار جاهلی از قرآن و نهج البلاغه استفاده شود و امید واریم این امر تعمیم باید.

منطق که بافتش، بافتی نیست که به آیه استشهاد کند بلکه درباره طرز تفکر بحث می نماید. در اصول هیچ مسئاله ای ارتباط با قرآن ندارد و اگر یکی دو جا از آیه استفاده شد ه بیشتر برای این است که مثلاً حجیت خبرواحد را نفی کند! ازان گذشته سراسر اصول روی پایه های عقلی و مباحثِ الفاظ تکیه دارد.

امافقه با برکت ما که دائر مدار روایت است. و هیچ مسئله ای نداریم که گفته شود این مسئله در روایت نیست و فقط در قرآن مطرح شده است! بنا براین، اگر کسی در حوزه قرآن می خواند. که حتمامی خوانند. برای ثواب بردن است. نه اینکه بافت حوزه بافت قرآنی است. لهٰذا باید این میزان الٰهی در کنارِ روایاتِ معصومین علیهم السلام مورد استفادهِ قرار گیرد تا خدای نخواسته ما هم مشمول گلایه حضرت رسولؐ قرار نگیریم که: یا رب ان قومی اتخذوا هذا القران مهجوراً.

''لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں کہ حوزہ علمیہ کے نظام میں نظر ثانی ہونی چاہئے۔یعنی قرآن کو حوزہ کے بنیادی اور اساسی دروس کا حصہ ہونا چاہئے اس لئے کہ اس وقت حوزہ میں جو کچھ ہے صرف فقہ اور اصول اور حدیث سے استفادہ ہے لیکن قرآن کو کم ہی یاد کیا جاتا ہے۔ جو ادبی کتب حوزہ میں پڑھائی جاتی ہیں (نحو، صرف، بدیع، بیان، عروض وغیرہ) ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جہاں بھی کوئی مثال پیش کرنی ہو جاہلیت کے اشعار سے لی جاتی ہے البتہ ان اواخر میں، الحمدللہ، بعض کوششیں ہوئی ہیں کہ اشعارِ جاہلیت کی جگہ قرآن اور نہج البلاغہ سے استفادہ کیا جائے۔ امید ہے کہ یہ چیز عمومیت اختیار کر لے۔

منطق کی تو ساخت ہی ایسی نہیں ہے کہ آیت سے مثال پیش کی جائے بلکہ وہ تو اندازِ تفکر سے بحث کرتی ہے۔ اصول میں کوئی مسئلہ بھی قرآن سے تعلق نہیں رکھتا اور اگر ایک دو مقامات پر آیت سے استفادہ کیا گیا ہے تو خبرِ واحد کی حجیت کی نفی جیسی چیزوں میں ہے۔ علاوہ ازیں سارا علمِ اصول عقلی بنیادوں اور مباحثِ الفاظ پر قائم ہے اور ہماری با برکت فقہ کا تو مرکز و محور ہی روایت ہے اور کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ مسئلہ روایت میں نہیں ہے اور صرف قرآن میں بیان ہوا ہے۔ بنا براین اگر کوئی شخص حوزہ میں قرآن پڑھتا ہے، اور ضرور پڑھتے ہیں، تو ثواب حاصل کرنے کیلئے ہے اور ایسا نہیں ہے کہ حوزہ کی ساخت قرآنی ساخت ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ معصومین علیہم السلام کی روایات کے ساتھ اس میزانِ الٰہی سے بھی استفادہ کیا جائے تا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شکایت کی زد میں نہ آجائیں کہ: ''اے میرے رب! میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا''۔

اس مضمون کی اگلی قسط میں (پاسدارِ اسلام، شمارہ 39 ص 14) تحریر فرماتے ہیں:

''**هما نگونه که قبلا نیز بحث شده متاسفانه می بینیم هر عالمی در هر رشته ای که تخصص دا شته، تلاشش بر این بوده است که قرآن را در آن رشته راه ندهد. اگر عارف بوده از راه های. که پس ازین روشن خواهد شد. سعی کرد باقرآن تماس پیدا نکند، اگر فیلسوف بود اصرار داشت که با قرآن راه پیدا نکند، اگر محدث بود که صریحاً اعلام کرد: ظواهر قرآن حجیت ندارد و اصرار داشت که قرآن در علمش راه پیدا نکند و اگر متخصص در سایر رشته ها بودند، یا مستقیماً با قرآن درارتباط نبودند یا اگر هم از قرآن کمک می گرفتند، در حد کمک ادبی بود، هما نگو نه که از معلقات سبع، شواهد می گرفتند.**

بنا براین همه علمای رشته های مختلف دست بدستِ هم دادند تا قرآن را از حوزه های علمی بیرون بردند و کار قرآن بجای رسید که تنها برای تبرک خوانده می شود.''

''جیسا کہ پہلے بھی بحث ہو چکی ہے، بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو کوئی عالم جس کسی علم میں تخصص اور مہارت رکھتا تھا اسکی کوشش یہی ہوتی تھی کہ قرآن کو اپنے مضمون میں داخل نہ ہونے دے۔ اگر عارف تھا تو ان طریقوں سے، جن کی بعد میں وضاحت کی جائے گی، اس نے یہی کوشش کی کہ قرآن سے تعلق پیدا نہ کرنے پائے۔ اگر فلسفی تھا تو اس بات پر مصر تھا کہ قرآن کا ہمراہ نہ بن جائے۔ اگر محدث تھا تو اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ ظواہرِ قرآن حجت نہیں ہیں اور مصر رہا کہ قرآن اس کے علم میں داخل نہ ہو جائے۔ اور اگر دیگر علوم میں ماہر تھے تو یا براہِ راست قرآن سے بے تعلق تھے اور اگر قرآن سے مدد لیتے بھی تھے تو صرف ادبی کمک کی حد تک تھی جیسی وہ

سبع معلقات سے لیتے تھے۔

بنا براین تمام علوم کے ماہرین نے ایک دوسرے کی مدد کی اور قرآن کو حوزہ ہائے علمی سے باہر نکال دیا اور قرآن کا انجام یہ ہوگیا کہ صرف برکت کیلئے پڑھا جاتا ہے''۔

آیت اللہ مطہری کی گواہی

شہید مرتضی مطہری اپنی ایک تقریر میں جوان کی تقاریر کے مجموعہ دہ گفتار میں شائع ہو چکی ہے، ''قرآن ومہجوریت آن'' کے موضوع پر فرماتے ہیں:

''ما امروزاز این نسل گله داریم که چرا با قرآن آشنانیست چرا در مدرسه ها قرآن یا د نمی گیرند حتیٰ بدانشگاه هم که میروند از خواندنِ قرآن عاجزند. البته جای تاسف است که این طور است اما بایدَ از خود مان بپرسیم ما تا کنون چه اقدامی در این راه کرده ایم. آیا باهمین فقه و شرعیات و قرآن که درمدارس است توقع داریم نسل جوان با قرآن آشنائی کامل داشته باشد؟ عجبا که خود نسل قدیم قرآن را متروک و مهجور کرده آنوقت از نسل جدید گله دارد که چرا با قرآن آشنانیست. قرآن درمیان خود ما مهجور است و توقع داریم نسل جدید بقرآن بچسبد. الآن ثابت می کنم که چگو نه قرآن درمیان خودِ مامهجوراست.

اگر کسی علمش علم قرآن باشد یعنی در قرآن زیاد تدبر کرده باشد، تفسیرِ قرآن را کاملاً بد اند این آدم چقدر درمیان ما احترام دارد؟ هیچ ! !اما اگر کسی کفایه آخوند ملا کاظم خراسانی را بداند یک شخص محترم با شخصیتی شمرده می شود. پس قرآن درمیان خود ما مهجور است و در نتیجه همین اعراض از قرآن است که باین بد بختی و نکبت گرفتار شده ایم. ما مشمول شکایت رسول خدا صلی الله علیه و آلہٖ وسلم هستیم که بخدا شکایت میکند یَا رَبّ اِنّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْ ا هٰذَا الْقُرآنَ مَهْجُوْراً.

یکی از فضلای خود مان در حدود یکماه پیش مشرف شد ه بود بعتبات، میگفت خد مت آیت الله خوئی سلمه الله تعالیٰ رسیدم، بایشان گفتم چرا شما درس تفسیری که سابقاً داشتید ترک کردید (ایشان در هفت هشت سال پیش درسِ تفسیری در نجف داشتند و قسمتی از آن چاپ شده) ایشان گفتند موانع و مشکلاتی هست در درس تفسیر. گفت من بایشان گفتم: علامه طباطبائی در قم باینکار ادمه دادند و بیشتر وقت خود شان را صرفِ این کار کردند چطور شد؟ ایشان گفتند آقای طباطبائی "تضحیه" کردند. یعنی آقای طباطبائی خود شان را قربان کردند از نظرشخصیت اجتماعی ساقط شدند. و راست گفتند.

عجیب است که در حساس ترین نقاط ِ دینی ما اگر کسی عمرِ خود را صرفِ قرآن بکند بهزار سختی و مشکل دچار می شود، از نان، از زندگی، از شخصیت، از احترام، از همه چیز می افتد و اما اگر عمرِ خودرا صرف کتابهای از قبیل کفایه بکند صاحب همه چیز می شود، در نتیجه هزار ها نفر پیدا میشوند که کفایه را چهار لا بلدندیعنی خودش را بلد ند، رد کفایه را هم بلد ند رد رد اوراهم بلد ند رد رد رد اور اهم بلد ند اما دو نفر پیدا نمی شود که قرآن را بد رستی بداند!!! از هر کسی درباره یک آیه قرآن سوال شود میگوید باید بتفاسیر مراجعه شود. عجب تر اینکه این نسل که با قرآن این طور عمل کرد ه از نسلِ جد ید توقع دارد که قرآن را بخواند و قرآن را بفهمد و بآن عمل کند.

اگر نسل کهن از قرآن منحرف نشد ه بود قطعاً نسل جد ید منحرف نمیشد . بالآخر ماکاری کرده ایم که مشمول نفرین پیغمبر صلی الله علیه وآلہ وسلم و قرآن شد ه ایم. رسولِ خدا صلی الله علیه وآلہ وسلم درباره قرآن فرمود:" اِنَهُ شَا فِعٌ مُشَفِعٌ وَمَا حِلٌ مُصَدَّق"یعنی قرآن در نزدِ خدا و در پیشگاهِ حقیقت و ساطت می کند و پذیرفته می شود و نسبت ببعضی که با وجفا

کرده اند سعایت می کند و مورد قبول واقع می شود.
هم نسلِ قدیم و هم نسلِ جدید بقرآن جفا کردند و می کنند
اول نسلِ قدیم جفا کرد که حالانسلِ جدید جفا می کند".

" آج ہم اس نسل سے گلہ کرتے ہیں کہ قرآن سے آشنا کیوں نہیں ہے؟ کیوں سکولوں میں قرآن نہیں سیکھتے حتیٰ کہ جب یونیورسٹی میں جاتے ہیں اس وقت بھی قرآن پڑھنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ البتہ افسوس کا مقام ہے کہ اسطرح ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ ہم نے اب تک اس بارے میں کیا اقدام کیا ہے؟ آیا یہی فقہ، اسلامیات اور قرآن جو سکولوں میں ہے اس سے ہم توقع رکھے ہوئے ہیں کہ جوان نسل قرآن سے مکمل آشنا ہو جائے؟

کس قدر عجیب بات ہے کہ خود پرانی نسل نے تو قرآن کو متروک اور مہجور کیا ہوا ہے اور نئی نسل سے یہ گلہ کرتی ہے کہ کیوں قرآن سے آشنا نہیں ہے؟ قرآن خود ہمارے درمیان مہجور ہے اور ہم توقع رکھے ہوئے ہیں کہ نئی نسل قرآن سے چپک جائے۔ ابھی ثابت کرتا ہوں کہ کس طرح قرآن ہمارے درمیان مہجور ہے؟

اگر کسی کا علم قرآن کا علم ہو یعنی اس نے قرآن میں بہت تدبر کیا ہو اور تفسیرِ قرآن کو مکمل طور پر جانتا ہو تو ایسے شخص کو ہمارے درمیان کتنا احترام حاصل ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں!

لیکن اگر کوئی ملا کاظم خراسانی کی کتاب "کفایہ" کو جانتا ہو تو ایک قابلِ احترام اور با حیثیت شخص سمجھا جاتا ہے۔ پس قرآن ہمارے درمیان مہجور ہے اور قرآن سے اس روگردانی کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم اس بدبختی اور زبوں حالی میں مبتلا ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شکایت کے زمرہ میں آتے ہیں جو آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کریں گے۔ "اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا"۔

ہمارے اپنے فضلا میں سے ایک صاحب تقریباً ایک ماہ قبل زیارات کرنے گئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں آقای خوئی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ آپ جو درسِ تفسیر کہتے تھے

اسے آپ نے کیوں ترک کر دیا (وہ سات آٹھ سال قبل نجف میں تفسیر کا درس کہتے تھے اور اسکا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے) انہوں نے جواب میں کہا کہ تفسیر میں مشکلات اور رکاوٹیں ہیں۔ میں نے ان سے کہا: علامہ طباطبائی نے قم میں یہ کام جاری رکھا اور اپنا زیادہ تر وقت اسی کام میں صرف کیا۔

یہ کیونکر ہوا؟ انہوں نے جواب دیا: ''آقای طباطبائی نے فداکاری کی۔ یعنی آقای طباطبائی نے اپنے آپ کو قربان کر دیا، اپنی معاشرتی حیثیت سے گر گئے''۔ ان کی یہ بات بالکل سچ ہے۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے دینی نقاط میں سے حساس ترین نقطہ میں اگر کوئی اپنی عمر قرآن میں صرف کرتا ہے تو ہزاروں مشکلات اور سختیوں سے دوچار ہو جاتا ہے۔ روٹی، زندگی، شخصیت، احترام اور ہر چیز سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اگر اپنی عمر کو کفایہ جیسی کتابوں میں صرف کرے تو اسے ہر چیز ملتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے افراد موجود ہیں جو کفایہ کو چار گنا جانتے ہیں۔ یعنی خود کفایہ کو جانتے ہیں۔ اسکی رد کو جانتے ہیں۔ اسکی رد کی رد کو جانتے ہیں اور رد کی رد کی رد کو بھی جانتے ہیں مگر ایسے دو آدمی بھی نظر نہیں آتے جو صحیح طور پر قرآن کو جانتے ہوں!!! جس سے بھی قرآن کی کسی آیت کے بارے میں سوال کیا جائے، یہی کہتا ہے کہ تفاسیر کی طرف رجوع کریں۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ یہ نسل جس نے خود قرآن کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے نئی نسل سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ قرآن کو پڑھے، قرآن کو سمجھے اور اس پر عمل کرے۔

اگر پرانی نسل قرآن سے منحرف نہ ہوتی تو یقیناً نئی نسل بھی منحرف نہ ہوتی۔ آخر کار ہم نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن شریف کی نفرین کی زد میں آگئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے بارے میں فرمایا: ''اِنَّهُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ وَمَاحِلٌ مُصَدَّق''۔ یعنی قرآن اللہ کی بارگاہ میں شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت قبول کر لی جائے گی اور جنہوں نے اس پر ظلم کیا ان کی شکایت کرے گا اور یہ شکایت بھی قبول کر لی جائیگی۔ پرانی

اور نئی نسل دونوں نے قرآن پر ستم کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ پہلے پرانی نسل نے ستم کیا اور اب نئی نسل ستم کر رہی ہے''۔

قارئین محترم! ان تین بزرگ علماء کے ان بیانات کا، خاص طور پر نمایاں کئے گئے حصوں کا، ایک بار پھر غور سے مطالعہ فرمائیں اور اپنے ایمان وضمیر کی روشنی میں فیصلہء کریں کہ جب دینی علوم کے مراکز میں قرآن شریف کا کوئی علمی کردار ہی نہیں ہے اور وہاں بھی عوام کی طرح قرآن صرف حصول ثواب کے لئے پڑھا جاتا ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان مراکز میں ہونے والا علمی و تحقیقی کام قرآن کے مطابق ہوگا؟ ظاہر سی بات ہے کہ ایسے علمی مراکز میں اگر کوئی مجتہد عمومی روش سے ہٹ کر، قرآن مجید کو اپنی علمی تحقیقات کا بنیادی مرکز قرار دے تو اس کی تحقیقات کا نتیجہ عام طور پر بیان کئے جانے والے نظریات سے مختلف ہوگا۔ اب یہ کس قدر ظلمِ عظیم ہے کہ خود اپنے مطالعات میں قرآن کو داخل نہ ہونے دیا جائے اور اگر کوئی قرآن کی بنیاد پر تحقیق کرے تو اس کی مخالفت میں محاذ کھول لیا جائے، اس کے لئے مشکلات پیدا کی جائیں۔ آیت اللہ خوئیؒ مشکلات کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور اعتراف کریں کہ علامہ طباطبائی کو تفسیر کا کام اور قرآن کی خدمت کرنے کے لئے قربانی دینے پڑی۔ اب قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ انہیں قرآن مجید کی بنیاد پر قائم اجتہاد سے رہنمائی لینی ہے یا اس اجتہاد سے جس کا قرآن سے تعلق نہیں ہے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام کی تعلیمات میں ہمیں کیا حکم دیا گیا ہے؟

''عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَ سَلَّمَ :

اِنَّ عَلٰی کُلِّ حَقٍّ حَقِیْقَۃٌ وَ عَلٰی کُلِّ صَوَابٍ نُوْرٌ،فَمَا وَافَقَ کِتَابَ اللّٰہِ فَخُذُوْہُ وَمَا خَالَفَ کِتَابَ اللّٰہِ فَدَعُوْہُ''.

''امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر حق

پر ایک حقیقت اور ہر صحیح بات پر ایک نور ہوتا ہے، پس جو بات کتاب اللہ کے موافق ہو اسے لے لو اور جو کتاب اللہ کے خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔ (اصول کافی جلد 1، کتاب العلم، باب الاخذ بالسنہ وشواہد الکتاب، حدیث 1)۔

کیا اس حدیث کی روشنی میں ہماری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ فقہاء کے فتاویٰ کو بھی قرآن کی روشنی میں جانچیں اور جو فتویٰ قرآن کے خلاف نظر آئے اس کو ترک کر دیا جائے۔ آخر مجتہدین غیر معصوم ہیں، ان سے خطا ہو سکتی ہے، لہٰذا ہمارے لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ایک غیر معصوم کی بات پر عمل پیرا ہو جائیں۔ جو لوگ دہشت گردی کے حملے کرتے ہیں۔ خودکش بم دھماکوں میں بے گناہ لوگوں اور معصوم بچوں کو قتل کر دیتے ہیں وہ بھی تو کسی مفتی، شیخ الحدیث یا شیخ القرآن کی تقلید میں یہ گھناؤنا کام کرتے ہیں۔ کیا قیامت کے دن یہ دہشت گرد، مجرم اور قاتل یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے مفتی اور عالم کی تقلید میں یہ کام کیا ہے۔ کیا ان کا یہ عذر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو سکتا ہے؟ یاد رکھیئے کہ اندھی تقلید اگر جائز ہے تو سب کے لئے جائز ہے اور نہیں ہے تو کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے اور اس کا قانون سب کے لئے ایک ہے۔ ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیں:

اَلْاِمَامُ الْبَاقِرُ(ع) فِیْ وَصِیَّتِہٖ لِجَابِرِبْنِ یَزِیْدَ جُعْفِیْ:... وَاعْلَمْ بِاَنَّکَ لَا تَکُوْنُ لَنَا وَلِیًّا حَتّٰی لَواجْتَمَعَ عَلَیْکَ اَھْلُ مِصْرِکَ وَقَالُوْا: اِنَّکَ رَجُلٌ سَوْءٌ لَّمْ یَحْزُنْکَ ذٰلِکَ. وَلَوْقَالُوْا: اِنَّکَ رَجُلٌ صَالِحٌ لَّمْ یَسُرُّکَ ذٰلِکَ. وَلٰکِنْ اَعْرِضْ نَفْسَکَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ، فَاِنْ کُنْتَ سَالِکًا سَبِیْلَہٗ، زَاھِدًافِیْ تَزْھِیْدِہٖ، رَاغِبًافِیْ تَرْغِیْبِہٖ، خَائِفًامِّنْ تَخْوِیْفِہٖ، فَاَثْبِتْ وَاَبْشِرْ، فَاِنَّہٗ لَا یَضُرُّکَ مَاقِیْلَ فِیْکَ..

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے جابر بن یزید جعفی کو اپنی وصیت میں فرمایا: تم اس وقت تک ہماری ولایت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک اس حالت کو نہ پہنچ جاؤ کہ اگر تمہارے شہر کے لوگ جمع ہو کر تم سے کہیں کہ تم بہت برے شخص ہو تو اس بات سے تمہیں دکھ نہ ہو، اور اگر وہ کہیں کہ تم بہت

نیک شخص ہوتو اس سے تمہیں خوشی نہ ہو۔ بلکہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنا جائزہ لو، اگر تم اس کی راہ پر چل رہے ہو، جن چیزوں سے اس نے منہ موڑنے کو کہا ہے ان سے منہ موڑے ہوئے ہو، جن چیزوں کی طرف اس نے تمہیں رغبت دلائی ہے تم ان میں راغب ہو، جن چیزوں سے اس نے تم کو ڈرایا ہے ان سے ڈرتے ہو تو اس حال پر ثابت قدم رہو اور تمہیں بشارت ہو، ایسی صورت حال میں تمہارے بارے میں کہی گئی کوئی بات تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ (تحف العقول: بہ نقل از الحیاۃ، ج1، ص96)

مؤمنین کرام! ذرا غور فرمائیں! اس حدیث کی روشنی میں بطور شیعہ ہمارا کیا فریضہ ہے؟ اس حدیث کی روشنی میں ہمارا قرآن کے ساتھ تعلق کیسا ہونا چاہئے؟ کیا اس حدیث کی روشنی میں ہم شیعہ کہلانے کے حقدار ہیں؟ کیا اس حدیث کی رو سے اندھی تقلید کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے؟

آخری بات

اسلام صرف ظاہری عبادات کا دین نہیں ہے۔ حقیقت میں اسلام روحانی اور باطنی پاکیزگی اور ترقی کا دین ہے۔ اسلام نے جن عبادات کا حکم دیا ہے، ان کا اصل مقصد تزکیہ نفس اور رُوحانی طہارت کا حصول ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ پہلو جتنا اہم ہے اتنا ہی اسے نظر انداز کیا گیا ہے۔ نماز، روزہ اور دیگر واجبات کی پابندی سے انجام دہی کرنے والوں پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ سالہا سال تک ان عبادات کو انجام دینے کے باوجود ان میں کوئی روحانی ترقی اور بالیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ لوگوں کی بھاری اکثریت کی نمازوں، روزوں، تلاوتِ قرآن، دُعا و زیارات و ذکر کی کیفیت (quality) ساٹھ سال کی عمر میں بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسے پندرہ سال کی عمر میں ہو تی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں کی عبادات اپنی رُوح اور معنویت سے خالی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ رُوح کی تربیت اور تزکیہ کی طرف بھی توجہ دی جائے۔

روحانی تربیت صرف ہماری اخروی فلاح کے لئے ہی نہیں بلکہ دنیوی زندگی کیلئے اور

معاشرتی امن وامان کے لئے بھی ضروری ہے۔اگر ہمارے معاشرے میں روحانی اقدار موجود ہوتیں تو آج ہمارا معاشرہ ظلم وستم ، دہشت گردی،قتل و غارت گری، سیاسی عدم استحکام،ملکی سلامتی کو لاحق خطرات،جیسی مصیبتوں میں گھرا ہوا نہ ہوتا۔اگر ہمارے معاشرے میں رُوحانی اقدار کی حاکمیت ہوتی تو 16 دسمبر 1971 کو پاکستان نہ ٹوٹتا، 5 جولائی 1977 کو اسلام کے نام پر بدترین منافق لوگ ہمارے ملک کے حکمران نہ بنتے اور 12 مئی 2007 کو جو کچھ کراچی میں ہوا وہ نہ ہوتا۔ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ جس طرح مادیت فتنہ وفساد کا سبب ہے،اس طرح روحانیت سے خالی دینداری بھی فتنہ وفساد کا سرچشمہ ہے۔دنیا میں امن کے لئے ضروری ہے کہ دین کے ظاہری پہلو کے ساتھ ساتھ روحانیت کی طرف بھی بھرپور توجہ دی جائے۔

مئی 2006ء میں شام اور ایران کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ قم میں دیگر علماء کے علاوہ اُستادِ محترم حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی دام ظلہٗ سے بھی چند ملاقاتیں ہوئیں۔ پاکستان کے حالات کا ذکر سننے کے بعد اُستادِ محترم نے فرمایا کہ آپ اپنے معاشرے میں قرآنی علوم ومعارف کی تعلیم اور ترویج کے ساتھ ساتھ لوگوں کی رُوحانی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دیں۔

میں نے عرض کیا: حضور! میں تو خود اس راہ کا ادنیٰ سا راہرو ہوں، میں کسی کی تربیت کا فریضہ ادا کرنے کے قابل کیسے ہوسکتا ہوں؟

فرمانے لگے کہ انسان کی عافیت اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو اس راہ کا ادنیٰ راہرو سمجھتا رہے تا کہ اس راہ پر اُس کی ترقی و پیشرفت کا سلسلہ جاری رہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ دُوسروں کی رُوحانی تربیت بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔آپ کی اور آپ کے معاشرے کی تسلی واطمینان کیلئے میں آپ کو اس کام کی تحریری اجازت دیتا ہوں۔(اُستادِ محترم کے اجازت نامے کا عکس اور ترجمہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ مادیت کے گرداب میں غرق ہوتے ہوئے دورِ جدید کے انسان کو رُوح اور رُوحانی تربیت وارتقاء کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور جو لوگ رُوحانیت کے فروغ کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں، اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

رُوحانی زندگی کے معیار کو بہتر بنانا ویسے تو ہر صاحبِ ایمان کیلئے ضروری ہے لیکن آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی مدظلہٗ کی اس تاکید اور ہدایت کے بعد اُن کے مقلدین اور ارادت مندوں کو اس کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے۔

والحمدللّٰہ رب العالمین

ڈاکٹر سیّد نیاز محمد ہمدانی

25 ستمبر 2007ء

www.drhamadani.com

E-mail: syedniazm@yahoo.com

استادِ محترم کے تصدیقی سرٹیفکیٹ کا عکس

بسم الله الرحمن الرحیم

ن والقلم وما یسطرون

صدق الله العظیم

بسم الله الرحمن الرحیم

تصدیق

بعد الحمد لله والصلاة علی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم بوسیله اعتراف می شود

[illegible]

۱۳۶۹ [illegible] برابر اول رمضان المبارک ۱۴۱۱

استادمحترم کے سرٹیفکیٹ کا ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کے بعد بذریعہ ہذااعتراف کیا جاتا ہے کہ ہمارے برادرِعزیز جناب حجۃ الاسلام والمسلمین سیّد نیازمحمد نے کئی سال حوزہ علومِ قرآن میں بھرپور شرکت کی اور جیسا کہ ایک الگ سند میں تصدیق کی گئی ہے،قرآنی علوم میں وہ استنباط وتحقیق کے درجہ پر پہنچ چکے ہیں اور بہت مناسب ہے کہ ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

ضمناً، انہوں نے ہماری بعض کتب منجملہ رسالہ ''توضیح المسائل نوین'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہےاور یہ سارا ترجمہ ہمارے ساتھ مشورے اور گفتگو کے ساتھ ہوا ہے۔اُمید ہے کہ اس سے استفادہ کیا جائے گا۔ نیز انہیں ان تمام اُمورِشرعیہ کوانجام دینے کی اجازت ہے جوایک اسلامی فقیہ کو انجام دینے چاہئیں،جن میں سے ایک،حقوق اللہ (خمس وزکوٰۃ) کووصول کر کے فی سبیل اللہ صرف کرنا بھی ہے۔انہیں تقویٰ اوراہل اللہ کا خیال رکھنے کی تاکیدی نصیحت کرتا ہوں۔

اُمید ہے کہ راقم کودُعائے خیر میں فراموش نہیں کریں گے۔

حوزہ علمیہ قم۔محمد صادقی تہرانی

اوّل رمضان المبارک1410

استادمحترم رضوان اللہ علیہ کے اجازت نامہ کا عکس

بسم الله الرحمن الرحیم

بسیار [illegible] جناب مستطاب آقا [illegible]

معارف قرآنی [illegible] و در [illegible] بسیار

[illegible] از بهترین و شایسته ترین مربیان [illegible]

اخلاق [illegible]

[illegible]

[illegible] را موفق بدارد .

حوزه علمیه قم - محمد حسین طباطبائی



۲۸ ربیع الثانی ۱۳۹۷

آیۃ اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی کے اجازت نامہ کا متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پس از حمد خدای سبحان گواہی می شود کہ جنابِ مستطاب آیۃ اللہ دکتر سید نیاز ہمدانی کہ بر محورِ معارفِ قرآنی سالیانی متمادی سعی وکوشش خستگی ناپذیر کردہ اند واز نظر خطابہ وقلم نقش بسیار مہم اسلامی دارند، از بہترین وشایستہ ترین مربیان اسلامی می باشند وتمامی جہات عقیدتی، فقہی، اخلاقی وعرفانی را دارا می باشند۔ منزلت اسلامیشان بسیار شایستہ وبایستہ ی پیروی است وبویژہ در تربیت عرفانی بر مبنای قرآن وسنتِ قطعیہ آمادگی کاملی دارند۔ خدا ایشان راتحت الحفظ ویژۂ خود قرار دہد وبہ مؤمنان توفیق تبعیت از ایشان راعطا کند۔

حوزہ علمیہ قم۔ محمد صادقی تہرانی

28 ربیع الثانی 1427 ہجری



آیۃ اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی کے اجازت نامہ کا ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حمد کے بعد تصدیق کی جاتی ہے کہ جناب مستطاب آیۃ اللہ ڈاکٹر سید نیاز ہمدانی نے مسلسل کئی سال تک معارفِ قرآنی کی بنیاد پر، انتھک محنت اور کوشش سے کام کیا ہے اور تحریر وتقریر کے ذریعے اہم اسلامی کردار ادا کررہے ہیں۔ وہ اسلامی تربیت کرنے والے بہترین اور مناسب ترین افراد میں سے ہیں اور تمام عقیدتی، فقہی، اخلاقی اور عرفانی پہلو اِن میں موجود ہیں۔ ان کی اسلامی حیثیت کی پیروی بہت مناسب اور ضروری ہے، خاص طور پر قرآن اور سنتِ قطعیہ کی بنیاد پر عرفانی تربیت کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنی خصوصی حفاظت میں رکھے اور مؤمنین کو ان کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

حوزہ علمیہ قم۔ محمد صادقی تہرانی

28 ربیع الثانی 1427 ہجری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت آیۃ اللہ العظمٰی علامہ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی رضوان اللہ علیہ کا مختصر تعارف

آیۃ اللہ العظمٰی ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی یکم فروردین 1305 ہجری شمسی بمطابق 21 مارچ 1928 عیسوی بروز عید نوروز تہران کے ایک علمی گھرانے میں متولد ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار حاج شیخ محمد رضا لسان المحققین ایران کے بہت بڑے اور آزاد منش خطیب تھے۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کو پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہیں سے آپ کی انقلابی سرگرمیوں کا آغاز اس طرح ہوا کہ پہلے ہی دن جب سکول میں ترانہ ''شہنشاہِ ما زندہ باد'' پڑھا گیا تو آپ نے شہنشاہِ ما مردہ باد کہہ دیا اور معلم نے اس ننھے انقلابی کو سرزنش کر کے اسمبلی سے نکال دیا اور آئندہ اسمبلی میں آنے سے روک دیا۔ یہ کمسن انقلابی اُسی وقت سے فریضہ امر بمعروف اور نہی از منکر پر عمل کرتا اور تمام مظاہر شہنشاہی کی مخالفت کرتا تھا۔

1318 میں جب آپ کے والد محترم کا انتقال ہوا تو آپ نے تیزی سے دبیرستان (سینئر ہائی سکول) کے پہلے مرحلے کو مکمل کیا اور غیر معمولی شوق اور جذبے کے ساتھ علومِ دینی کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ مدرسہ قدیم سپہ سالار تہران میں ایک سال کی مدت میں آپ نے ''جامع المقدمات'' منطق اور ادبیات کی دُوسری تمام کتابوں کو مکمل کرنے کے بعد باقاعدگی کے ساتھ مرحوم آیت اللہ العظمٰی الشیخ محمد علی شاہ آبادی کے دروسِ عرفان اور آیت اللہ العظمٰی حاج میرزا مہدی آشتیانی کے دروسِ فلسفہ میں شرکت کرنے لگے اور اسلامی فلسفہ، عرفان اور اخلاق کی گہرائیوں سے آشنا ہوئے۔

اس تمام عرصہ میں آپ کا اصلی مقصد اور درخشاں نقطہ علوم و معارفِ قرآن تھا اور اسی وجہ سے مرحوم آقائے شاہ آبادی کے دروس میں شریک ہوتے تھے کیونکہ ان کے دروس پر قرآنی رنگ غالب تھا اور ایک تربیتی اور اخلاقی مکتب ہونے کے علاوہ اس پر ایک خاص رُوحانی فضا حاکم تھی جو کہیں اور نہ تھی۔

1320 میں دینی علوم کی تکمیل کیلئے قم تشریف لے گئے اور دس سال تک مختلف اسلامی موضوعات پر حوزہ کے بزرگ علماء کے دروس میں شرکت کی اور درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے۔

فلسفہ وعرفان کی تعلیم مرحوم آیت اللہ علامہ طباطبائی، آیت اللہ میرزا مہدی آشتیانی جیسے جلیل القدر اساتذہ سے حاصل کی۔ فقہ واصول میں آیت اللہ مرحوم سیّد محمد تقی خوانساری، مرحوم حاج سیّد محمد داماد، محقق یزدی مرحوم، حاج شیخ محمد علی کرمانی، مرحوم حاج سیّد احمد خوانساری، مرحوم سیّد محمد حجت کوہِ کمری اور مرحوم آیت اللہ العظمٰی علامہ سیّد محمد حسین طباطبائی سے کسبِ فیض کیا۔

یہ نقطہ قابل توجہ ہے کہ اس تمام عرصہ میں جبکہ آپ اصول وفقہ، منطق وفلسفہ اور عرفان میں گزشتہ نصف صدی کے نامور اساتذہ سے علم حاصل کررہے تھے، آپ کی تمام علمی سرگرمیوں کا محور قرآن شریف تھا اور ان علوم میں اجتہاد کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وقت آنے پر تمام علوم کے قرآن کے ساتھ اختلاف کو بے نقاب کرکے علماء سے جواب طلبی کی جاسکے اور تمام علوم اور علماء کے قرآن سے انحرافات کے خلاف جہاد کیا جائے۔ آپ کی تیس جلدوں پر مشتمل تفسیر ''الفرقان'' اور دُوسری تصانیف جن کی تعداد 60 سے متجاوز ہے، اس مدعا کی بہترین گواہ ہیں۔ درحقیقت آپ نے تمام علومِ اسلامی میں ایک جدید مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی ہے، ایک ایسا مکتبِ فکر جسے صحیح تسلیم کرنے کے باوجود سب اس سے دُور ہیں اور وہ ''مکتبِ علوم ومعارفِ قرآن'' ہے۔

آپ تن تنہا ایک چلتا پھرتا مدرسہ اور حوزہ ہیں۔ قم میں طالب علمی کے دس سالہ دَور میں اور اس کے بعد تہران میں دس سال قیام کے دوران، جس میں آپ نے تہران یونیورسٹی سے الٰہیات

میں پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری لی اور مرحوم آیت اللہ کاشانی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر شاہ کے خلاف جہاد میں سرگرمِ عمل رہے۔اس کے بعد شاہ **علیہ اللعنہ** کے شر سے محفوظ رہنے اور انقلابِ اسلامی کی پیش رفت کے لئے 17 سال ہجرت کے دوران، جس میں دس سال نجفِ اشرف، پانچ سال بیروت اور دو سال مکہ مکرمہ میں رہے، آپ علمی اور سیاسی انقلاب کی پیش رفت کیلئے جہاد میں مصروف رہے اور چودہ سال کی عمر سے لے کر اب تک کے اڑتالیس (48) سالہ دَور میں آپ کی سیاسی اور علمی سرگرمیوں کا اصلی مرکز اور محور قرآن شریف رہا ہے۔

1341 (1962) میں جب آپ تہران میں تبلیغ اور تالیف کے علاوہ تہران یونیورسٹی میں الٰہیات کے اُستاد بھی تھے، مرحوم آیت اللہ آغا بروجردی کی پہلی برسی کی مناسبت سے قم کی مسجدِ اعظم میں ایک عظیم الشان مجلس میں آپ کو تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔اس سے تقریباً ایک ماہ قبل شاہ نے قم میں ایک تقریر کی تھی جس میں اُس نے علماء کی بہت توہین کی اور کسی نے بھی اُس کے خلاف آواز اُٹھانے اور مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کی۔تقریر کیلئے مسجدِ اعظم میں جانے سے قبل آپ نے امام خمینیؒ سے ملاقات کی اور اُن سے کہا کہ میں صرف تقریر کرنے ہی نہیں بلکہ شاہ کی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کا جواب دینے کے ارادہ سے قم سے آیا ہوں۔امام خمینیؒ نے جواب میں کہا: ''ما در انتظار چنین مردی بودیم''، یعنی ''ہم ایسے ہی مرد کے منتظر تھے''۔

پولیس کے نہایت سخت حفاظتی اقدامات کے باوجود مجلس بڑی شان وشوکت سے منعقد ہوئی اور ایرانی شاہی استبداد اور ظالمانہ گھٹن کی فضا میں شاہ کے خلاف پہلی بار ایک آواز اُٹھی۔ یہ آواز حضرت آیت اللہ ڈاکٹر محمد صادقی مدظلہٗ کی تھی۔ بالآخر مجلس اختتام پذیر ہوئی۔مجلس کیا تھی، شاہ کے خلاف ایک دھماکہ تھا۔

مجلس کے بعد امام خمینیؒ خفیہ طور پر آپ کو اپنے گھر لے گئے۔ تین دن تک وہاں روپوش رہنے کے بعد آپ نے امام خمینیؒ سے سیاہ عمامہ لے کر سر پر رکھا اور رُوپ تبدیل کر کے رات کی تاریکی

میں امام خمینیؒ کے گھر کو چھوڑ دیا اور پھر کچھ عرصہ تک مخفی رہنے کے بعد مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین پر منظر عام پر آئے۔

آپ نے حرمین شریفین میں فصیح و بلیغ عربی زبان میں شاہ کے خلاف تقاریر کیں۔ سات ذی الحجہ کی رات کو عمرہ کی ادائیگی کے بعد اور فریضہ حج کی ادائیگی سے قبل آپ کو سعودی پولیس نے گرفتار کرلیا اور آپ نے مناسکِ حج کو پولیس کے پہرہ میں انجام دیا اور آخر کار مختلف اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والے چالیس علماء، جن میں آیت اللہ سیّد محسن حکیم طباطبائی رضوان اللہ علیہ کے فرزند ِارجمند آیت اللہ یوسف حکیم اور علامہ مرتضیٰ عسکری بھی شامل تھے، کے مسجد الحرام میں احتجاج کے بعد آپ رہا کردیئے گئے۔

رہائی پانے کے بعد آپ نجف ِاشرف چلے گئے جہاں آپ دس برس تک علمی اور انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور جب عراق کی حکومت نے ایرانیوں کو عراق سے نکالنا شروع کیا تو آپ کو بھی عراق چھوڑنا پڑا۔ اس دفعہ آپ کی میزبانی کا شرف بیروت کو حاصل ہوا جہاں آپ نے پانچ سال تک اپنی علمی اور انقلابی سرگرمیوں کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ جاری رکھا۔

جب لبنان میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو آپ نے سرزمین وحی و رسالت کا رُخ کیا اور مکہ مکرمہ آگئے اور دو سال تک وہاں انتہائی حیرت انگیز طور پر سرگرمِ عمل رہے۔ یہاں آپ کو مختلف اسلامی ممالک سے حج اور عمرہ کیلئے آنے والی علمی اور سیاسی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا اور آپ نے انقلاب کا پیغام دُنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچانے کیلئے اس فرصت سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔

1357 میں سترہ سال کے بعد ایک بار پھر آپ کو حالتِ احرام میں گرفتار کرلیا گیا۔ چودہ دن تک مکہ، مدینہ اور جدہ کی جیلوں میں رکھنے کے بعد آپ کو حجاز سے نکال دیا گیا۔ آپ پھر بیروت آگئے۔ یہ وہ دَور تھا جب امام خمینیؒ عراق کو چھوڑ کر پیرس میں سکونت پذیر تھے۔ آپ امام خمینیؒ سے ملنے کیلئے پیرس چلے گئے۔ امام خمینیؒ سے ملاقات کے بعد آپ پھر بیروت آگئے جہاں سے آپ نے خشکی

کے راستے ایران کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ اسلامی انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ آپ تہران آ کر امام خمینیؒ کے انقلابی ساتھیوں کے ساتھ آ ملے۔

شاہ، ایران سے فرار ہو چکا تھا اور وزیر اعظم شہ پور بختیار کی حکومت بھی ناکام ہو چکی تھی۔ عوام انقلابی رہنماؤں کی سرکردگی میں فوجی چھاؤنیوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ ان میں دو چھاؤنیاں حضرت آیت اللہ صادقی مدظلہٗ کی سرکردگی میں فتح ہوئیں جن میں سے ایک ''پادگان جے'' تھی۔

مختصر یہ کہ آپ نے ساری زندگی علومِ قرآن پر تحقیق اور جہاد فی سبیل اللہ میں گزاری اور چونکہ آپ کی نظر میں قرآن شریف کی روشنی میں اسلام کی تعلیم اور تبلیغ کو اوّلیت حاصل ہے، لہٰذا انقلاب کی کامیابی کے بعد آپ سیاست سے الگ ہو کر صرف تحقیق اور تدریس میں مشغول ہو گئے اور شیعہ مذہب کی تاریخ میں آپ کی ''توضیح المسائل'' ہی پہلی توضیح المسائل ہے جس میں فتاویٰ کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن وسنت میں موجود اُن کے دلائل کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے اور چونکہ آپ قرآن وسنت کے مقابلہ میں شہرت واجماع کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لہٰذا آپ کے فتاویٰ دُوسرے فقہاء کے فتاویٰ سے قدرے مختلف ہیں جس پر وہ کوتاہ بین افراد، جو عقل وشعور کو تالا لگا کر چابی دُور پھینک دینے اور لکیر کے فقیر بنے رہنے کو ہی عین اسلام قرار دیتے ہیں، آپ کی مخالفت کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں اور ان میں کسی نے آج تک آپ کے کسی فتویٰ یا نظریہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں غلط ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، اس لئے کہ ایسی کوشش کے لاحاصل ہونے کا خود اُنہیں بھی علم ہے۔

بعض اوقات بعض لوگ آپ سے یہ کہتے ہیں کہ آپ کیسے اتنی جرأت کرتے ہیں کہ اجماع اور شہرت کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ تو آپ جواب دیتے ہیں کہ جرأت مند تو وہ لوگ ہیں جو اجماع اور شہرت کی پابندی کرتے ہوئے قرآن وسنت کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔



مظلومیت اور وفات:

آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی نے ساری زندگی مظلومیت میں گزاری اور مظلومیت کی حالت میں وفات پائی۔ انقلاب سے پہلے شاہ کے دور میں ایران میں مظلوم رہے۔ بعد از آں جلاوطنی کے دور میں کبھی عراق میں اور کبھی سعودی عرب میں مظلومیت کے عالم میں وقت گزارا اور انقلاب کی کامیابی کے بعد اسلامی جمہوریہ ایران میں بھی مظلومیت کی زندگی گزاری۔ بدقسمتی سے مظلومیت کا آخری دور جو اسلامی جمہوریہ ایران میں تھا، سب سے زیادہ دردناک اور شدید تھا۔ آپ کی قرآنی فکر سے خائف اندھی تقلید کے پجاری مقتدر حلقوں کے لیئے آپ کا درس تفسیر قرآن قابل برداشت نہ تھا۔ وہ اس درس کی راہ میں قسم قسم کے روڑے اٹکاتے تھے۔ مگر استاد محترم نے تمام رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود درس کو جاری رکھا۔ آخر کار روشنی سے خائف اندھیرے کے پجاریوں نے اپنی ہمیشہ کی روایت کے مطابق تشدد کا حربہ استعمال کیا اور غنڈوں سے درس پر حملہ کروادیا۔

استاد محترم آیت اللہ العظمیٰ ڈاکٹر محمد صادقی تہرانی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ قم میں حرم حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع مسجد امام رضا علیہ السلام میں درس تفسیر قرآن دیا کرتے تھے۔ سوا دس سے گیارہ بجے تک فارسی میں اور سوا گیارہ سے بارہ بجے تک عربی میں درس ہوا کرتا تھا۔

22 ستمبر 1987 کو تقریباً ساڑھے دس بجے، جب کہ فارسی میں درس شروع ہوئے بمشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے، ستّر، اسّی کے لگ بھگ پاکستانی طالب علم نما غنڈوں نے درس پر حملہ کر دیا۔ اس دہشت گرد گروہ کا تعلق تحریک نفاذ فقہ جعفریہ (عارف حسینی گروپ) سے تھا اور اس حملے کی قیادت راجہ ناصر نامی ایک شخص کر رہا تھا جو آج کل پاکستان میں مجلس وحدت مسلمین کے نام سے فرقہ وارانہ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس حملے میں درس میں شریک طالب علموں کو زدوکوب کیا گیا، ان میں سے بعض کو زخمی اور مجروح کر دیا گیا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ حملے کے

دوران قرآن مجید کے نسخے حملہ آوروں کے پیروں تلے روندے گئے، طالب علموں کے خون سے مسجد کو آلودہ کیا گیا اور بے ہودہ نعرہ بازی اور دہشت گردی کی اس کاروائی سے مسجد کے تقدس کو بھی پامال کیا گیا۔ راقم اور کچھ ایرانی دوستوں نے جو اس درس میں شریک تھے اس واقعہ کی رپورٹ قم کے پولیس سٹیشن میں درج کروائی۔ بعد از آن پانچ ماہ تک علماء کی خصوصی عدالت (دادگاہ ویژہ روحانیت) میں مقدمہ کی کاروائی چلی۔ چونکہ مجرموں کو حوزہ علمیہ کی انتظامیہ کی سرپرستی اور حمایت حاصل تھی، فروری 1988 میں عدالت نے کوئی فیصلہ سنائے بغیر مقدمہ ختم کر دیا۔ عدالت کے اس غیر منصفانہ رویے کی اطلاع راقم نے ایک خط کے ذریعے اس وقت کے ایران کے چیف جسٹس آیت اللہ سید عبد الکریم موسوی اردبیلی کو دی لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

استاد محترم آیت اللہ صادقی تہرانی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے شاگردوں نے اس حملے سے مرعوب ہوئے بغیر درس کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی دن سوا گیارہ سے بارہ بجے تک عربی زبان میں درس تفسیر قرآن اپنے معمول کے پروگرام کے مطابق ہوا اور درس کا سلسلہ جاری رہا۔ فرق پڑا تو صرف اتنا کہ درس میں شرکت کرنے والے طالب علموں کی تعداد کچھ کم ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد 1991 میں، جب راقم پاکستان واپس آچکا تھا، ایک بار پھر اسی مسجد میں درس پر حملہ ہوا۔ اس بار حملہ کرنے والے ایرانی تھے۔ اس بار پولیس نے رپورٹ بھی درج نہیں کی اور استاد محترم کو ٹیلیفون پر کہا گیا کہ پہلے بھی آپ کے درس پر حملے کے ذریعے آپ کو ایک پیغام دیا گیا تھا مگر آپ نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اب اس حملے کے ذریعے دوبارہ آپ کو پیغام دیا جا رہا ہے۔ اگر اب بھی آپ نے درس جاری رکھا تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔

اس طرح حکومتی سرپرستی میں تشدد اور دہشت گردی کے ذریعے تفسیر قرآن کا یہ درس صرف اس لیئے بند کر دیا گیا کہ اس درس میں قرآن حکیم کی روشنی میں، اندھی تقلید پر مبنی روایتی مذہبی سوچ کا محاکمہ کیا جاتا تھا جو اندھی تقلید کے تاجروں کے لیئے قابل تحمل نہیں تھا۔

استاد محترم نے اس کے بعد اپنے گھر میں درس دینا شروع کردیا۔ درس قرآن کے لیئے ان کے گھر جانے والے طالب علموں کو بھی ہراساں کرنا شروع کردیا گیا۔ جس پر آہستہ آہستہ درس کے شرکاء کی تعداد بہت کم رہ گئی اور وہ بھی باقاعدگی سے شرکت نہ کرسکتے تھے۔ اس طرح گھر میں بھی درس کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اور استاد محترم نے اپنی ساری توجہ اور توانائی تصنیف و تالیف پر مرکوز کردی اسی مظلومیت کے عالم میں یکم فروردین 1390 (21 مارچ 2011) کو 85 سال کی عمر میں آپ اس دار فانی سے عالم بقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔

آپ کو قم کے قبرستان باغ بہشت میں دفن کیا گیا۔ آپ کے ورثاء نے چاہا کہ آپ کے چالیسویں کی مجلس قم کی مسجد اعظم میں منعقد کی جائے، جہاں آیت اللہ العظمٰی بروجردی کی پہلی برسی کی مجلس میں آپ کی تقریر سے شاہ کے خلاف تحریک نے ایک اہم موڑ لیا تھا۔ لیکن مسجد اعظم کی انتظامیہ نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔

سَلامٌ عَلَيۡهِ يَوۡمَ وُلِدَ وَ يَوۡمَ مَاتَ وَيَوۡمَ يُبۡعَثُ حَيًّا

مسئلۂ بلوغ

مسئلہ بلوغ جو تمام رسالہ ہائے عملیہ کے ابتداء میں ہوتا ہے، اب تک نامناسب طرزِ عمل کا شکار رہا ہے جس کی وجہ سے اسلام پر اعتراض ہوتا رہا ہے۔ لیکن قرآن وسنت کی روشنی میں بلوغ کے جو مراتب واضح ہوتے ہیں، تمام عقلاء کیلئے قابل قبول ہیں۔

'بلوغ' کے معنی رسائی کے ہیں۔ دینی نقطہ نظر سے اس کا پہلا قدم وہ مختصر معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول ہو۔ اس بلوغ کی پہلی ذمہ داری نماز ہے جو ہر درجہ کے مکلّف کیلئے ایمان کا اصلی نقطہ ہے۔

قرآن شریف میں ہے:

قُل اَوُحِیَ اِلَیَّ ھٰذَاالُقُرآنُ لِاُنُذِرَکُمُ بِهٖ وَمَنُ بَلَغَ.

''مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ڈراؤں تمہیں اور اُسے جو بالغ ہوجائے''۔(19:6)

اس آیت کی رُو سے قرآنی فرائض کی بجا آوری کو بلوغ کے پہلے مرحلے سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ پہلا مرحلہ عقلی اور معرفتی بلوغ کا ہے۔ اس کے بعد بلوغِ جسمانی کا مرحلہ آتا ہے جو روزہ وغیرہ جیسی عبادات کیلئے ہے۔ اس کے بعد ازدواجی بلوغ اور اقتصادی بلوغ کے مختلف مراحل آتے ہیں۔

مسلمان گھرانوں میں بلوغ کا پہلا مرحلہ اوسطاً دس برس کی عمر میں آجاتا ہے اور اس کے بعد دُوسرا مرحلہ تیرہ برس کی عمر میں آتا ہے جو روزہ سے متعلق ہے۔ ان دونوں میں لڑکی اور لڑکے میں

کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ اگر لڑکا جسمانی لحاظ سے لڑکی سے زیادہ طاقتور نہ ہو تو اس سے کم بھی نہیں ہوتا۔ پھر کس بنیاد پر، دین کے نام پر لڑکی کو لڑکے سے چھ سال پہلے نماز و روزہ کا پابند کر دیا جائے۔

بہت سی روایات بھی روزہ کے وجوب کیلئے لڑکی اور لڑکے دونوں کیلئے تیرہ سال کی عمر مقرر کرتی ہیں اور نماز کے وجوب کیلئے اس سے چند سال قبل۔ اگر چہ علاقے، تربیت اور بعض دُوسری چیزوں کے اختلاف کی وجہ سے ان دونوں میں استثناء بھی موجود ہے۔

بہرصورت روزہ جب بھی ''بالغ'' کیلئے باعثِ حرج نہ ہو، واجب ہے۔ ضرر کی صورت میں حرام ہے اور حرج کی حالت میں واجب نہیں ہے کہ اپنی ساری توانائی صرف کر کے وہ روزہ رکھے، خواہ جسمانی کمزوری کی وجہ سے ہو یا کم عمری کی وجہ سے۔ یہ تیرہ برس کی عمر ایک متوسط قاعدہ ہے اور ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہو۔ نماز کا مسئلہ بھی اسی طرح ہے۔

ازدواجی لحاظ سے لڑکی لڑکے سے پہلے بالغ ہو جاتی ہے لیکن اقتصادی اُمور میں لڑکا لڑکی سے پہلے بالغ ہو جاتا ہے اور دونوں کا اقتصادی بلوغ، مکمل اقتصادی رشد (سوجھ بوجھ) سے پہلے رُونما ہو جاتا ہے یعنی جب سفیہ نہ ہوں تو مالی اُمور میں بالغ شمار ہوں گے لیکن یتیموں کے بارے میں اس آیہ شریفہ کی روشنی میں:

''فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا...... (6:4)

''اگر تم ان میں رُشد پاؤ''۔ اقتصادی بلوغ کو ازدواجی بلوغ کے بعد مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی لڑکی کا اقتصادی بلوغ دیر سے ہے اگر چہ اس کا ازدواجی بلوغ جلدی ہو۔



اجتہاد اور تقلید

مسئلہ:1 ہر مکلّف مسلمان اپنے ایمان کی روشنی میں جانتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے سامنے براہِ راست جوابدہ ہے، اس لئے کہ قرآن وسنت کے احکامات سب کیلئے ہیں اور ضروری ہے کہ ہر مکلّف ان احکام کا علم رکھتا ہو تا کہ ان کے مطابق عمل کر سکے۔

احکامِ شرعیہ کو جاننے کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان براہِ راست قرآن وسنت سے ان احکام کا علم حاصل کرے۔ ایسے شخص کو فقیہ یا مجتہد کہا جاتا ہے اور اس طریقہ کو اجتہاد یا استنباط کہا جاتا ہے۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ انسان ذاتی اہلیت اور صلاحیت کے نہ ہونے کی وجہ سے یا ضروریاتِ زندگی یا کثرتِ مشاغل کی وجہ سے براہِ راست قرآن وسنت سے احکام کا علم حاصل نہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں اس پر واجب ہے کہ حتی الامکان احتیاط کے مطابق عمل کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بعض مجتہدین کسی چیز کو واجب اور بعض اسے مستحب سمجھتے ہوں تو وجوب کے فتویٰ پر عمل کرے۔ اسی طرح اگر بعض مجتہدین کسی چیز کو حرام اور بعض اسے مرجوح سمجھتے ہوں تو اس کے بارے میں حرمت کے فتویٰ پر عمل کرے۔ البتہ جہاں احتیاط ممکن نہ ہو یا تنگی و سختی کا باعث بنے، وہاں احتیاط کو ترک کر دینا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (185:2).

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ مشکل نہیں چاہتا''۔

جہاں احتیاط ممکن نہ ہو، وہاں مکلّف پر لازم ہے کہ فقہاء کے بہترین فتاویٰ پر عمل کرے۔ اس صورت کو تقلید کہا جاتا ہے۔ تقلید عقل وشریعت کے خلاف نہیں بلکہ ان کے عین مطابق ہے، اس لئے کہ اگر انسان کسی چیز کا علم نہ رکھتا ہو اور اُس کا علم حاصل کرنا اُس کیلئے ممکن بھی نہ ہو تو اُس کیلئے تقلید

کا راستہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔ اگر وہ تقلید نہ کرے تو یہ بے عقلی کی دلیل ہے، اس لئے کہ ترکِ تقلید سے وہ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکے گا، حالانکہ تمام مکلفین پر واجب ہے کہ وہ اپنے فرائض کا علم حاصل کریں اور پھر اُن کو انجام دیں۔

مسئلہ:2 اجتہاد، تقلید اور احتیاط، تینوں اجتہاد میں مشترک ہیں۔ فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔ اجتہاد میں قرآن وسنت کے دلائل کا تفصیلی اور استدلالی مطالعہ کیا جاتا ہے جبکہ احتیاط اور تقلید میں یہ مطالعہ مختصر اور اجمالی ہوتا ہے۔ ان تینوں کی ضرورت فقط ان فرعی احکام میں پڑتی ہے جو یا تو بنیادی طور پر غیر مسلّم یا اختلافی ہوں یا ابھی تک آپ کیلئے سو فیصد ثابت نہ ہوں جبکہ اصولِ دین میں تقلید کی گنجائش نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ مکلّف واضح اور تسلی بخش دلائل کی بنیاد پر ان پر ایمان رکھتا ہو۔[1]

---

[1] بہتر ہے کہ حتی الامکان فقہی مسائل میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ یعنی بجائے اس کے کہ علماء سے صرف فتویٰ معلوم کیا جائے، اُن سے بصد احترام درخواست کی جائے کہ قرآنِ مجید اور احادیث معصومینؑ کی روشنی میں اپنے فتویٰ کی تشریح بھی کر دیں۔ خاص طور پر جن فقہی مسائل میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، اُن میں یہ طریقہ اختیار کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اختلافی مسائل کی عام طور پر دو شقیں ہوتی ہیں: مثلاً کرنسی نوٹ پر زکوٰۃ ہے یا نہیں، شراب نجس ہے یا نہیں ہے، زکوٰۃ صرف نو چیزوں پر واجب ہے یا سب چیزوں پر، خمس صرف غنیمت پر واجب ہے یا سب چیزوں پر۔ ایک با ایمان شخص کیلئے ضروری ہے کہ ہر شق کے قائل علماء سے ان کی وضاحت طلب کرے: مثلاً جو علماء کرنسی نوٹ پر زکوٰۃ کے قائل ہیں، اُن سے بھی ان کے مؤقف کے دلائل سنے اور جو کرنسی نوٹ پر زکوٰۃ کے قائل نہیں ہیں، ان سے بھی ان کے دلائل سنے اور پھر اپنے ایمان کی بنیاد پر، نہ کہ ذاتی خواہش کی بنیاد پر، جس کے دلائل تسلی بخش ہوں، اس کو اختیار کرے۔ اگر اَن پڑھ یا کم تعلیم یافتہ افراد ایسا نہیں کر سکتے تو تعلیم یافتہ افراد کو تو ضرور اس روِش کو اختیار کرنا چاہئے تاکہ اندھی تقلید کا خاتمہ ہو سکے اور قوم کا مذہبی شعور ترقی کرے بالفاظ دیگر اگر اجتہاد اور تقلید دونوں کے بغیر اصول دین کا علم حاصل کرنا ممکن ہے تو بالکل اسی طرح فروع دین کا علم بھی اجتہاد اور تقلید کے بغیر حاصل کرنا ممکن ہے۔ غیر مجتہد افراد کے لئے صرف تقلید پر اصرار کرنا عقلی اور شرعی دونوں لحاظ سے غلط ہے۔ (ہمدانی)

مسئلہ:3 اجتہاد،تقلید اور احتیاط سے متعلق تمام مسائل کی بنیاد قرآن شریف کی یہ دو آیات ہیں:

’’وَمَآ اَرۡسَلۡنَامِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡئَلُوۡا اَھۡلَ الذِّکۡرِاِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِؕ وَاَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَلِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ‘‘. (16:43-44)

’’اور (اے رسولؐ) آپؐ سے پہلے (لوگوں کو حق کی طرف بلانے کیلئے) ہم نے صرف مردوں کو بھیجا جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ پس سوال کرو جاننے والوں سے اگر تمہاری حالت ایسی ہے کہ تم واضح دلائل اور کتبِ وحی سے نہیں جان سکتے ہو اور (اے رسولؐ) ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ کی طرف نازل کیا تاکہ آپؐ لوگوں کیلئے بیان کریں اُس چیز کو جو ان کی طرف نازل کی گئی، شاید وہ غور وفکر کرنے لگیں‘‘۔

’’وَالَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ یَّعۡبُدُوۡھَا وَاَنَابُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ لَھُمُ الۡبُشۡرٰیۚ فَبَشِّرۡ عِبَادِ ۙ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَاُولٰٓئِکَ ھُمۡ اُوۡلُوا الۡاَلۡبَابِ‘‘. (39:18)

’’جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کر کے اللہ کی طرف رجوع کیا، اُن کیلئے بشارت ہے۔ پس بشارت دیجئے میرے ان بندوں کو جو ہر بات کو سنتے ہیں، پھر ان میں سے بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور یہی صاحبانِ عقل ہیں‘‘۔

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ’’اہل الذکر‘‘ ہی اس بات کے اہل ہیں کہ اُن سے سوال کیا جائے۔ قرآن شریف کی روشنی میں اہل الذکر سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن وسنت سے

کما حقہ' واقفیت رکھتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ان اہل الذکر سے سوال کرنے کی اجازت کسے دی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اجازت اُن مکلفین کیلئے ہے جو''ان کنتم لا تعلمون'' کے زمرے میں آتے ہوں یعنی علم نہ رکھتے ہوں اور حاصل بھی نہ کر سکتے ہوں۔ چاہے ذاتی طور پر ان میں تحصیل علم کی صلاحیت نہ پائی جاتی ہو یا صلاحیت تو موجود ہو مگر زندگی کی ضروری ذمہ داریاں اُنہیں یہ فرصت نہ دیتی ہوں کہ جن احکام کو وہ نہیں جانتے، قرآن وسنت سے تفصیلی استنباط کے ذریعے اُن کا علم حاصل کر سکیں، یا یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی عذر موجود نہ ہو یعنی قرآن وسنت سے تفصیلی استنباط کی بھرپور صلاحیت موجود ہو مگر ابھی فوری طور پر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے کہ اگر اُس کا حل جاننے کیلئے تفصیلی اجتہاد کرنے بیٹھ جائیں تو اس کے انجام دینے کا وقت گزر جائے گا۔ ان تینوں صورتوں میں ''اہل الذکر'' سوال کرنا واجب ہے۔

اب جبکہ ''اہل الذکر'' سے پوچھنا آپ پر واجب ہے تو کیا بے بنیاد اور اندھی تقلید آپ کیلئے کافی ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ''بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ'' کے الفاظ ایک انتہائی اہم نکتہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

''زُبُر'' سے مراد آسمانی کتاب کے واضح اور رہنما دلائل ہیں جو اسلام میں قرآن شریف اور سنتِ قطعیہ ہیں۔ 'بیّنات' دُوسرے تمام یقینی دلائل ہیں جن پر عقلاء کے درمیان اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس آیہ کریمہ کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس طرح ''اہل الذکر'' سے مراد وہ علماء ہیں جو''بینات اور زبر'' سے اچھی طرح آگاہی رکھتے ہیں، اسی طرح ان سے سوال کرنے والوں پر بھی لازم ہے کہ''بینات اور زبر'' کی روشنی میں ان سے سوال کریں، نہ یہ کہ جو کچھ ان سے سنا، بغیر دلیل کے اندھا دھند اس پر عمل شروع کر دیں جیسے یہودی کرتے تھے۔

اگر آپ میں استنباط کی صلاحیت ہو تو ضروری ہے کہ''اہل الذکر'' سے آپ کا سوال بھی

کتاب وسنت کی بنیاد پر ہو۔ایسی صورت میں ''اہل الذکر'' کی پیروی اسی تفصیلی استنباط کی بنیاد پر ہوگی۔لیکن اگرآپ قدرتِ استنباط نہ رکھتے ہوں تو اس صورت میں آپ پر لازم ہے کہ حتی الامکان اس بات کا یقین اوراطمینان حاصل کرلیں کہ آپ جس شخص سےسوال کرر ہے ہیں، وہ صرف کتاب و سنت کی بنیاد پرفتویٰ دیتا ہے، اس لئے کہ اہل الذکر اور علماء جس قدر بھی عالم اوردانا ہوں، اگر وہ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ نہ دیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

بنابرایں تمام مکلفین پر لازم ہے کہ وہ دینی احکامات کو جاننے کیلئے اجتہاد اور استنباط کریں۔فرق صرف یہ ہے کہ ہر شخص پر اپنی استعداد اور امکان کے مطابق واجب ہے کہ اجتہادِ تفصیلی کرے یا اجتہادِ اجمالی۔اگرچہ ثانی الذکر کا نام تقلید ہے۔

تاہم یہ اس لحاظ سے اجتہادِ اجمالی ہے کہ مکلّف کو خدا کے حکم تک رسائی حاصل کرنے میں اطمینان اور تسلی دیتا ہے۔1؎

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ہر شخص کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ احکامِ خدا کو جاننے میں خودکفیل ہو۔اس کی دوصورتیں ہیں:

1۔ ذاتی طور پر قرآن وسنت کے دلائل کی روشنی میں احکام کا علم حاصل کرے۔

1؎ جس طرح خدا، رسول اور آئمہ علیہم السلام کی شناخت کیلئے ضروری ہے کہ دلیل کی بنیاد پر ہو، اسی طرح مکلّف پر واجب ہے کہ وہ دلیل کی روشنی میں ''اہل الذکر'' میں سے مرجع تقلید کو پہچانے۔جب وہ دلیل کی روشنی میں مرجع تقلید کی شناخت حاصل کرلے گا تو اُسے اطمینان حاصل ہوجائے گا کہ وہ احکامِ خدا پر عمل کررہا ہے، نیز یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ مرجع تقلید کا انتخاب مکلّف کی اپنی ذمہ داری ہے۔اگر ایک سے زیادہ مراجع موجود ہوں اور آپ اُن میں سے ایک کا انتخاب کرکے باقی سب کو رَد کردیں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ خود اس بات کے جوابدہ ہیں کہ جس کو آپ نے اپنا مرجعِ تقلید بنایا، کیوں بنایا، اور جن کو ترک کیا، اُن کو کیوں ترک کیا؟ (ہمدانی)۔

2۔ مجتہدین کی مدد سے مفصل دلائل کی روشنی میں احکام کا علم حاصل کرے۔ مندرجہ بالا دونوں صورتوں کے ناممکن ہونے کی صورت میں متقی فقہاء سے سوال کرے۔

مسئلہ: 4 ''اہل الذکر'' سے سوال کرنے کیلئے صرف اُن کا ''اہل الذکر'' ہونا کافی ہے یا اس کے علاوہ اور شرائط بھی ہیں؟ مثلاً اگر چند ''اہل الذکر'' ہوں اور اُن میں
بعض علم وتقویٰ میں دُوسروں پر برتری رکھتے ہوں تو کیا یہ برتری اس مسئلہ پر اثر انداز ہوگی یا نہیں؟

سورۂ زمر کی آیت جو پہلے مذکور ہوچکی ہے، اس کی رُو سے ضروری ہے کہ اجتہاد اور تقلید دونوں میں:

الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ.

''جو ہر قول کو سنتے ہیں، پس ان میں سے احسن پر عمل کرتے ہیں''۔

کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اس آیت میں ''عباد'' (بندگانِ خدا) سے مراد صرف علماء نہیں بلکہ تمام مکلفین ہیں۔ اس لحاظ سے ''یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ '' میں القول سے مراد صرف اچھے اور صحیح اقوال ہوں گے، نہ کہ ہر کسی کے صحیح وغلط نظریات، اس لئے کہ عام مکلفین کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر صحیح وغلط نظریئے کو سنیں اور ان میں سے سب سے بہتر کا انتخاب کریں بلکہ یہ کام صرف محقق علماء کا ہے۔

سورۂ نحل کی مذکورہ آیت میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ صرف اہل الذکر ہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان سے سوال کیا جائے جبکہ سورۂ زمر کی آیت ان میں سے ''قولِ احسن'' یعنی بہترین قول کی اتباع کا حکم دے رہی ہے۔

اگر امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی حدیث میں ''احسنہ'' کا ذکر نہیں پایا جاتا اور صرف مرجعیت کی صلاحیت رکھنے والوں کا ذکر ہے، نہ کہ ان میں سے بہترین کا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اندھی تقلید کی مذمت کرنے کے بعد صرف یہ بیان کرنا چاہا ہے کہ مرجع تقلید صرف وہ ہوسکتا ہے جس میں یہ چار صفات پائی جاتی ہوں:

''.....فَاَمَّامَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهٖ حَافِظًالِدِيْنِهٖ مُخَالِفاًعَلٰى هَوَاهُ مُطِيْعًالِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنَّ يُقَلِّدُوْهُ''۔

''پس فقہاء میں سے جو اپنے نفس کی حفاظت کرنے والا ہو(اپنی نفسانی اورعقلی خواہش کوخدا کے حکم میں داخل نہ کرتا ہو) اپنے دین کا محافظ ہو، اپنی خواہشات کا مخالف ہو(عقل، ایمان اورتقویٰ کے ذریعے اپنی خواہشات پر قابو رکھتا ہو) اوراپنے مولا، اللہ جل جلالہٗ کےاحکام کامطیع ہوتو عوام کیلئے اُس کی تقلید کرنا جائز ہے''۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ان چار صفات کے حامل فقہاء میں سے ہی کسی کی تقلید جائز ہے جبکہ سورۂ زمر کی آیت کی روشنی میں ان میں سے اس فقیہ کی تقلید واجب ہے جس کا قول دیگر فقہاء کے قول سے احسن یعنی بہتر ہو۔اس قولِ احسن کی پیروی کرنے والے ہی اس آیت کی رُو سے اہل ہدایت اوراہل عقل ہیں یعنی اگر کوئی شخص قولِ احسن کوچھوڑ کر غیر احسن کی پیروی کرتا ہےتو وہ نہ ہدایت پر ہےاور نہ ہی اہل عقل میں سے ہے بلکہ گمراہ اور بےعقل ہے۔

مسئلہ:5 ''قولِ احسن'' کے انتخاب کی ذمہ داری مجتہدین اورمقلدین سب پر عائد ہوتی ہے، اس لئے کہ جن ''عباد'' (بندوں) کوآیتِ زمر میں بشارت دی جارہی ہے، صرف مجتہدین ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے تمام صالح بندے ہیں۔مجتہدین کوصرف یہ امتیاز اور برتری حاصل ہے کہ وہ دُوسرے مجتہدین کے فتاویٰ اوران کے دلائل کا بھی مطالعہ کریں اور پھر دلیل و برہان کی روشنی میں جس کی بات اُنہیں اچھی معلوم ہو، اُس کواختیار کریں۔

مگرعوام جو ایسا کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہیں، اپنی صلاحیت کے مطابق ''قولِ احسن'' تک رسائی کیلئے کوشش اوراجتہاد کریں یعنی دو عادل علماء کی گواہی، ایسی شہرت جو غیر معقول اور بے بنیاد نہ ہو یا کسی اور دلیل کی رُو سے بشرطیکہ اس جیسی یا اُس سے برتر دلیل اس کے خلاف نہ ہو، ان مجتہدین میں سے باصلاحیت ترین مجتہد کی تقلید کریں جن میں وہ چاروں صفات پائی جاتی ہوں جو امام

حسن عسکریؑ کی حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔

مسئلہ: 6 اگر ''قولِ احسن'' کی تلاش کے دوران ''قولِ حسنِ مطلق'' تک رسائی حاصل ہو جائے تو اسی کی تقلید واجب ہوگی اور اس کے مقابل ہر قولِ احسن اپنا حسن کھودے گا، اس لئے کہ قولِ احسن کی اتباع صرف اُسی صورت میں واجب ہے جب اقوالِ حسنہ میں سے کوئی بھی حقیقت کو پوری طرح بیان نہ کررہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں قولِ احسن دیگر اقوالِ حسنہ کی نسبت حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے جبکہ قولِ احسن کا معیار یہ ہے کہ فتویٰ دینے والا علم وتقویٰ میں دیگر تمام مجتہدین پر برتری رکھتا ہو۔

مسئلہ: 7 قولِ احسن کی اتباع کے واجب ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ دُوسرے تمام اقوال کی نسبت حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے۔ چاہے فتویٰ دینے والا زندہ ہو یا مر چکا ہو، بالغ ہو یا نابالغ۔ اسی طرح دُوسری شرائط بھی، جو مرجع تقلید کیلئے بیان کی جاتی ہیں، اس میں پائی جاتی ہوں یا نہیں۔ بالفاظِ دیگر مرجع تقلید کیلئے صرف دو شرائط ہیں:

1۔ اعلم ہو (علم میں سب سے برتر) 2۔ اتقیٰ ہو (تقویٰ میں سب سے برتر)

صرف ان دو صفات کی بدولت اُس کے فتویٰ کی اتباع واجب ہوتی ہے۔

مسئلہ: 8 اگر کوئی مجتہد فوت ہو چکا ہو مگر علم وتقویٰ میں ان تمام زندہ اور مردہ مجتہدوں سے افضل ہو، جنہیں ہم جانتے ہیں، تو اس فوت شدہ مجتہد کی ابتدائی تقلید اس کی موت کے بعد بھی اسی طرح واجب ہوگی جیسے اُس کی زندگی میں تھی، اس لئے کہ اجتہاد، تقلید اور احتیاط کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام تک رسائی حاصل کرنا ہے، چاہے مردہ مجتہدین کے فتاویٰ کے ذریعے ہو یا زندہ مجتہدین کے فتاویٰ کے ذریعے۔

علاوہ ازیں تمام مجتہدین اپنے اجتہاد میں رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے اقوال تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں کہ جن میں سے امامِ زمان علیہ السلام کے علاوہ سب اس دُنیا سے

رُخصت ہو چکے ہیں۔ پس اگر میّت کی تقلید حرام ہو تو یہ اجتہاد بھی حرام ہوگا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اقوالِ آئمہؑ کی اتباع درحقیقت قولِ خدا کی اتباع ہے تو بعینہٖ یہی بات فوت شدہ مجتہد کے فتویٰ پر بھی صادق آتی ہے۔

اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اسلامی قیادت صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہے اور واضح سی بات ہے کہ مردہ سیاسی رہنما نہیں بن سکتا، پس مرجع تقلید بھی نہیں بن سکتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سیاسی اُمور بھی ان اُمور کی مانند ہیں جو وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں یا رُونما ہوتے ہیں۔ ان مسائل میں صرف زندہ مجتہد اعلم واتقیٰ کی تقلید واجب ہے لیکن جو مسائل وقت گزرنے کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتے، اُن میں ''یتبعون احسنه'' کی رُو سے صرف اعلم واتقیٰ کی تقلید کی جائے گی چاہے وہ فوت ہو چکا ہو یا زندہ ہو۔

مسئلہ: 9 تقلید کسی شخص کی نہیں بلکہ دراصل ''قولِ احسن'' کی اتباع کا نام ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو اعلم واتقیٰ مجتہد کا کوئی ایسا فتویٰ نظر آئے تو ''قولِ احسن'' نہ ہو تو اس فتویٰ پر عمل کرنا حرام ہے، اس لئے کہ درحقیقت مرجع تقلید قولِ احسن ہے، نہ کہ اسے پیش کرنے والا مجتہد۔ لہٰذا اگر وہ مرجائے یا کسی اور عارضہ میں مبتلا ہو جائے مثلاً دیوانہ ہو جائے یا اپنا حافظہ کھو بیٹھے تو اس قسم کے نشیب وفراز اس کے قول کو قولِ احسن ہونے سے ساقط نہیں کر سکتے مگر یہ کہ کسی اور مجتہد کا اس کے فتویٰ سے بہتر فتویٰ سامنے آچکا ہو۔

مسئلہ: 10 اگر کوئی شخص اجتہاد یا تقلید، دونوں کے بغیر عمل کرے تو اگر اُس کا عمل مطابق واقع ہو اور یہ صرف اللہ تعالیٰ، رسولؐ اللہ اور آئمہ علیہم السلام کو معلوم ہے کہ عمل مطابق واقع ہے یا نہیں، تو اس کا عمل صحیح اور مقبول ہے کیونکہ اجتہاد اور تقلید دونوں کا اوّلین مقصد یہی ہے اور قصدِ قربت میں بھی یہی کافی ہے کہ انسان اسی طرح نیت کرے کہ اس عمل کو خدا کے حکم کے مطابق ہونے کی اُمید پر انجام دیتا ہوں۔

لیکن اگر اس کا عمل مطابق واقع نہ ہو لیکن قولِ احسن کے مطابق ہو تو اس صورت میں بھی اُس کا عمل درست اور مقبول ہے، اس لئے کہ اجتہاد اور تقلید کا دُوسرا مقصد قولِ احسن تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ لیکن اگر اُس کا عمل قولِ احسن کے مطابق بھی نہ ہو تو پھر اس عمل کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، سوائے اس کے کہ وہ شخص قاصرِ مطلق ہو یعنی ایسا جاہل کہ اُسے اپنی جہالت کا بھی علم نہ ہو۔

ہاں! اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ غیر اعلم کی تقلید جائز ہو اور اس شخص کا عمل غیر اعلم کے فتویٰ کے مطابق ہو تو تقصیر کی صورت میں بھی اس کا عمل درست اور مقبول ہے۔

اگر کبھی یہ شخص غفلت سے نکل آئے اور اپنے غلط اعمال کی تلافی کرنا چاہے تو پہلی صورت (مطابق واقع ہونے کی صورت) کے لحاظ سے کوئی حل نہیں ہے، اس لئے کہ واقع کا علم صرف اللہ تعالیٰ، رسولؐ اللہ اور آئمہ علیہم السلام کو ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر عمل کی دوبارہ بجا آوری ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے اعمال قولِ احسن کے مطابق ہوں تو درست اور مقبول قرار پائیں گے۔ لیکن اگر قولِ احسن کے مطابق بھی نہ ہوں تو پھر اس کے اعمال درست نہیں ہوں گے مگر یہ کہ اس پر غیر اعلم کی تقلید جائز ہو۔ پس اگر اس کے اعمال تمام فتاویٰ کے خلاف ہوں تو جہاں تک ممکن ہو، اُن اعمال کو دوبارہ انجام دے۔

مسئلہ: 11 تقویٰ میں برتری کو تو بعض اوقات مکلّف خود بہتر طور پر جان سکتا ہے کہ یہ مرجع حقیقت کو مصلحت پر قربان تو نہیں کرتا یا یہ کہ دُوسروں کی نسبت اس میں اس کا امکان کم ہے! لیکن اعلم کی پہچان صرف مندرجہ ذیل طریقوں سے ممکن ہے:

1۔ اہل خبرہ میں سے دو عادل افراد کی گواہی، بشرطیکہ انہی جیسے دو یا دو سے زیادہ اہل خبرہ اُن کی مخالفت نہ کریں۔

2۔ دھوکہ وفریب سے پاک اور حقیقت پر مبنی صحیح وسالم شہرت۔ اس سلسلہ میں اہل

خبرہ میں پائی جانے والی شہرت ہی معتبر ہے، نہ کہ عوام میں پائی جانے والی شہرت، اس لئے کہ اس بارے میں ان کی تشخیص درست نہیں ہوسکتی۔

3۔ مکلّف خود اہل خبرہ میں سے ہو، فقہی مسائل کی شناخت رکھتا ہو اور مجتہدین کے فتاویٰ کی چھان بین کر کے اُن میں سے یقیناً یا احتمالاً، بہترین فتویٰ کی شناخت کر سکتا ہو۔

ان دونوں یعنی یقینی یا احتمالی صورت میں اس پر اس شخص کی تقلید واجب ہے جس کا فتویٰ اس کی نظر میں احسن ہے۔

اگر کسی بھی طریقے سے اعلم کی پہچان ممکن نہ ہو تو مکلّف کو اختیار ہے کہ جس کی چاہے، تقلید کرے یا یہ کہ تقلید کو ان میں تقسیم کر دے یعنی بعض مسائل میں کسی کی اور بعض میں کسی اور کی تقلید کرے۔

اہل خبرہ کی طرف رجوع کرنا ایک فطری، عقلی اور شرعی مسئلہ ہے کہ اگر آپ خود اہل خبرہ میں سے نہیں ہیں تو اہل خبرہ کی طرف رجوع کریں تا کہ وہ خبرہ ہونے کی بنیاد پر آپ کو اعلم اور اتقیٰ سے روشناس کروائیں۔

مسئلہ: 12 اگر چند مجتہد تقویٰ میں برابر ہوں لیکن علمی مسائل میں ان میں سے ہر ایک بعض مسائل میں دُوسروں سے اعلم ہو تو مکلّف پر واجب ہے کہ اپنی تقلید کو ان میں تقسیم کر دے، مثلاً یوں کہ نماز کے مسائل میں اس کی تقلید کرے جو اِن مسائل میں اعلم ہو اور اقتصادی مسائل میں اُس کی تقلید کرے جو اقتصادیات میں اعلم ہو۔ اسی طرح دُوسرے تمام مسائل میں بھی اسی قاعدے کے مطابق عمل کرے تا کہ ''قولِ احسن'' پر عمل پیرا ہو سکے۔

مسئلہ: 13 اگر دو یا چند مجتہدین میں بعض اتقیٰ اور بعض اعلم ہوں تو اتقیٰ کی تقلید اعلم کی تقلید پر مقدم ہے، اس لئے کہ علم صرف واقع کو دریافت کرتا ہے جبکہ تقویٰ واقع کی حفاظت کا ضامن ہے۔ واضح سی بات ہے کہ زیادہ ضمانت زیادہ مہارت پر مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے:

''یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوااللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًاوَّ یُکَفِّرْعَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ''.(29:8)

''اے اہلِ ایمان! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے لئے حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت قرار دے گا.....''۔

اگر باتقویٰ عالم سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے جو وہ نہ جانتا ہو تو وہ صاف صاف کہہ دے گا کہ میں نہیں جانتا جبکہ بے تقویٰ شخص ایسا نہیں کرے گا۔

پس اگر دو شخص جو دونوں عالم اور متقی ہوں لیکن ایک اعلم اور دُوسرا اتقیٰ ہو تو اتقیٰ کی تقلید واجب ہوگی بلکہ اگر دونوں کے علم و تقویٰ میں برابری کا یقین ہو اور ایک کے اتقیٰ ہونے کا احتمال ہو تو اس کی تقلید واجب ہوگی۔

مسئلہ: 14 جس طرح اجتہاد اور تقلید میں قولِ احسن کی اتباع واجب ہے، اسی طرح اعلم و اتقیٰ کے فتویٰ کو جاننے کیلئے بھی ایسے افراد کی طرف رجوع کرنا واجب ہے جو اس کے فتویٰ کو اچھی طرح جانتے اور بیان کرتے ہوں۔ ہر کس و ناکس سے پوچھنا جائز نہیں ہے۔ اگر مرجع تقلید کے مختلف رسالہ ہائے توضیح المسائل موجود ہوں اور یہ معلوم نہ ہو کہ کونسا پہلے لکھا گیا ہے اور کونسا بعد میں تو جہاں تک ممکن ہو، ایسے رسالہ کی طرف رجوع کیا جائے جو زیادہ قابل اعتماد ہو تا کہ قولِ احسن کی حکمرانی قائم رہے۔

مسئلہ: 15 اگر مجتہد کے فتویٰ کے تبدیل ہو جانے کا عاقلانہ احتمال موجود ہو تو جہاں تک ممکن ہو، اس احتمال کو برطرف کرنے کی کوشش کرے یا مرجع کے موجودہ فتویٰ کو اچھی طرح معلوم کرے۔ ضروری تحقیق اور چھان بین کے بغیر گزشتہ فتویٰ پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ قولِ احسن کیلئے ضروری ہے کہ اطمینان بخش اور قابل اعتماد ہو جبکہ فتویٰ کی تبدیلی کا احتمال اس کے قولِ احسن ہونے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔

مسئلہ: 16 اگر کوئی شخص کسی مجتہد کے فتویٰ کو غلط طور پر اس کے مقلد کو بتا دے یا صحیح طور پر

بتائے اور بعد میں اُس کا فتویٰ تبدیل ہو جائے، دونوں صورتوں میں، خصوصاً پہلی صورت میں، اس پر واجب ہے کہ مقلد کو آگاہ کرے۔ لیکن دُوسری صورت میں اگر اُسے یہ اطمینان ہو کہ مقلد اپنے مرجع کے فتویٰ کے تبدیل ہو جانے کے احتمال کے پیشِ نظر اپنے فرض پر عمل کرے گا تو اُس پر واجب نہیں ہے کہ اُسے آگاہ کرے۔

مسئلہ: 17 اگر مکلّف تمام شرعی مسائل میں اجتہادِ مطلق کی صلاحیت یا امکان نہ رکھتا ہو لیکن بعض مسائل میں دلیل شرعی کا تحقیقی مطالعہ کر کے یا کسی اور کے تسلی بخش بیان کے ذریعے کسی ایک فتویٰ کے دُوسروں سے برتر اور بہتر ہونے کا اطمینان حاصل کر لے تو اُس کیلئے نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے کہ اس پر عمل کرے، جیسا کہ ہمارے کتابچہ ''نمازِ مسافر'' کا مطالعہ کر کے بہت سے افراد قائل ہو گئے ہیں کہ موجودہ دَور میں جبکہ سفر کے وسائل ترقی کر گئے ہیں، 8 فرسخ کے سفر میں نماز قصر نہیں ہوتی۔

چونکہ اس مسئلہ میں وہ ''ان کنتم لاتعلمون'' کے زمرے سے نکل کر 'اہل الذکر' کے زمرے میں داخل ہو چکے ہیں، لہٰذا اس مسئلہ میں اُنہوں نے اس تحقیق پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ علمائے اسلام عام طور پر کافی دُشوار عقلی مسائل کو تو عوام کیلئے بیان کرتے ہیں، حالانکہ عوام کی اکثریت ان کو سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہوتی ہے لیکن ان عملی فقہی مسائل سے عوام کو دُور رکھتے ہیں جو عموماً عرفیات پر مبنی ہیں۔ نہ معلوم انہوں نے یہ اُلٹی گنگا کیوں بہا رکھی ہے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کا طریقہ کار یہ تھا کہ شرعی مسائل کو قرآن وسنت کے دلائل کی روشنی میں لوگوں کی دسترس میں قرار دیتے تھے تاکہ ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق علم ومعرفت کے اس بیکراں سمندر سے فیضیاب ہو سکے اور حتی المقدور حقائق کو سمجھنے میں خود کفیل ہو سکے۔

چونکہ قرآن وسنت، جو احکامِ الٰہی کو دلائل کی روشنی میں بیان کرتے ہیں، کسی خاص گروہ کیلئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کی ہدایت کیلئے ہیں، لہٰذا علماء پر لازم ہے کہ جہاں تک ہو سکے، قرآن و

سنت کو سمجھنے میں عوام کی کوتاہیوں کو دُور کریں، ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں اور جو کچھ اُن سے کہتے ہیں، حتی الامکان دلیل کے ساتھ کہیں تاکہ خشک اور کھوکھلی تقلید کا خاتمہ ہو سکے اور عام مسلمانوں کی علمی سطح بلند ہو۔

اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے تفسیر الفرقان میں آیاتِ احکام کی روشنی میں احکام کے تفصیلی دلائل کو بیان کیا ہے اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، اس رسالہ میں بھی ہم نے حتی الامکان دلیل کے بغیر کوئی بات نہیں کی ہے۔

اس رسالہ کے صفحات قرآن وسنت کے محققین پر کھلے ہوئے ہیں اور ان کی تعمیری اور مثبت تنقید کی روشنی میں اس کے مطالب میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ مسائل اجتہاد وتقلید کے اختتام پر اس بات کا اضافہ ضروری ہے کہ:

''وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ''. (38:42)

''اور وہ اپنے اُمور باہمی مشورے سے چلاتے ہیں''۔

کی روشنی میں شورائی اجتہاد ایک اسلامی ضرورت ہے، اس لئے کہ ایک شخص علم وتقویٰ میں کتنا ہی برتر کیوں نہ ہو، اُس کی رائے مجتہدین کی اس جماعت کی رائے کے سامنے ''قولِ احسن'' نہیں ہوگی جو باہمی مشورے کے بعد رائے قائم کرتے ہیں۔

اگر شورائے فقہاء میں اتفاقِ رائے حاصل ہو جائے تو بہت بہتر، ورنہ کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ اُن کی آراء پختہ تر اور ایک دُوسرے سے قریب ہو جائیں گی اور ایسی صورت میں اکثریت کی رائے کی پیروی واجب ہوگی۔

اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مجتہدین کے فتاویٰ باہمی مشاورت کی بنیاد پر ہوں تو بہت خوب ورنہ ایسے مجتہدین کی تقلید کی جائے گی جو قرآن وسنت کی بنیاد پر اپنے ساتھی مجتہدین کی آراء کا مطالعہ کر کے فتویٰ دیتے ہیں، اس لئے کہ اس طرح ان کا فتویٰ قولِ احسن کا مصداق بن جائے

گا اوران کے مقلدین ''اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ ط'' کے مصداق بن جائیں گے۔



طہارات

اسلام زندگی کے تمام شعبوں کیلئے دستورِطہارت کی حیثیت سے تمام ادیان پر برتری اور فضیلت رکھتا ہے، خواہ وہ باطنی طہارت ہو جوکہ اصل ہے یا ظاہری جو انسان کے ظاہر کو پاک کرتی ہے۔

حدیث شریف ''اَلطَّهَارَۃُ مِنَ الْاِیْمَان ''یعنی ''طہارت جزوِ ایمان ہے''، ہر قسم کی طہارت کو جزوِ ایمان قرار دیتی ہے، اس لئے کہ اگر اس سے صرف ظاہری طہارت مراد ہو تو ''من الایمان'' کی رُو سے وہ بھی جزوِ ایمان ہے اور اگر تمام ظاہری و باطنی طہارات مراد ہوں تو اس صورت میں یہ حدیث ایمان اور طہارت کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی کو بیان کر رہی ہے۔

ہر مسلمان پر اپنے ایمان کی رُو سے واجب ہے کہ اپنے علم، عقل، اخلاق، عقیدہ اور دُوسرے تمام پہلوؤں کو برائیوں اور ناپاکیوں سے پاک کرے اور اس باطنی طہارت کے ساتھ ساتھ اپنے ظاہر کو بھی طہارت اور پاکیزگی سے مزین کرے، اس لئے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ ''، یعنی ''اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

طہارتِ ایمانی کی تین اقسام ہیں:

1۔ بدن، لباس اور گھر وغیرہ کو تمام نجس اور غیر نجس آلائشات سے پاک کرنا۔

2۔ نماز و طواف وغیرہ کی انجام دہی کیلئے وضو، غسل یا تیمّم کے ذریعے خود کو پاک کرنا۔

3۔ مذکورہ بالا دونوں طہارتیں زیادہ سے زیادہ اندرونی اور باطنی طہارت کے حصول کیلئے ہیں جسے حاصل کرنے کیلئے پاکیزہ نیت، پاکیزہ علم، پاکیزہ عقیدے اور پاکیزہ افعال کے ساتھ یہ دو ظاہری طہارتیں بھی ضروری ہیں جو انسان کے باطن کو پاکیزہ بناتی ہیں۔

جس طرح پانی ظاہری طہارت کا بہترین ذریعہ ہے، اسی طرح پاکیزہ نیت اور عقیدہ باطنی طہارت کے مؤثر ذرائع ہیں۔ مختصر یہ کہ ظاہری اور باطنی طہارت میں ہم آہنگی پیدا کرنا تمام مؤمنین کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس لئے کہ طہارت جزوِ ایمان ہے۔

پانی ظاہری نجاست کو برطرف کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ امامِ معصوم علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

"اَلْمَاءُ یُطَهِّرُ وَلَا یُطَهَّرُ".

"پانی پاک کرتا ہے مگر خود اُسے پاک نہیں کیا جاسکتا"۔

اس لئے کہ پانی نجس یا متنجس نہیں ہوتا اور جب نجس ہو جائے تو پانی ہی نہیں رہتا، اس لئے کہ اس صورت میں نجاست اس پر غالب آ کر اس کے رنگ، بو یا ذائقے یا تینوں کو تبدیل کر دیتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب تک پانی نجاست پر غالب ہو یعنی نجاست اس میں گم اور محو ہو جائے، وہ ہرگز متنجس نہیں ہوتا اور جب نجاست پانی پر غالب آ جائے تو وہ متنجس ہو جاتا ہے اور پانی ہی نہیں رہتا۔

پانی کے احکام

پانی کی دو اقسام ہیں:

1۔آبِ مطلق　　　2۔آبِ مضاف

مسئلہ:18 آبِ مطلق اُس پانی کو کہتے ہیں جو صرف پانی ہو۔ نہ خود اس میں کوئی اضافہ موجود ہو، نہ اُس کے نام میں: کھارا پانی، کڑوا پانی، میٹھا پانی، چشمے کا پانی، دریا کا پانی اور کنوئیں کا پانی۔ سب کے سب آبِ مطلق کی مختلف اقسام ہیں جن میں پانی کی اصل ماہیت کے علاوہ اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ یہ سب کے سب صرف اور صرف پانی ہیں۔

لیکن انگور کا پانی، انار کا پانی، گلاب کا پانی، کیچڑ کا پانی اور سونے کا پانی جنہیں آبِ مضاف کہا جاتا ہے، دراصل پانی نہیں ہیں۔ ان پر آبِ مطلق کا حکم جاری نہیں ہوتا۔

جس چیز کے بارے میں علم ہو کہ وہ پانی ہے تو اس پر پانی کا حکم جاری ہوگا اور جس چیز کے بارے میں علم ہو کہ وہ پانی نہیں ہے، اس پر آبِ مضاف کا حکم جاری ہوگا۔

اگر کسی چیز کے بارے میں علم نہ ہو کہ وہ پانی ہے یا کوئی اور چیز تو اس پر نہ پانی کا حکم جاری ہوگا اور نہ آبِ مضاف کا۔

اگر کسی چیز کے بارے میں علم ہو کہ وہ پانی تھا اور بعد میں شک پیدا ہو جائے کہ وہ پانی ہے یا نہیں تو اس پر اس کی پہلی حالت یعنی پانی کا حکم لگایا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی چیز کے بارے میں علم ہو کہ وہ پانی نہیں تھا اور بعد میں شک پیدا ہو کہ وہ پانی ہے یا نہیں تو اس پر بھی اس کی سابقہ حالت یعنی آبِ مضاف کا حکم لگایا جائے گا۔

مسئلہ:19 پانی جہاں بھی ہو، جس مقدار اور جس حالت میں ہو، قرآن شریف کی دو آیات کی نص کے مطابق طاہر اور مطہر ہے:

”وَاَنْزَلْنَامِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا“

”اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی نازل کیا“۔(48:25)

”وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ“

''اور وہ آسمان سے تم پر پانی نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں اس کے ذریعے پاک کرے''۔(11:8)

زمین کا تمام پانی آسمان سے نازل ہوا ہے جو''طہور'' ہے:

''وَاَنْزَلْنَامِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍفَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّاعَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ''.(18:23)

''اور ہم نے آسمان سے اندازے کے مطابق پانی نازل کیا اور اسے زمین میں ٹھہرادیا اور ہم اسے لے جانے پر قدرت رکھنے والے ہیں''۔

لہٰذا پانی کے طاہر ومطہر ہونے اور متنجس نہ ہونے کیلئے نہ کُرہونا شرط ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز بلکہ اس کے طاہر ومطہر ہونے اور نجاست سے متاثر نہ ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ پانی ہو، اس لئے کہ وہ اپنی خلقت کے اعتبار سے طہور ہے۔

مسئلہ:20 طاہر ومطہر ہونا اور نجاست سے متاثر نہ ہونا پانی کی ذاتی خصوصیات میں سے ہے جو ہرگز زائل نہیں ہوتی ہیں، سوائے اس کے کہ پانی پانی ہی نہ رہے یا نجاست اس کے رنگ، بو یا ذائقے پر اس قدر غالب آجائے کہ اسے پانی ہی نہ کہا جاسکے، جیسا کہ شیعہ اور سنی دونوں میں مشہور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث میں آیا ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ الْمَاءَ طَهُوْرًالَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ اِلَّامَاغَيَّرَلَوْنَهُ اَوْطَعْمَهُ اَوْرِيْحَهُ.

''اللہ تعالیٰ نے پانی کو طہور پیدا کیا ہے، اسے کوئی چیز نجس نہیں کرتی سوائے اس کے جو اس کے رنگ، بو یا ذائقے کو بدل دے''۔

(علمائے امامیہ میں سے بہت سے علماء اس بات کے قائل رہے ہیں کہ اگر آب قلیل کا رنگ، بو یا ذائقہ نجاست کی وجہ سے تبدیل نہ ہو تو وہ پاک ہوتا ہے۔ان علماء میں شیخ مفید، فیض کاشانی

اورعمانی کے نام بھی شامل ہیں (مفاتیح الشرائع جلد 2 صفحہ 81)۔

علامہ نراقی اپنی کتاب المستند میں فرماتے ہیں کہ علمائے متأخرین کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔معاصرین میں سے فیض قمی اور قدماء میں سے شیخ طوسی المبسوط میں اور محقق حلی النافع میں اس کے قائل ہوئے ہیں۔اسی طرح سید مرتضیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر نجاست کسی جگہ سے مکمل طور پر زائل اور برطرف ہو جائے،خواہ کسی بھی طریقے سے ہو تو وہ جگہ پاک ہو جاتی ہے)۔

مگر پانی میں نجاست کے مل جانے کے بعد اگر اس کی تین مذکورہ صفات میں سے کوئی صفت تبدیل نہ ہو اور وہ پانی ہونے سے خارج بھی نہ ہو تو ''خبیث'' ہونے کی وجہ سے اس سے وضو اور غسل کرنا یا اسے پینا حرام ہے۔

مسئلہ: 21 پانی کو طہور قرار دینے والی دو مذکورہ آیات اور مذکورہ حدیث کے مقابل اگر کوئی معتبر حدیث ہے تو یہ ہے کہ:

''اِذَابَلَغَ الْمَاءُ قَدْرَ كُرٍّ لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْءٌ''.

''جب پانی ''کُر'' کے برابر ہو جائے تو کوئی چیز اُسے نجس نہیں کرتی''۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر پانی کُر کے برابر نہ ہو تو ''کوئی چیز'' اُسے نجس کر سکتی ہے۔ جو لوگ پانی کے متنجس نہ ہونے کیلئے کُر کو شرط قرار دیتے ہیں،اسی حدیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔اگر یہ مفہوم، نہ کہ منطوق، اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہو، تب بھی قرآنی آیات اور حدیث نبویؐ کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ بالا حدیث میں تعارض پیدا ہو جاتا ہے اور پہلی حدیث مطابق قرآن ہونے کی وجہ سے قابل قبول قرار پاتی ہے جبکہ دُوسری حدیث مخالفِ قرآن ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔

لیکن حدیثِ کُر میں غور کرنے سے یہ خیالی تعارض بھی پیدا نہیں ہوتا،اس لئے کہ اس میں جس ''چیز'' کا ذکر ہے،اس سے مراد صرف نجاست کی وہ مقدار ہے جو پانی کے تین اوصاف میں سے

تینوں یا کسی ایک کو متغیر کردے۔

اگر کُر ہونا پانی کے متنجس نہ ہونے کی ضروری شرط ہوتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے واضح طور پر بیان نہ کیا جائے اور صرف ''حدیثِ کُر'' کے مفہوم پر چھوڑ دیا جائے۔ علاوہ ازیں کُر کے رقبہ اور وزن، دونوں کے بارے میں پائی جانے والی روایات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کُر سے مراد کوئی خاص مقدار نہیں بلکہ اس سے مراد زیادہ پانی ہے جسے زیادہ نجاست ہی متغیر کرسکتی ہے۔

بہرصورت مذکورہ بالا دونوں آیات اور حدیثِ نبویؐ کی رُو سے کوئی نجاست کسی پانی کو اُس وقت تک متنجس نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ اس کے تینوں اوصاف یعنی رنگ، بو اور ذائقہ میں سے کسی ایک کو متغیر نہ کردے۔

مسئلہ: 22 پانی کے رنگ، بو یا ذائقہ میں تبدیلی صرف اُس صورت میں اُسے طاہر یا مطہر ہونے سے ساقط کرسکتی ہے جب وہ نجاست کے اپنے رنگ، بو یا ذائقہ کی وجہ سے ہو۔ البتہ اس کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ پانی کا رنگ، بو یا ذائقہ مکمل طور پر نجاست کے رنگ، بو یا ذائقے کی مانند ہوجائے بلکہ جس مقدار میں بھی یہ تین اوصاف نجاست سے متغیر ہوجائیں، پانی متنجس ہوجائے گا۔ پس اگر انار کا پانی، جس میں پیشاب ملا ہوا ہو، پانی میں مل جائے اور اس کے رنگ کو انار کے پانی کے رنگ کی مانند کردے اور پیشاب کی تین خصوصیات میں سے کوئی بھی صفت پانی میں پیدا نہ ہو تو یہ تبدیلی کوئی اثر نہیں رکھتی۔

ہاں! اگر یہ تبدیلی اس حد تک ہو کہ پانی کو پانی ہی نہ کہا جاسکے تو پھر وہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے ''طہور'' بھی نہیں رہے گا۔ بعبارتِ دیگر مطہر نہیں رہے گا، نہ یہ کہ متنجس ہوجائے گا۔

بہرصورت اگر پانی نجاست کی وجہ سے اس حد تک متغیر ہوجائے کہ نجاست کا پانی کہلانے لگے، نجاست اس کے رنگ، بو یا ذائقے پر اس طرح غالب آجائے کہ اب اسے پانی ہی نہ کہا جاسکے تو

حدیثِ متواتر نبویؐ کے مطابق وہ متنجس ہوجائے گا اور مذکورہ دو قرآنی آیات کی رُو سے ''طہور'' نہیں رہے گا، اس لئے کہ اس تبدیلی کے بعد اب وہ پانی ہی نہیں رہا۔

حدیث میں ہے کہ جب تک پانی نجاست پر غالب ہو، وہ طاہر اور مطہر ہے اور جب نجاست پانی پر غالب آجائے یعنی گزشتہ حدیث کی رُو سے نجاست اس کے رنگ، بو یا ذائقے پر غالب آجائے تو اس صورت میں یہ پانی نہ طاہر ہے نہ مطہر، اس لئے کہ جو پانی خود نجاست سے مغلوب ہو چکا ہو، وہ کسی اور نجاست پر کیسے غالب آسکتا ہے!

مسئلہ: 23 متنجس پانی یا کوئی اور چیز دُوسری چیزوں کو بھی متنجس کرتے ہیں یا صرف خود ہی متنجس ہوتے ہیں؟

کتاب وسنت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ متنجس، نہ کہ عین نجس، دُوسری چیزوں کو بھی متنجس کرتا ہے۔ یہ مسئلہ حجاز جیسی کم آب سرزمین میں اکثر پیش آتا رہتا ہے اور اس مسئلہ پر کسی دلیل کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ متنجس اُن چیزوں کو، جن سے وہ ملاقات کرے، متنجس نہیں کرتا بلکہ صرف عین نجاست یا وہ چیز جو عین نجاست سے متاثر ہو، متنجس کا حکم رکھتی ہے۔

احکامِ بیت الخلا

مسئلہ: 24 پیشاب اور پاخانہ نجاساتِ عینیہ میں سے ہونے کے علاوہ حدثِ اصغر بھی ہیں جو وضو کو باطل کر دیتے ہیں۔ ہر انسان پر واجب ہے کہ پیشاب پاخانہ کرتے وقت اپنی شرمگاہ کو ہر سمجھ دار دیکھنے والے سے پوشیدہ رکھے۔ البتہ اگر کوئی ایسا دیکھنے والا نہ ہو تو پھر پوشیدہ رکھنا واجب نہیں ہے۔ قرآن شریف میں ہے:

''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ''. (30:24)

''(اے رسولؐ!) مؤمنین سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں جھکالیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں''۔

پس شرمگاہوں کی حفاظت ہر لحاظ سے واجب ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ انہیں دُوسروں کی نظروں سے محفوظ رکھا جائے۔

مسئلہ: 25 پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت قبلہ رُو ہونا یا پشت قبلہ کی طرف کرنا حرام ہے مگر یہ کہ مجبوری کی حالت میں ایسا کرنا ناگزیر ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ جب پیشاب پاخانہ کرنے لگو تو قبلہ سے پرہیز کرو۔ اس سے مراد سامنے اور پشت کی جانب سے پرہیز کرنا ہے، اس لئے کہ ہر طرف سے اجتناب ممکن ہی نہیں ہے۔

مسئلہ: 26 مقامِ پاخانہ کی تطہیر کیلئے اسے پانی سے دھونا یا کسی ایسی چیز سے صاف کر لینا کافی ہے جس سے نجاست مکمل طور پر برطرف ہوجائے۔ لیکن مقامِ پیشاب کی طہارت کیلئے اسے پانی سے دھونا ضروری ہے، جیسا کہ معتبر حدیث میں آیا ہے کہ عضو پر باقی ماندہ پیشاب کی مقدار کے دو برابر پانی سے طہارت حاصل ہوجاتی ہے کہ اگر وہ ایک قطرہ ہو تو پانی کے دو قطرے طہارت کیلئے کافی ہیں۔

شیر خوار بچہ، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، اگر زمین، قالین یا لباس وغیرہ پر پیشاب کردے تو اسے پاک کرنے کیلئے اس پر اتنا پانی ڈال دینا کافی ہے جو پیشاب پر غالب آجائے بلکہ جہاں بھی پانی نجاست پر غالب آجائے، طہارت حاصل ہوجاتی ہے۔

نجاسات

مسئلہ: 27 فقہی کتب اور رسالہ ہائے عملیہ میں جن نجاسات کا ذکر پایا جاتا ہے، اُن میں شراب اور کافر (خواہ کسی قسم کا ہو) کی نجاستِ عینی پر کوئی تسلی بخش دلیل موجود نہیں ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ

وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ''. (90:5)

''اے ایمان والو! شراب، جوا، انصاب اور ازلام پلید شیطانی اعمال ہیں، پس ان سے اجتناب کرو، ہوسکتا ہے تم فلاح پا جاؤ''۔

اس آیت میں ''من عمل الشیطان'' کے قرینے نے ''رجس'' کے معنی کو جسمانی اور عینی نجاست سے عملی اور معنوی نجاست کی طرف پھیر دیا ہے۔ اس آیت کی رُو سے شراب پینا یا ہر وہ عمل جس کا نتیجہ شراب خواری کے نتیجہ کی مانند ہو، پلید شیطانی عمل ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اگر شراب لباس پر لگ جائے تو وہ نجس ہو جائے گا اور اس میں نماز پڑھنا حرام ہو جائے گا۔

اسی طرح میسر یعنی جوئے کو، جو کہ ایک فعل ہے، رجس اور حرام کہا گیا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جوئے کے آلات نجس ہیں۔

انصاب وہ مخصوص بت تھے جن پر قربانی کی جاتی تھی۔ ان کی پرستش اور ان پر قربانی کو رجس قرار دیا گیا ہے لیکن ان بتوں کا جسم نجس نہیں ہے اور اگر گیلا ہاتھ یا کپڑا ان سے چھو جائے تو وہ نجس نہیں ہوتا۔

یہی حال ازلام کا ہے۔ ازلام وہ تیر ہیں جن کے ذریعے کسی جانور کو ایک جماعت میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ عمل اور اس طرح تقسیم شدہ گوشت کا کھانا رجس اور حرام ہے لیکن نہ تو وہ تیر نجس ہیں اور نہ ہی وہ چیزیں جن کو یہ تیر لگیں۔ ہاں! اگر جانور غیر شرعی طریقے پر ذبح کیا گیا ہو تو وہ مردار ہونے کی وجہ سے نجس قرار پائے گا۔ سورۂ مائدہ ہی میں ارشاد ہوتا ہے:

''وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ''. (5:5)

''اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی، اُن کا کھانا تم پر حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن پر حلال ہے''۔

اس آیت کی رُو سے اہل کتاب کا کھانا ہم پر حلال ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثر کھانے مرطوب ہوتے ہیں، انہیں ہاتھ لگتے ہیں اوراب بھی، جبکہ کھانا پکانے کے جدید وسائل ایجاد ہو چکے ہیں، اس بات کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ ہاتھ لگے بغیر کھانا تیار ہو سکے۔ لہٰذا اگر اہل کتاب نجس العین ہوں تو ان کا کھانا حلال ہونے کا قاعدہ کیونکر درست ہوسکتا ہے!

روایات سے بھی اہل کتاب کا نجس العین ہونا ثابت نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اگر روایات میں ان کے نجس العین ہونے پر دلالت موجود ہوتی تو اس آیت کی نص کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔

مشرکین کے بارے میں قرآن شریف کی آیت یہ ہے:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا''.

''مشرک تو ہیں ہی نجس، پس وہ اس سال کے بعد مسجد الحرام کے نزدیک نہ آئیں''۔(28:9)

''المشرکون'' کا لفظ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس میں بیان شدہ نجاست کا تعلق ان کی رُوح، عقائد اور عمل سے ہے، جسم سے نہیں۔ جسم نہ موحد ہے اور نہ مشرک۔ ہمارے اس دعویٰ کی ایک اور دلیل آیت کا یہ حصہ ہے:

''فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ''.

اس لئے کہ نجاست اگر مسجد کو آلودہ نہ کرے یا مسجد کی توہین کا موجب نہ ہو تو اس کا مسجد میں لے جانا حرام نہیں ہے، یہی آیت مزید کہتی ہے:

''وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ''

''اگر تمہیں مالی تنگی کا خوف ہو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا''۔

حج کے دِنوں میں مشرکین کے تجارتی قافلے مکہ آتے تھے جن سے اہل مکہ کو بہت مالی فائدہ پہنچتا تھا۔ جب ان کے مسجد الحرام کے قریب آنے پر پابندی لگی تو مسلمانوں میں اقتصادی مشکلات کا خوف پیدا ہونے کا امکان ایک قدرتی سی بات تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ تسلی دے رہا ہے کہ اگر اُس نے چاہا تو اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا۔

یہاں سے ایک اور بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس آیت میں مسجد الحرام سے مراد صرف مسجد کا احاطہ نہیں ہے، اس لئے کہ مسجد کے اندر کبھی تجارت نہیں ہوتی تھی بلکہ اس سے مراد شہر مکہ یا پورا حرم ہے، اس لئے کہ اگر مشرکین کا صرف مسجد میں داخل ہونا یا اس کے نزدیک ہونا ممنوع ہوتا اور مکہ میں داخل ہونا جائز ہوتا تو مالی تنگی کا خوف پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

نتیجہ یہ کہ مشرکین کی قلبی اور باطنی نجاست کی وجہ سے مسجد الحرام میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ مسجد الحرام توحید کا مرکز اور ہر قسم کی رُوحانی اور باطنی طہارت کا سرچشمہ ہے۔

مسئلہ: 28 انسان جو بھی ہو اور جیسا بھی عقیدہ رکھتا ہو، کتے اور سوّر کی مانند نجس العین نہیں ہوتا۔ مسلمان اور کافر کے درمیان جسمانی نجاست اور طہارت کے لحاظ سے صرف یہ فرق ہے کہ اگر مسلمان کا جسم کسی نجاست سے نجس ہو جائے اور وہ ایک نماز کا پورا وقت غائب رہے یا خود کہے کہ اُس نے خود کو پاک کر لیا ہے تو اُسے پاک سمجھا جائے گا۔ لیکن کافر چونکہ اپنی نماز میں طہارت کے پابند نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی بات قابل قبول ہے، لہٰذا اسے صرف اُس صورت میں پاک سمجھا جائے گا جب آپ خود اُسے اپنے آپ کو پاک کرتے ہوئے دیکھیں یا دُوسرے شرعی طریقوں سے اُس کے پاک ہونے کا علم حاصل کر لیں۔

اگر کافر نجس ہو جائے اور خود کو پاک بھی کر لے مگر ہمیں معلوم نہ ہو کہ نجاست پہلے تھی یا طہارت تو اس صورت میں اُسے پاک سمجھا جائے گا، اس لئے کہ اس صورت میں اس کی طہارت اور

نجاست دونوں مشکوک ہیں۔ یہاں پر قاعدۂ طہارت کی پیروی لازم ہوگی جو یہ ہے:

’’كُلُّ شَيْءٍ طَاهِرٌ حَتّٰى تَعْلَمَ اَنَّهٗ قَذِرٌ فَاِذَا عَلِمْتَ فَقَدْ قَذِرَ‘‘.

یعنی ہر چیز پاک ہے جب تک تم اس کے ناپاک ہونے کو جان لو اور جب تم جان لو کہ وہ ناپاک ہے تو اب وہ ناپاک ہے۔

اس مسئلہ میں مسلمان اور کافر میں کوئی فرق نہیں۔

پیشاب پاخانہ

انسان اور خونِ جہندہ رکھنے والے حرام گوشت جانور کا پیشاب پاخانہ نجس ہے۔ پس حلال گوشت جانور یا وہ حرام گوشت جانور جو خونِ جہندہ نہ رکھتا ہو یا اُس کے حلال گوشت یا حرام گوشت ہونے یا اُس کے خون کے جہندہ یا غیر جہندہ ہونے میں شک ہو تو اِن سب کا پیشاب اور پاخانہ قاعدۂ طہارت کی رُو سے پاک ہے۔ لہٰذا صرف اُس حیوان کا پیشاب اور پاخانہ نجس ہے جس کے بارے میں علم ہو کہ وہ حرام گوشت ہے اور خونِ جہندہ رکھتا ہے۔ پرندوں میں تمام پرندوں کا پیشاب اور پاخانہ پاک ہے۔

’’كُلُّ شَيْءٍ يَطِيْرُ فَلَا بَاْسَ بِبَوْلِهٖ وَخَرْئِهٖ‘‘.

یعنی ہر وہ چیز جو اُڑتی ہے، اُس کا پیشاب اور پاخانہ پاک ہے۔

یہاں پر صرف اُڑنے کو ہی طہارت کی حکمت یا علت قرار دیا گیا ہے۔ اگر طہارت کیلئے حلال گوشت ہونا ضروری ہوتا تو ’’پرندہ‘‘ ہونے کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اس روایت کے مقابل کوئی دلیل موجود نہیں ہے، سوائے اس روایت کے:

’’اِغْسِلْ ثَوْبَكَ مِنْ بَوْلِ مَالَا يُوْكَلُ لَحْمُهٗ‘‘.

یعنی اپنے لباس کو ہر اُس چیز کے پیشاب سے آلودہ ہونے کی وجہ سے دھولو جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا۔

لیکن گزشتہ حدیث اس حدیث کے عموم کی تخصیص کرتی ہے اور اس طرح یہ حکم پرندوں کے علاوہ دُوسرے جانوروں سے مخصوص ہو جاتا ہے۔ بالفرض اگر یہ حدیث گزشتہ حدیث کے مقابل نص ہوتی تو ان دونوں احادیث میں تعارض پیدا ہو جانے کی وجہ سے دونوں بے اثر ہو جائیں گی اور یہاں بھی قاعدۂ طہارت جاری ہو جائے گا۔ بنابرایں چونکہ حرام گوشت پرندوں کے پیشاب اور پاخانہ کی نجاست پر کوئی دلیل نہیں، لہٰذا قاعدۂ طہارت کی رُو سے وہ پاک ہیں۔

مردار

مسئلہ 29: خونِ جہندہ رکھنے والے حیوان کے مردار کے وہ تمام اجزاء نجس ہیں جن میں زندگی ہوا کرتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ بعض رسالہ ہائے عملیہ میں ہڈی کو اُن اجزاء میں سے قرار دیا گیا ہے جن میں زندگی نہیں ہوتی حالانکہ ہڈی میں دیگر اعضاء کی نسبت زندگی زیادہ شدت سے پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہڈی کو چوٹ لگنے یا اُس کے ٹوٹ جانے سے جو درد ہوتا ہے، وہ اُس درد کے مقابل کہیں زیادہ ہوتا ہے، جو گوشت کے کٹ جانے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا مردار کے زندگی رکھنے والے دُوسرے اجزاء کی طرح اُس کی ہڈی بھی نجس ہے۔

سینگ اور دانت بھی ہڈی کی مانند زندگی رکھنے والے اعضاء ہیں، لہٰذا مردار کے دانت اور سینگ بھی نجس ہیں۔ لیکن بال اور ناخن وغیرہ میں چونکہ زندگی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ نجس نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مردہ مرغی کے پیٹ میں پایا جانے والا انڈہ اور دُوسرے حیوانوں کے مردار میں پائی جانے والی وہ تمام چیزیں جن میں زندگی نہیں ہوتی، پاک ہیں۔

مردار جو نجس ہے، صرف وہی جانور ہی نہیں جو خود بخود طبعی موت مر گیا ہو بلکہ ہر وہ حیوان جس کی جان غیر شرعی طریقے پر نکلی ہو، مردار ہے۔ اگر کسی زندہ جانور کا ایسا عضو کاٹ لیا جائے جس میں زندگی ہوا کرتی ہے تو وہ بھی مردار کے زمرے میں آتا ہے اور نجس ہوتا ہے۔

انسان یا حیوان کے جسم کی کھال کے جو چھوٹے ٹکڑے الگ ہو جاتے ہیں، چونکہ ان پر لفظ

مردار صادق نہیں آتا، لہٰذا وہ نجس نہیں ہیں۔

خون

مسئلہ: 30 حرام گوشت حیوانات کا خون بطورِ کلی حرام اور نجس ہے اور غیر حیوان کا خون پاک اور حلال ہے۔ صرف خونِ جہندہ رکھنے والے حیوان کے خون کے دو حصے ہیں: ایک وہ جو شرعی طور پر ذبح کرتے وقت طبعی طور پر معمول کے مطابق اُس کے بدن سے نکلتا ہے جسے قرآن شریف میں ''**دماً مسفوحاً**'' یعنی ''بہایا گیا خون'' کہا گیا ہے، یہ خون نجس ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔

دُوسرا وہ خون جو شرعی طور پر ذبح کرنے کے بعد بدن میں باقی رہ جاتا ہے۔ یہ خون پاک ہے اور اس کا کھانا حلال ہے، اس لئے کہ قرآن شریف میں صرف **دماً مسفوحاً** کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو خون غیر مسفوح (یعنی نہ بہایا ہوا) ہے، وہ حلال اور پاک ہے۔

حرام گوشت حیوانات کا خون اُن کے دیگر اجزاء کی طرح حرام اور نجس ہے۔ البتہ حرام گوشت دریائی جانوروں کا خون صرف حرام ہے، نجس نہیں ہے۔ جو خون بعض اوقات انڈے میں پایا جاتا ہے، وہ پاک اور حلال ہے، اس لئے کہ ''**دماً مسفوحاً**'' نہیں ہے۔

مسئلہ: 31 جو جانور خونِ جہندہ نہیں رکھتے، اُن کا خون پاک ہے، اس لئے کہ **دماً مسفوحاً** کے زمرے سے خارج ہے اور اگر یہ جانور حلال گوشت بھی ہوں، جیسا کہ مچھلی، تو ان کا خون پاک ہونے کے علاوہ حلال بھی ہے۔

مسئلہ: 32 جو خون نجس ہیں، اُن کے احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ دُوسری نجاسات کی مانند اگر وہ بدن یا ایسے کپڑے پر لگ جائے تو شرمگاہوں کو آگے اور پیچھے سے چھپانے کیلئے کافی ہے تو واجب ہے کہ نماز یا احرام کیلئے اسے پاک کر لیا جائے یا استعمال نہ کیا جائے۔ لیکن اگر خون ناخن کی پشت کے برابر یا اس سے کم ہو تو اس کے ساتھ نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن دُوسری نجاسات میں اس قسم کا کوئی استثناء نہیں ہے۔

ظاہراً نجس العین اور حرام گوشت جانور کے خون اور حیض ونفاس واستحاضہ کے خون میں بھی اس قسم کا کوئی استثناء نہیں ہے اور نماز میں نجاست کو ساتھ رکھنے کی حرمت کا قاعدہ ان سب پر جاری ہوگا بلکہ صرف انسان اور حلال گوشت جانور کے خون کی ایک ناخن کے برابر مقدار اور زخم کا خون مستثنیٰ ہیں۔ البتہ زخم کے خون کے بارے میں یہ رعایت صرف اس وقت تک ہے جب وہ ٹھیک نہ ہوجائے اور اُسے دھونا مشقت اور حرج کا باعث ہو۔ اس کے علاوہ ہر صورت میں نماز گزار کے بدن یا لباس پر خون کا ہونا ممنوع ہے۔

مسئلہ: 33 وہ خون جس کا حالتِ نماز میں نماز گزار کے ساتھ ہونا ممنوع ہے، صرف وہ خون ہے جو بدن یا ایسے لباس پر ہو جو ستر پوشی کیلئے کافی ہو۔ لہٰذا جراب یا چھوٹے رومال وغیرہ جیسی چیزوں کے خون آلود ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

منی

مسئلہ: 34 انسان کی منی، خواہ مرد کی ہو یا عورت کی، نجس ہے۔ جیسا کہ صحیحہ محمد بن مسلم میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

''ذَکَرَالْمَنِیَّ وَشَدَّدَهُ وَجَعَلَهُ اَشَدَّمِنَ الْبَوْلِ. ثُمَّ قَالَ اِنْ رَاَیْتَ الْمَنِیَّ قَبْلَ اَوْبَعْدَمَاتَدْخُلُ فِیْ صَلَا تِکَ فَعَلَیْکَ اِعَادَةَ الصَّلَاةِ. وَاِنْ نَظَرْتَ فِیْ ثَوْبِکَ فَلَمْ تُصِبْهُ ثُمَّ صَلَّیْتَ فِیْهِ ثُمَّ رَاَیْتَهٗ بَعْدُفَلَااِعَادَةَ عَلَیْکَ وَکَذَاالْبَوْلَ''.

''آپ نے منی کا ذکر کیا اور اس کے بارے میں شدت سے کام لیا اور اسے پیشاب سے بھی زیادہ نجس قرار دیا۔ پھر فرمایا کہ اگر تم نماز میں داخل ہونے سے پہلے یا اس کے بعد منی کو دیکھو تو دوبارہ نماز پڑھو اور اگر تم نے اپنے کپڑوں کو دیکھا اور منی کو نہ پایا اور پھر اُن میں نماز پڑھ لی اور نماز کے بعد ان میں منی کو دیکھا تو دوبارہ نماز پڑھنا تم پر واجب نہیں ہے اور پیشاب بھی اسی طرح ہے''۔

مسئلہ 35: اگر کسی چیز کی طہارت یا نجاست کا حکم معلوم نہ ہو تو اس کا پوچھنا واجب ہے لیکن اگر حکم معلوم ہو اور صرف موضوع میں شک ہو، مثلاً یہ چیز پیشاب ہے یا نہیں تو پوچھنا واجب نہیں ہے۔

مسئلہ 36: اگر کسی چیز کے بارے میں علم ہو کہ وہ نجس تھی لیکن بعد میں اس کے پاک یا نجس ہونے میں شک ہو تو وہ نجس ہی تصور کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی چیز کے بارے میں علم ہو کہ وہ پاک تھی لیکن بعد میں اس کے پاک یا نجس ہونے میں شک ہو تو وہ چیز پاک سمجھی جائے گی، اس لئے کہ ایسے مواقع پر ''**لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ**'' پر عمل کیا جائے گا یعنی ''جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو، اُس کی پیروی نہ کرو'' (36:17)۔

مسئلہ 37: اگر دو یا زیادہ چیزوں میں سے کسی ایک کے نجس ہونے کا یقین ہو مگر یہ معلوم نہ ہو کہ اُن میں سے کونسی چیز نجس ہے تو جن اُمور میں طہارت شرط ہے، اُن میں ان سب سے اجتناب ضروری ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک مکمل طور پر آپ کی دسترس سے خارج ہو جائے یا ضائع ہو جائے یا آپ اُسے ضائع کر دیں تو باقی ماندہ کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً اگر پانی کے دو برتنوں میں سے ایک نجس ہو لیکن معلوم نہ ہو کہ وہ کونسا ہے تو ان میں سے کسی کو بھی وضو یا کسی اور طہارت کیلئے استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو ضائع کر دیا جائے تو دُوسرے برتن کے پانی کے پاک یا نجس ہونے کا شک چونکہ شکِ ابتدائی ہے، اس لئے قاعدۂ طہارت کی رُو سے وہ پاک قرار دیا جائے گا اور اس سے غسل اور وضو درست ہو گا۔

مسئلہ 38: اگر چند چیزوں میں سے ایک نجس ہو اور کوئی پاک چیز سرایت کرنے والی رطوبت کے ذریعے ان میں سے کسی ایک سے ملاقات کرے تو وہ نجس نہیں ہو گی، اس لئے کہ جس چیز سے اس نے ملاقات کی ہے، اُس کا نجس ہونا یقینی نہیں ہے لیکن اگر وہ چیز ان تمام چیزوں سے ملاقات کر لے تو وہ ضرور نجس ہو جائے گی۔

☆☆☆

مطہرات (پاک کرنے والی چیزیں)

مسئلہ: 39 پانی مطہرات میں سے بکثرت اور بآسانی پایا جانے والا ہےلیکن طہارت صرف اس پر منحصر نہیں ہے بلکہ جس طریقے یا ذریعے سے نجاست زائل ہوجائے، وہ چیز جس پر نجاست تھی، پاک ہوجائے گی۔

مسئلہ: 40 اگرنجس چیز یا جگہ پراتنا پانی ڈال دیا جائے جس سے نجاست زائل ہوجائے تو وہ پاک ہوجاتی ہےلیکن وہ برتن جسے کتے یا سوٴر نے چاٹا ہو، صرف اُسی صورت میں پاک ہوسکتا ہے جب اُسے پہلے پاک مٹی سے مانجھا گیا ہو اور بعد میں پانی سے دھویا گیا ہو۔

مسئلہ: 41 نجاست کی ماہیت بدل جانے سے بھی نجس چیز پاک ہوجاتی ہے، مثلاً اگر مردار نمک کی کان میں دفن ہوکر نمک بن جائے تو پاک ہوجائے گا۔

مسئلہ: 42 زمین، درخت، عمارت، دیواریں اور اس طرح کی ثابت اور ناقابل انتقال اشیاء پرلگی ہوئی مرطوب نجاست یامتنجس اگر دُھوپ سے خشک ہوجائے تو وہ پاک ہوجاتی ہیں، اگرچہ اس کے خشک ہونے میں ہوایا گرمی کو بھی دخل حاصل ہو۔اس میں معیار یہ ہے کہ عرفاً یہ کہا جاسکتا ہو کہ اس مرطوب نجاست کو دُھوپ نے خشک کیا ہے۔

وضو۔غسل۔تیمّم

یہ طہارتیں جو عبادات اور دُوسرے واجب کاموں کیلئے ضروری ہیں، فقہ معرفت میں انسان کی رُوحانی پاکیزگی کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کرے تو لباس اور بدن کی ظاہری نجاسات سے پاکیزگی کے ساتھ ساتھ احداث سے بھی پاک ہو اور اس پاکیزگی کو حاصل کرنے کا ذریعہ وضو یا غسل یا

ان دونوں کے بدلے میں تیمّم ہے۔

وضواس حقیقت کی طرف عرفانی اشارہ ہے کہ خدائے ذوالجلال کی بارگاہِ مقدس میں انسان کا چہرہ، جواُس کا ظاہری انسانیت کا اصلی مرکز ہے، ناپاک دیکھنے، ناپاک کہنے اور ناپاک سننے سے پاک ہواوراس کی علامت چہرے کا دھونا ہے۔

اسی طرح انسان کے ہاتھ بھی ناپاک اور ناپسندیدہ افعال سے پاک ہوں جس کا اشارہ بازوؤں کا دھونا ہے۔اسی طرح انسان کا ذہن، جواُس کی عقل اور فکر کا مرکز ہے، ناپاک نیت، ناپاک علم اور ناپاک ارادوں سے پاک ہو،اس کی علامت سر کا مسح ہے۔اسی طرح اُس کے پاؤں برے اور ناپاک مقاصد کیلئے قدم اُٹھانے سے پاک ہوں،اس کے لئے پاؤں کا مسح لازم ہے۔

غسل جو پورے بدن کو دھونے کا نام ہے،خصوصاً جنابت میں ظاہری بدن کو دھونے کے علاوہ اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ انسان کا پورا وجود خدا کی مقدس بارگاہ میں ہر قسم کی پلیدی سے پاک ہو،اس لئے کہ جنابت، اگرچہ حلال ہی سے ہو،ایسے شہوانی عمل کا نتیجہ ہے جو جسم اور رُوح سمیت انسان کے سارے وجود پر محیط ہوتا ہےلیکن عبودیتِ حق کے مقام پر ہر قسم کی جائزشہوت سے بھی پاک ہونالازم ہے، ناجائز اور ناپاک شہوت تو دُور کی بات ہے۔

تیمّم میں خاک آلود ہاتھوں کو چہرے اور دونوں ہاتھوں کی پشت پر پھیرا جاتا ہے۔ یہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اپنی پیشانی کو، جواُس کی انسانیت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو، جواُس کے تمام اعمال کا اصلی محور ہیں، پاک مٹی یا پاک زمین سے مَل کر خدا کی عبادت کیلئے اپنے خشوع اور خضوع کو کمال بخشتا ہے۔

اب ہم طہارت کی ان تین اقسام پر فقہِ عملی کے پہلو سے روشنی ڈالتے ہیں:

1۔ وضو

”فَلَمْ تَجِدُوْ امَآءً فَتَيَمَّمُوْ اصَعِيْدًاطَيِّبًا“.

’’اور تم پانی نہ پاؤ تو پاکیزہ اُونچی زمین پر تیمّم کرو‘‘۔(6:5)

اس آیہ شریفہ کی روشنی میں صرف آبِ مطلق سے ہی وضو کرنا درست ہے جو دو اعضاء (چہرہ اور بازو) کے دھونے اور دو اعضاء (سر اور پاؤں) پر مسح کرنے پر مشتمل ہے۔

مسئلہ: 43 وضو کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ قصدِ قربت کے ساتھ یعنی قربۃً الی اللہ انجام دیا جائے، اس لئے کہ حکم یہ ہے:

’’یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ‘‘.(6:5)

’’جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور اپنے سر کے بعض حصے اور پیروں کے اُبھاروں تک مسح کرو‘‘۔

چونکہ نماز عبادت ہے اور قصدِ قربت کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی، لہٰذا وضو بھی، جو نماز کیلئے ہے، قصدِ قربت کے بغیر صحیح نہیں۔ اگر خدا کے حکم کی اطاعت کی نیت کی بجائے خود کو ٹھنڈا کرنے یا ظاہری پاکیزگی یا خودنمائی یا کسی اور ارادے سے انجام دیا جائے تو ہرگز وضو شمار نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی نماز یا ہر اُس کام کیلئے، جس کیلئے طہارت شرط ہے، کافی ہوگا۔

مسئلہ: 44 وضو کی دو قسمیں ہیں: ارتماسی یا ترتیبی۔ ارتماسی وضو میں پہلے پورے چہرے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے یا پانی اس کے اُوپر ڈالا جاتا ہے۔ پھر دونوں بازوؤں کو اس ترتیب کے ساتھ کہ پہلے دایاں اور پھر بایاں بازو پانی میں ڈبویا جاتا ہے۔ پھر باقی ماندہ نمی سے سر اور پاؤں کا مسح کیا جاتا ہے۔ بازوؤں کو دھونے کی نیت پانی سے نکالتے وقت کرنی چاہیئے تا کہ ان پر باقی ماندہ نمی وضو سے زائد پانی کی نہ ہو۔

مسئلہ: 45 چہرے اور بازوؤں کے دھونے کو ارتماسی اور ترتیبی میں تقسیم کرنا جائز ہے، اس

طرح کہ چہرے اور دونوں بازوؤں میں سے بعض کو ارتماسی اور بعض کو ترتیبی طور سے دھویا جائے، خصوصاً جب چہرہ یا کوئی بازو زخمی اور خون آلود ہو اور پانی اس کیلئے نقصان دہ نہ ہو اور ارتماسی طریقے پر دھوئے بغیر اس کا پاک ہونا ممکن نہ ہو تو اس کو ارتماسی طریقہ پر دھونا واجب ہو جاتا ہے۔ اسے اس طرح دھونا چاہیئے کہ خون آلود عضو کو پانی میں داخل کرنے کے بعد خون کے نکلنے کی جگہ کو اس طرح دبائے کہ لحظہ بھر کیلئے خون بند ہو جائے اور اگر خون بند نہ ہو تو پھر بھی ارتماسی طریقہ پر دھونا ہی کافی ہے۔

مسئلہ: 46 چہرے کو لمبائی میں سر کے بالوں کے اُگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک اور چوڑائی میں اتنے حصے کو، جو ہاتھ کے انگوٹھے کے سرے سے لے کر درمیانی اُنگلی کے سرے تک ہاتھ کے نیچے آجائے، دھونا واجب ہے۔ چہرے میں جو کچھ شامل ہے، اُس میں چہرے کے بال بھی شامل ہیں۔ ان سب کا دھونا واجب ہے۔ البتہ بالوں کے نیچے کی جلد کو دھونا ضروری نہیں ہے۔ ہاں! اگر بال گھنے نہ ہوں اور چہرے کی جلد ان میں سے نظر آتی ہو تو پھر نیچے کی جلد کو دھونا ضروری ہے۔ اسی طرح آنکھوں، ناک اور منہ کو بھی اندر سے دھونا ضروری نہیں ہے۔

مسئلہ: 47 چہرے کو دھونے کیلئے کسی خاص ترتیب کی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ ''**فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ**'' نے صرف چہرہ دھونے کو واجب قرار دیا ہے۔ چاہے جس ترتیب سے دھویا جائے، چہرے کو اُوپر سے نیچے کی طرف دھونے کے واجب ہونے میں روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اُس کی آیت کے اطلاق کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، اس لئے کہ جو روایات اُوپر سے نیچے کی طرف دھونے کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں، وہ آیت کے اطلاق کے خلاف ہونے کے علاوہ اُن روایات کے بھی خلاف ہیں جن میں رسولِ اکرمؐ کے وضو کو بیان کیا گیا ہے، ان میں بھی اس کیفیت کو بیان نہیں کیا گیا۔ لہٰذا چہرے کو دھونے میں کوئی خاص کیفیت شرط نہیں ہے۔

''**فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ**'' یعنی ''اپنے چہروں کو دھولو'' سے صرف چہرے کے دھونے کا

وجوب ہی سمجھا جاتا ہے، چاہے ارتماسی طریقے پر ہو چاہے ترتیبی طریقے پر، چاہے پہلے اُوپر سے دھوئیں یا نیچے سے یا درمیان سے یا جیسے بھی، لیکن اُوپر سے دھونا بہتر ہے۔

مسئلہ: 48 اس کے بعد دائیں ہاتھ کو کہنی سے، جو بازو کی دونوں ہڈیوں کے سروں اور ان کے درمیانی حصہ پر مشتمل ہے، اُنگلیوں کے سروں تک دھوئیں۔ پھر بائیں بازو کو اسی طرح دھوئیں۔ پھر وضو کی باقی ماندہ رطوبت سے سر کے کسی بھی حصے پر اُوپر سے نیچے یا نیچے سے اُوپر کی طرف مسح کریں، اس لئے کہ ''وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِکُمْ'' کے مطابق سر کے بعض حصے پر مسح کرنا واجب ہے۔ یہ صرف سر کے بعض حصے پر مسح کرنے کو واجب کررہی ہے۔

زرارہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ سر کے بعض حصے پر مسح کرنا کہاں سے ثابت ہے؟

آپؑ نے فرمایا: ''لمکان البا'' یعنی ''برؤسکم'' کی ''ب'' سے جس کے معنی بعض حصہ یا بعبارتِ دیگر تبعیض ہے۔ لیکن پاؤں کیلئے یہ تبعیض نہیں ہے اور واجب ہے کہ چوڑائی میں پورے پاؤں پر ہتھیلی سے مسح کیا جائے اور لمبائی میں پاؤں کی اُنگلیوں سے لے کر اُبھری ہوئی ہڈی تک، اس لئے کہ ''اَرْجُلَکُمْ'' منصوب ہے اور ''بِرؤسِکم'' کی 'ب' اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ لہٰذا سر اور پاؤں کے مسح میں اس لحاظ سے فرق ہے۔

مسح کے متعلق آیت کے اس سادہ ترجمہ پر اکتفا کی جاتی ہے: ''اپنے سر کے بعض حصے کا اور پاؤں کے گٹوں تک پورے پاؤں پر مسح کرو''۔

مسئلہ: 49 سر اور پیروں کے مسح میں ضروری ہے کہ ہاتھوں کی نمی سر اور پیروں پر منتقل ہو اور یہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ سر اور پاؤں خشک ہوں یا یہ کہ اگر تر ہوں تو ان کی نمی ہاتھوں کی نمی سے کم اور اس سے مغلوب ہو۔ بالفاظِ دیگر یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ ہاتھ کی نمی پاؤں اور سر پر اثر انداز ہوئی ہے۔

مسئلہ: 50 اگر کسی معقول وجہ سے ہاتھ کی نمی سر اور پاؤں کے مسح کیلئے کافی نہ ہو اور دوبارہ وضو کرنے سے بھی مشکل حل نہ ہو تو چہرے یا بازوؤں سے نمی لے کر مسح کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر مجبوراً تازہ پانی سے مسح کرنا ہوگا، اس لئے کہ مسح کیلئے ضروری ہے کہ نمی کے ساتھ کیا جائے۔

مسئلہ: 51 افعالِ وضو کے درمیان اتنا وقفہ نہیں ہونا چاہیئے جس سے وضو کا عمل اپنی وحدت (یعنی ایک کام ہونے کی حیثیت) سے خارج ہو جائے بلکہ اسے یوں انجام دینا چاہیئے کہ دیکھنے والے کہہ سکیں کہ یہ شخص ایک ہی کام انجام دے رہا ہے، نہ کہ چند کام۔

موالات کے معنی بھی یہی ہیں اور وجوبِ موالات کی دلیل **فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ** کی ''ف'' ہے جسے فاءِ تفریع کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ وضو کے تمام افعال کو متصل کر کے ان کے درمیان فاصلہ کو کم کرتی ہے۔ حدیث میں بھی ہے کہ:

''فان الوضو لا یتبعض''.

''وضو قابل تقسیم نہیں ہے''۔

یعنی ایک ہی عمل ہے اور اس میں پہلے اعضاء کے خشک ہونے یا نہ ہونے کا کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے کہ اگر افعالِ وضو کو بغیر کسی وقفہ کے یکے بعد دیگرے انجام دیا جائے اور سابقہ اعضاء خشک ہو جائیں تو وضو صحیح اور موالات برقرار ہے لیکن اگر سابقہ اعضاء خشک نہ ہوں اور وقفہ بہت زیادہ ہو اور موالات برقرار نہ رہے تو وضو درست نہیں ہے۔

مسئلہ: 52 سر کے مسح میں اتنی مقدار پر مسح کرنا کافی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ سر پر مسح کیا گیا ہے، چاہے ایک ایک اُنگلی سے ہو یا زیادہ سے اور لمبائی میں بھی چاہے کم ہو یا زیادہ، اسی قدر کافی ہے کہ سر پر مسح کرنا صادق آئے۔ لیکن پاؤں میں ہاتھ کی پوری ہتھیلی سے پاؤں کی پوری چوڑائی پر اور لمبائی میں اُنگلیوں سے لے کر پاؤں کی پشت پر اُبھری ہوئی ہڈی تک مسح کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 53 وضو کرتے وقت چہرے، بازوؤں، سر اور پاؤں پر کپڑا، تیل یا اور کوئی چیز جو نمی کو ان اعضاء کی جلد تک نہ پہنچنے دے، نہیں ہونی چاہئے۔

حدیث میں ہے کہ جو لوگ حیوان کی کھال یعنی جوتے وغیرہ پر مسح کرتے ہیں، وہ قیامت کے دن اپنے وضو کو حیوان کی کھال پر ہی پائیں گے، اس لئے کہ اُنہوں نے اپنی انسانی کھال پر مسح کرنے کی بجائے حیوان کی کھال پر مسح کیا۔

مسئلہ: 54 واجب ہے کہ وضو کا پانی پاک ہونے کے علاوہ مباح بھی ہو، اس لئے کہ غصبی پانی سے وضو کرنا حرام ہے۔ سوائے ایسے اضطرار اور مجبوری کی حالت میں جسے انسان نے خود ایجاد نہ کیا ہو، اس لئے کہ "اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ"، "مگر یہ کہ تم اضطرار میں ڈال دیئے جاؤ" کی رُو سے صرف اُس اضطرار میں حرام کو حلال کیا گیا ہے جو آپ کے ارادے اور خواہش کے بغیر رُونما ہوا ہو۔

مسئلہ: 55 پاؤں کے مسح میں احتیاط واجب یہ ہے کہ پاؤں کی ساری پشت مسح سے تر ہو جائے، سوائے اُس مقدار کے جو عام طور پر عسر اور حرج کے بغیر ممکن نہیں اور یہ ضروری بھی نہیں ہے۔

مسئلہ: 56 سر کے مسح کی مانند پاؤں کے مسح میں بھی کوئی خاص کیفیت یا ترتیب ضروری نہیں ہے۔ جس طرح اُنگلیوں کے سروں سے اُوپر کی جانب کو مسح کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اُوپر سے اُنگلیوں کی جانب مسح کرنا بھی صحیح ہے اور "اِلَی الْکَعْبَیْن" مسح کی سمت کا نہیں بلکہ پاؤں کے اُس حصہ کا تعین کر رہی ہے جس کا مسح واجب ہے۔

آیت اس بارے میں بالکل خاموش ہے کہ پاؤں کے مسح کی کیفیت کیا ہونی چاہئے! نہ اس آیت میں اور نہ ہی روایات میں یہ ملتا ہے کہ اُنگلیوں کی جانب سے مسح کرنا ضروری ہے بلکہ اس کے برعکس مسح کرنے کی تصریح اور تصدیق ملتی ہے۔

مسئلہ: 57 ظاہراً پیروں کے مسح میں کوئی ترتیب ضروری نہیں ہے، دونوں پیروں پر ایک ساتھ مسح کرنے میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ دائیں پاؤں کو بائیں پر مقدم کرنا بہتر ہے اور بائیں پاؤں کو

دائیں پاؤں پر مقدم کرنا احتیاطِ مستحب کے خلاف ہے، اس لئے کہ اس کے ممنوع ہونے پر کوئی تسلی بخش دلیل موجود نہیں ہے۔ آیہ شریفہ بھی اس بارے میں مطلق ہے۔ پہلے دائیں اور پھر بائیں کی ترتیب کا وجوب صرف بازوؤں کے دھونے میں ہے۔ یہی روایاتِ متواترہ کی روشنی میں ثابت ہے۔

مسئلہ: 58 سر اور پاؤں کے مسح میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس پر دھونا صادق نہ آئے، اس لئے کہ مسح چاہے جس شکل میں بھی ہو، کافی ہے، چاہے تھوڑی سی نمی سر اور پیروں پر منتقل ہو یا اُنہیں کافی گیلا کردے یا چاہے باقی ماندہ رطوبت اتنی زیادہ ہو کہ مسح پر دھونا صادق آجائے، بشرطیکہ نیت مسح کرنے کی ہو، اگرچہ بغیر قصد کے دھونا رونما ہوجائے۔

البتہ اگر سر اور پاؤں کا مسح کرنے کی بجائے انہیں دھولیا جائے تو چاہے دھونے کی نمی مسح کی نمی سے کمتر ہی کیوں نہ ہو، وضو باطل ہے، اس لئے کہ چہرے اور بازوؤں کو دھونے کے بعد سر اور پاؤں پر مسح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، دھونے کا نہیں۔

سنی فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ ''اگر پیروں کو دھولیا جائے تو اس صورت میں بھی مسح ہوجاتا ہے اور اپنے فرض سے زیادہ کام انجام دینے میں کوئی حرج نہیں''۔ اس لئے غلط اور مردود ہے کہ خدا کے حکم میں کسی بھی قسم کی کمی یا بیشی کرنا حرام ہے۔ علاوہ ازیں ہر دھونا مسح نہیں ہے، جیسا کہ ہر مسح دھونا نہیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے صرف مسح کرنے کا حکم دیا ہے، اگرچہ اس پر دھونا صادق آتا ہو، دھونے کا حکم نہیں، اگرچہ اس پر مسح کا اطلاق ہوتا ہو۔

مسئلہ: 59 مکلّف پر لازم ہے کہ حتی الامکان خود وضو کرے، نہ کہ دُوسرے اُسے وضو کروائیں۔ اگر اس کیلئے خود وضو کرنا ممکن نہ ہو تو صرف اُسی حد تک دُوسرے کی مدد حاصل کرسکتا ہے جس سے وہ خود وضو کرنے کے قابل ہوجائے۔ اگر صرف ہاتھوں پر پانی ڈالا جائے تاکہ اُس سے وضو کرلیا جائے تو اس پر بھی کوئی پابندی اور ممانعت نہیں ہے۔ اضطرار کے بغیر وضو کے اعضاء پر پانی ڈالنا مناسب نہیں ہے بلکہ اگر وضو کے عنوان سے پانی ڈالا جائے تو وضو باطل ہے لیکن اگر دُوسرا شخص

اعضائے وضو پر پانی ڈالے اور مکلّف خود نیت کر کے دھونے کے عمل کو انجام دے تو اس کا وضو درست ہے۔ جب تک انسان خود وضو کر سکتا ہو، اُس کے مقدمات کو خود انجام دینا واجب نہیں ہے، اگرچہ بہتر ہے۔

مسئلہ: 60 واجب نمازوں کیلئے وقت سے پہلے وضو کیا جاسکتا ہے، خصوصاً اس قدر پہلے جس سے اوّل وقت نماز پڑھی جاسکے اور نماز کیلئے آمادگی کے طور پر نماز کے وقت سے قبل وضو کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب بھی ہے۔

وقت سے پہلے عبادتِ خدا کیلئے آمادہ ہونا آدابِ عبادت میں سے ہے۔ نماز کے وقت سے پہلے نماز کیلئے کئے جانے والے وضو کے صحیح نہ ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ ظاہرِ آیت اور بعض روایات نماز کے وقت سے پہلے نماز کیلئے آمادگی کو مستحب قرار دیتی ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو کہ وضو کو نماز کے وقت کے داخل ہونے کے بعد تک معرض التواء میں ڈال دیا جائے یا اب وضو نہ کیا گیا تو نماز کیلئے وضو کرنا ممکن نہ ہوگا، تو اس صورت میں نماز کے وقت کے شروع ہونے سے قبل وضو کرنا واجب ہو جائے گا تاکہ نماز کے وقت انسان بے وضو نہ ہو۔

مسئلہ: 61 اگر کوئی شخص نماز کے وقت سے قبل باوضو ہو اور اُسے علم ہو کہ نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد وضو کرنا اُس کیلئے ممکن نہ ہوگا یا بیماری یا کسی اور مانع کی وجہ سے وضو اُس پر حرام یا ناممکن ہو جائے گا تو ان تمام صورتوں میں وضو کو باطل کرنا حرام اور باقی رکھنا واجب ہوگا مگر یہ کہ موجب عسر یا حرج ہو۔

مسئلہ: 62 اگر کسی شخص کے پاس وضو کیلئے پانی نہ ہو بلکہ برف ہو جو نماز کا وقت گزر جانے سے پہلے پانی میں تبدیل ہو سکتی ہو تو واجب ہے کہ برف کے پانی میں تبدیل ہو جانے تک انتظار کیا جائے تاکہ نماز کو وضو کے ساتھ ادا کر سکے، اس لئے کہ تیمّم صرف اُس صورت میں جائز ہے، جب نماز کے تمام وقت کے دوران وضو کیلئے پانی دستیاب نہ ہو۔

مسئلہ: 63 اگر کچھ فاصلے پر، چاہے کم ہو یا زیادہ، پانی کے پائے جانے کا احتمال یا یقین ہو اور اُسے عسر و حرج کے بغیر حاصل کیا جا سکتا ہو تو اس صورت میں نماز کیلئے وضو کرنا واجب ہے، چاہے پانی کے پائے جانے والی جگہ ایک یا دو تیر کے فاصلے پر ہو یا زیادہ، اس لئے کہ تیمّم صرف اُس صورت میں جائز ہے جب نماز کے تمام وقت کے دوران پانی دسترس میں نہ ہو۔

مسئلہ: 64 اگر پانی صرف ایسے شخص کے پاس ہو جو مفت لیکن احسان کے ساتھ دیتا ہو تو اس سے پانی لے کر وضو کرنا واجب نہیں ہے۔ اگر احسان کے بغیر لیکن اتنی قیمت پر جو اسراف اور تبذیر نہ ہونے کے علاوہ اُس کیلئے آسانی سے قابل ادا ہو تو یہاں پر وضو واجب ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا یا کر سکتا ہو لیکن اُس کی قیمت اتنی زیادہ ہو کہ اسراف ہو اور مفت خوری کی حوصلہ افزائی کا موجب ہو تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ پانی لے کر وضو کرنا واجب نہیں بلکہ جائز بھی نہیں ہے۔

ہاں! اگر انسان کا کسی ایسی جگہ سے گزر ہو جہاں پانی کم ہوتا ہو اور اس وجہ سے اُس کی قیمت زیادہ ہو اور مفت خوری یا لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانے والی بات نہ ہو، جیسا کہ مثال کے طور پر مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کا ایک گلاس ایک ریال (تقریباً سترہ روپے) میں بکتا ہے تو یہاں اگر قوتِ خرید اجازت دیتی ہو تو پانی خرید کر وضو یا غسل کرنا واجب ہے ورنہ واجب نہیں ہے۔

لیکن اگر کسی ایسی جگہ جہاں پانی بکثرت اور مفت پایا جاتا ہو لیکن اتفاق سے نہ مل رہا ہو یا کسی موقع پرست اور ناجائز منافع خور کے پاس ہو اور آپ کو پانچ روپے فی گلاس مل سکتا ہو تو اس صورت میں یہ پانی خریدنا دو لحاظ سے حرام ہے جن میں سے ایک اسراف اور دُوسرا مفت خوری کی حوصلہ افزائی ہے اور اس سے وضو کرنا حرام ہے یا کم از کم درست نہیں۔

آیہ ''فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً'' ایسے پانی کے ملنے کی صورت میں وضو کو واجب قرار دیتی ہے جو شرعاً جائز ہو۔ لہٰذا ایسی صورت میں پانی کی عادلانہ قیمت سے زیادہ رقم دینا اسراف اور مفت خوری کی

حوصلہ افزائی کے سبب دُہرا احرام ہے۔

جہاں احسان کے ساتھ پانی ملتا ہو، وہاں بھی انسان پانی سے محروم ہے، اس لئے کہ اس طرح پانی لے کر وضو کو واجب کرنا مؤمن کے احترامِ ایمانی اور ضمیر ایمانی سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لئے کہ لِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ 'یعنی' عزت اللہ کیلئے، اُس کے رسولؐ اور مؤمنین کیلئے ہے'۔ لہٰذا وضو یا غسل کیلئے ایسے پانی کو قبول کرنے کا حکم دینا، جو احسان کے ساتھ ہو، مؤمن کی عزتِ ایمانی کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے موجبِ عسر و حرج ہے۔

پانی کے ملنے یا نہ ملنے کا معیار عقلی، عرفی اور شرعی امکان ہے۔ یہ سب شرعی امکان ہیں، اس لئے کہ اگر مباح پانی کے ہوتے ہوئے کوئی اور رُکاوٹ وضو یا غسل سے مانع ہو تو اس صورت میں وضو یا غسل نہ واجب ہے اور نہ ہی جائز۔ اگر اس صورت میں وضو یا غسل کر لیا جائے تو چونکہ یہ شرعی لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تیمّم بھی کیا جائے تا کہ وہ عبادت جو طہارت کے ساتھ مشروط ہے، قبول ہو سکے۔

پانی کے پائے جانے سے صرف پانی کا موجود ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد پانی کے استعمال کا ممکن ہونا ہے۔ ہماری ایک دلیل خود یہ آیت ہے:

''وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا''. (6:5)

''اگر تم بیماری میں ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی بیت الخلاء سے آئے یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو اور پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاکیزہ زمین پر تیمّم کرو''۔

یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ بیماری کی حالت میں پانی نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا استعمال ممکن نہیں ہے، نہ یہ کہ پانی موجود نہیں ہے یا مباح نہیں ہے۔ یہاں بیماری کا پانی کو طہارت

کیلئے نایاب قرار دینا اس بات کو سمجھ لینے کے لئے کافی ہے کہ ہر عذر جو پانی کے استعمال کی راہ میں رُکاوٹ بن رہا ہو، ''فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً'' کا مصداق بن کر تیمّم کو واجب کردے گا۔

وضو کے صحیح ہونے کی چند مزید شرائط

جو کچھ مذکور ہو چکا ہے، اس کے علاوہ مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ رکھنا وضو کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے:

مسئلہ: 65 وضو کے پانی کا پاک ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ''فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً'' (اور تم پانی کو نہ پاؤ) کی روشنی میں پانی کا ہونا ضروری ہے، پانی کے طہور ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ خود طاہر ہوتا کہ نجاست یا حدث کو برطرف کر سکے۔

مسئلہ: 66 وضو کے پانی اور جگہ کا مباح ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ عبادات کی انجام دہی میں جو چیز حرام ہے، اُس کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ پس جس وضو کا حکم نہ دیا گیا ہو، وہ خود بخود باطل ہے، خصوصاً جب اس کے پانی یا مکان کے استعمال سے بھی منع کیا گیا ہو۔ اس صورت میں بھی ''فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً'' کا مصداق اور نمونہ ہوگا، اس لئے کہ شرعی طور پر پانی حاصل کرنے سے قاصر اور معذور ہے۔

بنا بر ایں وضو کے پانی اور مکان کے مباح ہونے کا علم شرعی طریقہ سے حاصل ہونا ضروری ہے ورنہ وضو کا صحیح ہونا کم از کم غیر یقینی ہوگا اور ایسا وضو نماز کیلئے کافی نہیں۔

مسئلہ: 67 عمومی مقامات مثلاً سڑکیں اور پارک وغیرہ جن کا استعمال ظاہراً سب کیلئے جائز اور مباح ہے، ایسے مقامات پر وضو کرنا مباح ہے۔ اگر عوامی استعمال کا مباح ہونا مشکوک ہو تو پھر وہاں وضو نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ پانی کے تمام شرائط کے ساتھ پائے جانے کا یقین ہونا ضروری ہے جن میں سے ایک شرط اُس کا مباح ہونا ہے۔

مسئلہ: 68 اعضائے وضو یعنی چہرہ، دونوں بازو، سر اور پاؤں کا پاک ہونا ضروری ہے اور اگر نجس ہوں تو ضروری ہے کہ وضو سے پہلے انہیں پاک کرلیا جائے، پھر وضو کیا جائے۔ البتہ اگر وضو کو ارتماسی طریقہ پرانجام دیا جائے تو دونوں طہارتوں کا ایک ساتھ حاصل ہوجانا درست ہے، بشرطیکہ چہرہ یا بازو کو پانی میں داخل کرنے کے بعد وضو کی نیت کی جائے تا کہ وضو پاک اعضاء پرانجام پائے۔ اگر دونوں عمل یعنی طہارتِ اعضائے وضو اور وضو ایک ساتھ انجام پائیں تو وضو کی صحت کا احتمال باقی ہے، اگرچہ خلافِ احتیاط ہے۔

مسئلہ: 69 اعضائے وضو کے علاوہ جسم کے دُوسرے اجزاء یا پیشاب اور پاخانہ کے مقامات کا نجس ہونا وضو کے صحیح ہونے سے مانع نہیں ہوتا۔

مسئلہ: 70 اگر اعضائے وضو میں سے بعض اعضاء نجس ہوں اور وضو کے بعد یہ شک ظاہر ہو کہ وضو سے قبل انہیں پاک کیا تھا یا نہیں تو صرف اس صورت میں وضو باطل ہے جب یقین ہو کہ وضو کے وقت اس عضو کی طہارت یا نجاست کی طرف متوجہ نہیں تھا، علاوہ ازیں ہر صورت میں وضو درست ہے۔ پہلی صورت میں وضو کے باطل ہونے کا سبب استصحابِ نجاست ہے۔ دُوسری صورتوں میں صحیح ہونے کا سبب قاعدۂ فراغ ہے کہ اگر کسی عمل کو انجام دینے کے بعد اُس کی صحت میں شک ہو تو اس کو صحیح سمجھا جائے گا۔

مسئلہ: 71 اگر نماز اور وضو دونوں کے انجام دینے کیلئے وقت ہو تو دونوں کو انجام دینا واجب ہے۔ اگر وضو کرنے کی صورت میں نماز کا کچھ حصہ وقت کے بعد انجام پاتا ہو تو اس صورت میں وضو واجب نہیں ہے اور نماز کیلئے تیمّم کرنا چاہئے۔

اگر وقت اس قدر تنگ ہو کہ تیمّم کی صورت میں بھی نماز کا کچھ حصہ وقت کے بعد انجام پاتا ہو تو اس صورت میں اگر ایک رکعت وقت میں پڑھ سکتا ہو تو تیمّم کرنا واجب ہے، اس لئے کہ قاعدۂ ''مَنْ اَدْرَکَ رَکْعَةً مِنَ الْوَقْتِ اَدْرَکَ کُلَّهُ'' (جس نے ایک رکعت کا وقت پالیا تو اُس نے

پورا وقت پالیا) حالتِ اضطرار میں نافذ ہوتا ہے۔ چونکہ نماز کیلئے طہارت ضروری ہے، لہٰذا کم از کم تیمّم ضرور کر لینا چاہیئے اور اس نماز کو جس کی کم از کم ایک رکعت وقت میں ہے، انجام دینا چاہیئے۔

مسئلہ: 72 سر اور پاؤں کے مسح میں ضروری ہے کہ ہاتھ کو سر اور پاؤں پر حرکت دی جائے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے یعنی سر یا پاؤں کو حرکت دی جائے تو وضو باطل ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ہاتھ سے سر اور پاؤں کا مسح کرنے کی بجائے پاؤں اور سر سے ہاتھ کا مسح عمل میں آجاتا ہے۔ لیکن اگر دونوں طرف سے مسح ہو جائے تو وضو درست ہے، اس لئے کہ جو کچھ واجب ہے، وہ یہ ہے کہ ہاتھ مسح کرنے والا ہو، چاہے پاؤں اور سر مسح کرنے والے نہ ہوں۔

مسئلہ: 73 مسح میں ہاتھ کا سر اور پاؤں پر رکھ دینا کافی نہیں ہے بلکہ ہاتھ کو اس حد تک کھینچنا لازم ہے جس پر لفظ مسح یعنی پھیرنا صادق آتا ہو۔

مسئلہ: 74 چونکہ افعالِ وضو کو انجام دینا مکلّف پر فرض ہے، لہٰذا صرف اس صورت میں دُوسروں سے مدد لے سکتا ہے یا دُوسرا شخص اُس کے تمام افعالِ وضو کو انجام دے سکتا ہے، جب خود ان افعال کی بجا آوری پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اس صورت میں مکلّف خود نیت کرے اور جہاں تک ہو سکے، افعالِ وضو کو انجام دے اور جنہیں انجام نہ دے سکے، اُنہیں دُوسرا شخص انجام دے۔ سر اور پاؤں کے مسح کیلئے مکلّف اپنے ہاتھوں پر وضو کی باقی ماندہ نمی لے اور اُس کا نائب اُس کے اپنے ہاتھوں سے اُس کو مسح کروائے۔

مسئلہ: 75 حالتِ اضطرار میں وضو میں مدد دینے والا نائب اگر اس نیابت کی اُجرت طلب کرے، جو مکلّف ادا کر سکتا ہو اور اسراف اور مفت خوری کی حوصلہ افزائی بھی نہ ہو تو اس اُجرت کا ادا کرنا واجب ہے لیکن اگر ادا نہ کر سکتا ہو تو پھر تیمّم کرے۔

مسئلہ: 76 اگر کسی نے وضو کیا ہو اور اُس سے حدث بھی سرزد ہوا ہو لیکن یہ نہ جانتا ہو کہ وضو پہلے تھا یا حدث، تو اگر یہ شک نماز سے پہلے پیدا ہو تو واجب ہے کہ دوبارہ وضو کرے اور اگر نماز کے

دوران شک پیدا ہوتو نماز باطل ہے اور وضو کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر نماز کے بعد شک پیدا ہوتو نماز صحیح ہے، بشرطیکہ یہ احتمال موجود ہو کہ نماز شروع کرتے وقت وہ اپنی حالت سے آگاہ تھا ورنہ نماز باطل ہے اور دوبارہ پڑھنا واجب ہے، اس لئے کہ فراغت کے بعد شک پیدا ہونے کی صورت میں عمل صرف اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے، جب اس کی تمام شرائط کے پائے جانے کا علم یا احتمال موجود ہو۔ لیکن اس کے بعد کی نمازوں اور طہارت سے مشروط اعمال کی انجام دہی کیلئے وضو کرنا واجب ہے۔

مسئله: 77 اگر نماز کے بعد شک پیدا ہو کہ باوضو تھا یا نہیں تو جو نماز پڑھ چکا ہے، وہ صحیح ہے اور بعد کی نماز کیلئے وضو کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر اُسے یقین ہو کہ نماز سے قبل باوضو تھا، پھر اس وضو کے باطل ہونے کا شک پیدا ہوتو گزشتہ نماز درست ہے اور بعد کی نمازوں کیلئے بھی وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئله: 78 ''وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ''.(36:17)

کی رُو سے علم کے بغیر کسی چیز کی اتباع حرام ہے۔ اسی طرح قاعدہ ''یقین کو شک سے نہ توڑو'' کہ یہ قاعدہ بھی مندرجہ بالا آیت سے ماخوذ ہے، اس اصول کی روشنی میں یقین کے بعد پیدا ہونے والا شک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر آپ کا لباس یا بدن پاک ہوں لیکن بعد میں آپ کو ان کی طہارت یا نجاست میں شک ہوتو اس شک کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور بدن یا لباس کے پاک ہونے کا حکم برقرار رہے گا۔

اسی طرح اگر کسی چیز کے نجس ہونے کا یقین ہو اور بعد میں اس کے پاک ہونے کا شک ہوتو اس شک کی طرف توجہ کئے بغیر اس کو بدستور نجس سمجھا جائے گا۔ وضو، غسل اور تیمّم جیسی طہارات کے متعلق پیدا ہونے والے شک اور یقین میں بھی یہی قاعدہ نافذ ہوگا کہ بعد میں پیدا ہونے والے شک کو نظر انداز کر کے گزشتہ یقین پر عمل کیا جائے گا۔

مسئله: 79 اگر کوئی شخص ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ ہر وقت پیشاب اور پاخانہ کم کم آتا رہتا

ہواورعسروحرج کے بغیراسے روکناممکن نہ ہواور یہ احتمال ہو کہ نماز کے تمام وقت کے دوران وضوکر کے نماز ادا کرنے کی فرصت مل جائے گی تو واجب ہے کہ نماز میں اُس وقت تک تاخیر کرے، اگر چہ صرف واجباتِ نماز کوانجام دینے کی فرصت میسر ہو۔لیکن اگر کسی ایسی فرصت کے پیدا ہونے کا یقین یا احتمال نہ ہوتو اس صورت میں مضطر کا عمل انجام دینا واجب ہے کہ پانی اپنے پاس رکھے اور جب بھی دورانِ نماز پیشاب یا پاخانہ آئے تو طہارت اور وضوکو تازہ کرتا رہے اور نماز کوتوڑے بغیر انجام دے۔لیکن یہ عمل دُشوار ہوتو جس حدتک دُشوار نہیں ہے، انجام دے، اس سے زیادہ واجب نہیں۔

مسئلہ: 80 اگر کسی بیماری کی وجہ سے، مسلسل نیند یا ریح کے خارج ہونے میں مبتلا ہوتو اس صورت میں بھی گزشتہ مسئلہ کے حکم پر عمل کرے۔

مسئلہ: 81 اگر کوئی معذور شخص کسی ممکن ذریعے سے، جو دُشواری کا سبب نہ ہو، اپنے عذر کو برطرف کرسکتا ہوتو اس صورت میں اس پر اس عذر کو برطرف کرنا دولحاظ سے واجب ہے، اس لئے کہ علاج واجب ہے اور انجامِ واجب کیلئے عذر کو برطرف کرنا بھی واجب ہے۔عذر اس وقت تک عذر ہے جب تک اسے برطرف کرناممکن نہ ہو۔

مسئلہ: 82 اگر دونوں پیروں کے مسح کے بعد وضو کے بعض واجبات یا افعال کے متعلق شک پیدا ہوتو قاعدۂ فراغ کی رُو سے اس کا وضو صحیح ہے۔اگر وضو مکمل ہونے سے قبل شک پیدا ہوتو مشکوک عمل اور اس کے بعد کے اعمال کوانجام دینا واجب ہے۔

ایسے کام جن کیلئے وضوواجب ہے

مسئلہ: 83 مندرجہ ذیل کاموں کیلئے وضوکرنا واجب ہے:

1۔ تمام یومیہ اور غیر یومیہ واجب نمازوں کیلئے، سوائے نمازِ میّت کے۔

2۔ نماز میں فراموش شدہ سجدہ اور تشہد کیلئے اور نمازِ احتیاط کیلئے۔لیکن اگر نماز یا ان

واجبات کے دوران عمداً حدث سرزد ہو تو سرے سے نماز باطل ہو جائے گی۔

3۔ طوافِ واجب کیلئے، چاہے اس کا وجوب اصلی ہو، جیسا کہ حج اور عمرہ کا طواف یا غیر اصلی جیسا کہ نذر یا قسم کی رُو سے واجب طواف۔

4۔ اگر کسی وجہ سے قرآن شریف کے خط کو مس کرنا واجب ہو تو اس کیلئے وضو واجب ہے، اس لئے کہ ''لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ'' (79:56)

یعنی '' باطہارت افراد کے علاوہ کوئی قرآن کو مس نہیں کرسکتا۔

مسئلہ: 84 ''لَّا يَمَسُّهٗٓ'' یعنی '' اسے (قرآن کو) مس نہیں کرسکتا'' کا تعلق صرف اس قرآن سے نہیں ہے جو عربی خط میں ہو بلکہ ہر وہ چیز جسے قرآن کہا جاسکے، یہی حکم رکھتی ہے۔ اس میں طہارت از نجاست اور طہارت از حدث دونوں ضروری ہیں۔

مسئلہ: 85 اللہ تعالیٰ کے اسماء جو قرآن شریف کی اساس ہیں، چاہے جس زبان میں ہوں، انہیں طہارت کے بغیر بدن کا کوئی حصہ لگانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک جس زبان اور جس شکل میں ہو، اسی طرح قرآن شریف کی آیات بطور کلی ''لَّا يَمَسُّهٗٓ'' کے حکم میں داخل ہیں۔ لہٰذا اگر درختوں یا پھولوں کی کیاریوں یا دیواروں یا حتیٰ کہ گاڑیوں کو ایسی ترتیب دی جائے جس سے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کوئی نام یا قرآنی آیت بنتی ہو تو بغیر وضو کے ان کو بدن کے کسی حصے سے مس کرنا حرام ہے۔ ان درختوں یا پھولوں کی کیاریوں کی اصلاح اور آبیاری کرنے والا باغبان ان کو بغیر طہارت کے مس نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

مبطلاتِ وضو

(وضوکو باطل کرنے والی چیزیں)

مسئلہ: 86 جو چیزیں غسل کو باطل کرتی ہیں، وہ سب وضوکو بھی باطل کرتی ہیں۔ان کے علاوہ پیشاب، پاخانہ، مقامِ پاخانہ سے خارج ہونے والی ہوا، آنکھوں اور کانوں پر چھا جانے والی نیند، یہ سب وضوکو باطل کرتی ہیں۔

نیند کے متعلق قرآن شریف کا ارشاد یہ ہے:

''اِذْيُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ''.(8:11)

''جب نیند تمہارے اُوپر چھا جاتی ہے اور وہ تم پر آسمان سے پانی نازل کرتا ہے تا کہ تمہیں اس کے ذریعے پاک کرے اور شیطان کی پلیدی کو تم سے دُور کرے''۔

اگر ''**اِذْيُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ**'' (جب نیند تمہارے اُوپر چھا جائے) وضو کو باطل نہ کرتی ہوتو ''**لِّيُطَهِّرَكُمْ**'' (تا کہ تمہیں پاک کرے) کی یہاں کوئی گنجائش نہ ہوتی، صرف نعاس یعنی نیند وضو کو باطل نہیں کرتی بلکہ ''**يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاس**'' کہ اس سے مراد تمام حواس پر نیند کا چھا جانا ہے اور یہی وہ نیند ہے جو وضو کو باطل کرتی ہے، اس لئے کہ بعض اوقات نیند آنکھوں پر مسلط ہو جاتی ہے لیکن کان بیدار ہوتے ہیں لیکن جب آنکھ اور کان دونوں پر نیند غالب ہو جائے تو دل اور رُوح بھی سو جاتے ہیں، یہی ''**اِذْيُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ**'' ہے۔

اس کے بعد دُوسرا مرحلہ ''**وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ**'' (اور شیطان کی پلیدی کو تم سے دُور کرے) ہے۔**رجز الشیطان** سے مراد جنابت ہے جو کبھی نیند میں بھی ہو جاتی ہے

اور لِّیُطَهِّرَ کُمْ بِهٖ' کی رُو سے اس سے طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی پانی ہے۔

مسئلہ: 87 جو چیزیں عقل پر چھا جاتی ہیں، کیا وضو کو باطل کر دیتی ہیں؟ نشہ جو اِن میں سب سے قوی ہے، اس کے متعلق سوال کا جواب منفی ہے، اس لئے کہ:

''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ''. (43:4)

''نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ جو کچھ تم کہتے ہو، تم اُسے جاننے لگو''۔

اس آیت سے بعض اوقات وضو کے باطل ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جو کچھ نماز سے مانع ہے، وہ حدث ہے، اس لئے کہ غصبی لباس اور جگہ اور ممنوع لباس اگرچہ نماز سے مانع ہیں لیکن حدث نہیں ہیں۔ مزید برآں آیہ شریفہ کے ذیل میں ''یہاں تک کہ جو کچھ تم کہتے ہو، تم اُسے جاننے لگو'' صرف نشہ کو نماز سے مانع قرار دیا گیا ہے کہ نشہ کے زائل ہونے سے یہ مانع بھی برطرف ہو جاتا ہے اور ہوش وحواس کے بحال ہونے کے بعد وضو وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر نشہ سے پہلے باوضو نہ ہو تو پھر اس کا حکم واضح ہے مگر بے ہوشی اور نیند ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔

احکامِ جبیرہ

مسئلہ: 88 دوا یا پٹی یا ہر وہ چیز جو زخم پر رکھی جائے، جبیرہ کہلاتی ہے۔ وضو کے دوران اگر ممکن ہو تو اسے اُوپر سے دھولیا جائے یا مسح کر لیا جائے۔ اگر دھونا نقصان دہ یا بہت مشکل ہو تو اس صورت میں گیلا ہاتھ پھیر لینا ہی کافی ہے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر مسح کر لے اور اس کے اطراف کو، جہاں تک ہو سکے، دھولے یا مسح کرے۔ بہتر ہے کہ اس کے اُوپر ایک پاک کپڑا رکھ کر اس پر مسح کر لیا جائے۔

جبیرہ کا حکم ان دو آیات سے سمجھا جا سکتا ہے:

"وَمَاجَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ط".

"اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی حرج مقرر نہیں کیا"۔(78:22)

"يُرِيۡدُاللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَايُرِيۡدُبِكُمُ الۡعُسۡرَ ز".

"اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تم پر سختی نہیں چاہتا"۔(185:2)

اس لئے اگر زخم یا کسی اور عارضہ کو دھونا موجبِ عسر و حرج ہو تو اس پر رکھی ہوئی پٹی کو دھونا یا اس پر مسح کرنے سے فرض ادا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ راوی نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ میں گر گیا اور میرا ناخن کٹ گیا اور میں نے اس پر مرہم رکھ دیا۔ اب وضو کا کیا کروں؟

آپؑ نے فرمایا: "یہ اور اس جیسی چیزوں کا حکم "مَاجَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ" سے سمجھا جا سکتا ہے، اسی پر مسح کرو۔ اس لئے کہ اس زخمی اُنگلی کا مسح ساقط تو ہے نہیں، لہٰذا مرہم پر یا ہر وہ چیز جو مسح اور زخم کے درمیان حائل ہو، اس پر مسح کرنا چاہیئے تا کہ فرض بھی ادا ہو جائے اور نقصان بھی نہ ہو۔

اگر اعضائے وضو میں سے کسی پورے عضو پر زخم پھیلا ہوا ہو تو یہاں بھی یہی حکم ہے۔ احتیاط یہ ہے کہ تیمّم بھی کر لیا جائے۔

غسل

مسئلہ:89 کتاب و سنت کی اصطلاح میں غسل سے مراد پورے بدن کا دھونا ہے اور یہ مندرجہ ذیل حالات میں واجب ہوتا ہے:

1۔ جنابت　　2۔ حیض　　3۔ نفاس

4۔ استحاضہ　　5۔ مس میّت　　6۔ غسل میّت

7۔ غسل جمعہ　　8۔ نذر، عہد یا قسم کی رُو سے واجب ہونے والا غسل۔

مسئلہ:90 جنابت، جنسی مباشرت یا منی کے شہوت کے ساتھ خارج ہونے سے حاصل

ہوتی ہے، چاہے مرد سے خارج ہو یا عورت سے، جس حال میں اور جس وقت میں ہو، یہ دونوں چاہے ایک ساتھ ہوں یا جدا جدا ہوں، موجب جنابت ہیں۔

مسئله: 91 اگر وضو یا غسل کے بعد خارج ہونے والی رطوبت کے بارے میں شک ہو کہ وہ رطوبت منی ہے یا پیشاب تو اس صورت میں غسل و وضو میں سے کچھ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ جناب کیلئے شہوت کے ساتھ منی کا اخراج موجبِ غسل ہے جو کہ یہاں نہیں ہے یا مشکوک ہے۔

مسئله: 92 کوئی شخص (معاذ اللہ) حیوان یا ہم جنس سے لواط یا مساحقہ کرے اور منی خارج نہ ہو تو کیا یہاں بھی جنابت حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟

ظاہراً ''**لامستم النسا**'' (تم عورتوں سے ملامست کرو) کی روشنی میں جنابت عورتوں سے مباشرت کے ساتھ مختص ہے لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہو تو کیا یہ عورتیں جو مباشرت میں مرد کے ساتھ شریک ہوتی ہیں، جنب نہیں ہوتی ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کی جنابت مرد کی جنابت کا لازمہ ہے اور '**لامستم**' کی بجائے جو مردوں اور عورتوں دونوں سے مخاطب ہے، ''**لامستم النسا**'' کے الفاظ استعمال کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ مباشرت میں فاعل مرد ہوتا ہے اور ایسی عبارت جو عورت کو بھی شامل کرے، کچھ مناسب نہیں ہے۔

اب اس سوال کا جواب کیا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی مباشرت کے علاوہ حیوان سے جنسی عمل انجام دینے یا لواط اور مساحقہ کا بھی کیا وہی حکم ہے جو ''**لامستم النسا**'' کا ہے؟

''**لامستم النسا**'' صرف عورتوں سے مباشرت کی وجہ سے غسل کو واجب کر رہی ہے، چاہے عورت سے مباشرت آگے کی طرف سے ہو یا پیچھے کی طرف سے، جو اگرچہ حرام ہے۔ یہ روایت کہ ''**اِذَاالْتَقَی الْخِتَانَانِ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ**'' یعنی جب مرد اور عورت کی ختنہ گاہیں مل جائیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے، یہ روایت آیت کے اطلاق کے برخلاف پیچھے سے کی گئی مباشرت پر غسل کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتی اور '**اِذَادَخَلَ فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ**'، جب وہ اسے داخل

کردے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

یہ روایت صرف مرد کی شرمگاہ کو عورت کی شرمگاہ میں داخل کرنے پر غسل کو واجب کر رہی ہے۔ پہلی حدیث حکم جنابت کو صرف آگے سے مباشرت کرنے کی صورت میں مختص نہیں کر رہی بلکہ اس کی ایک عام صورت کو بیان کر رہی ہے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرد کا مرد سے لواط کرنا (معاذ اللہ) یا عورت کا عورت سے مساحقہ کرنا، یا انسان کا حیوان سے جنسی مباشرت کرنا، اگر انزالِ منی کا موجب نہ ہو تو ظاہراً موجبِ جنابت نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں جنابت پر کوئی معتبر دلیل موجود نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ احتیاطِ مستحب کی بات کی جاسکتی ہے۔

غسل جنابت

مسئلہ:93 غسل جنابت کی دو اقسام ہیں: 1۔ارتماسی 2۔ترتیبی

غسل ارتماسی میں سارا بدن ایک ہی بار پانی میں چلا جاتا ہے یا اُوپر سے بہتے پانی کے نیچے اس طرح واقع ہوتا ہے کہ پانی سارے بدن پر حاوی ہو جائے۔

غسل ترتیبی میں بدن کو تھوڑا تھوڑا کر کے بتدریج دھویا جاتا ہے اور ابتداء ہی سے غسل کی نیت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ ابتداء سر اور گردن کے علاوہ کسی اور عضو سے نہ ہو کیونکہ اس صورت میں غسل باطل ہے، اس لئے کہ غسل ترتیبی میں سر اور گردن کو پہلے دھونا شرط ہے۔ اگر سر اور گردن کو پہلے دھولیا جائے تو بدن کے باقی ماندہ اعضاء کو دھونے میں کوئی ترتیب ضروری نہیں ہے یعنی اگر دائیں طرف کو بائیں طرف سے پہلے یا بائیں طرف کو دائیں طرف سے پہلے یا دونوں کو بغیر کسی ترتیب کے دھولیا جائے تو ان تینوں صورتوں میں غسل صحیح ہے۔ غسل ترتیبی میں صرف سر اور گردن کو دُوسرے اعضاء سے پہلے دھونا واجب ہے۔

بنابرایں اگر کسی کو علم ہو کہ اُس نے غسل کے دوران بدن کا ایک حصہ نہیں دھویا اور اُسے

معلوم نہ ہو کہ وہ حصہ سر میں ہے یا بدن کے دُوسرے حصے میں تو اس صورت میں دوبارہ غسل کرنا واجب ہے۔لیکن اگر علم ہو کہ اَن دُھلا حصہ سر کے علاوہ باقی بدن میں ہے تو صرف اُسی حصے کو دھو لینے سے غسل مکمل ہو جاتا ہے، دوبارہ نئے سرے سے غسل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئلہ: 94 ہر غسل میں سارے بدن کو دھونا واجب ہے اور صرف بالوں کے اُوپر سے دھونا کافی نہیں بلکہ ان کے نیچے سے بھی دھونا واجب ہے کیونکہ ''اغسلوا، اطھروا'' سے مراد پورے بدن کو دھونا ہے جو دراصل جلد کو دھو کر ہی انجام دیا جاسکتا ہے اور بال اس کے تابع ہونے کی حیثیت سے دھوئے جاتے ہیں اور اس میں چھوٹے اور لمبے بالوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مسئلہ: 95 غسل ترتیبی میں موالات (یعنی وقفے کے بغیر لگاتار تمام اعضاء کو دھونا) واجب نہیں ہے۔لہٰذا اگر بھولے سے یا جان بوجھ کر کسی حصے کو (سر اور گردن کے علاوہ) نہ دھوئے تو جب چاہے یا یاد آجائے تو اسے دھو لینا کافی ہے اور اگر وہ اَن دُھلا حصہ سر اور گردن سے تعلق رکھتا ہو تو اسے دھونے کے بعد بدن کے

باقی اعضاء کو دھونا بھی واجب ہے تا کہ ترتیب حاصل ہو سکے۔

مسئلہ: 96 اگر غسل کے دوران حدثِ اصغر، جو وضو کو باطل کر دیتا ہے، سرزد ہو تو غسل کو مکمل کر لے اور پھر نماز کیلئے وضو کرے، اس لئے کہ حدثِ اصغر صرف وضو کو باطل کرتا ہے، نہ کہ غسل کو۔ صرف مکمل غسل میں وضو کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اس صورت میں اصل غسل درست ہے لیکن وضو سے بے نیاز نہیں کرتا اور غسل مکمل ہونے کے بعد نماز کیلئے وضو کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 97 اگر ایک یا چند نمازوں کے بعد شک ہو کہ آیا غسلِ واجب کیا تھا یا نہیں تو اس صورت میں اگر اس بات کا احتمال ہو کہ نماز کے وقت وہ اپنی حالت کی طرف متوجہ تھا تو اس کی نمازیں صحیح ہیں اور آئندہ نمازوں یا طہارت سے مشروط اعمال کو انجام دینے کیلئے غسل کرنا واجب ہے ورنہ گزشتہ نمازوں کو بھی غسل کے بعد دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ: 98 اگر انسان پر چند غسل واجب ہوں تو سب کی نیت سے ایک غسل ان سب کیلئے کافی ہے۔لیکن بہتر ہے کہ غسل کے وقت مافی الذمہ کی نیت کر لی جائے تا کہ اس طرح جو غسل بھی اس پرواجب ہوں، انجام پا جائیں۔

مسئلہ: 99 جو کام بغیر وضو کے حرام ہیں، وہ سب حالتِ جنابت میں بھی حرام ہیں۔مزید برآں حالتِ جنابت میں تیمّم کے ساتھ بھی مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے،اس لئے کہ:

'وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا'. (43:4)

''اور نہ ہی جنابت کی حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہو،سوائے اس کے کہ تمہیں وہاں سے عبور کرنا ہو،حتیٰ کہ تم غسل کر لو''۔

یہاں ''حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا '' کا لفظ استعمال ہوا ہے، نہ کہ ''فاطھروا'' جو کہ نماز کے بارے میں تھا۔پس مسجد میں صرف غسل کر کے ہی داخل ہوا جا سکتا ہے۔

یہ حدیث کہ ''اَلتُّرَابُ اَحَدُالطَّھُوْرَیْنِ ''یعنی ''مٹی پاک کرنے والی دو چیزوں میں سے ایک ہے''،صرف اس حقیقت کے پیش نظر ہے کہ حالتِ اضطرار میں یعنی مجبوری کی حالت میں غسل یا وضو کے بدلہ میں تیمّم کر لیا جائے۔

مجبوری کی حالت میں نماز کیلئے تیمّم کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ نماز ضروری ہے لیکن چونکہ مسجد میں جانا واجب نہیں ہے، لہٰذا یہاں غسل کے بدلے میں تیمّم کافی نہیں،سوائے اس صورت کے کہ طوافِ واجب کو انجام دینے کا وقت اتنا تنگ ہو کہ اگر تیمّم کر کے مسجد الحرام میں نہ جائے تو طواف نہ کر سکے گا یا یہ کہ غسل کا انجام دینا صرف مسجد میں ممکن ہو تو اس صورت میں تیمّم کر کے مسجد میں جائے اور فوراً غسل کرے۔

مسئلہ: 100 جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ جنب کے لئے سوائے گزرنے کی غرض کے مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ میں فقط عبور کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، لہٰذا کسی بھی

صورت میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے، سوائے ضرورت کے۔

مسجد سے کوئی چیز اُٹھانا یا کوئی چیز وہاں رکھنا اس حکم میں برابر ہیں۔جن روایات میں ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے، ان میں اس پہلو کو مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ مسجد میں کوئی چیز رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن کسی چیز کو اُٹھانے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔لیکن اگر کبھی ضرورت اس کے برعکس ہو جائے کہ اُٹھانا غیر ضروری اور رکھنا ضروری ہو جائے تو اُٹھانا حرام اور رکھنا جائز ہو جائے گا۔اگر دونوں ضروری ہوں تو دونوں جائز اور کوئی بھی ضروری نہ ہو تو کوئی بھی جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ آیت نے جنب کے لئے صرف عبور کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ ہر صورت میں اس کا مسجد میں داخل ہونا حرام ہے، سوائے ضرورت کے۔

مسئلہ: 101 جنب کیلئے مسجد سے عبور کا جواز عام مساجد سے تعلق رکھتا ہے۔مسجد الحرام اور مسجدِ نبویؐ میں عبور بھی حرام ہے۔جن مساجد میں یہ جائز ہے، وہاں بھی اس صورت میں کہ مسجد کے ایک سے زیادہ دروازے ہوں جن کو عبور کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہو۔پس اگر عبور کے علاوہ کسی اور مقصد کے پیشِ نظر داخل ہو تو یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ''اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ'' نے صرف ایسے عبور کو جائز قرار دیا ہے جس میں مسجد کو راستے کے طور پر استعمال کیا جائے۔اگر اس کی منزلِ مقصود کو دو راستے جاتے ہوں تو اس صورت میں اس پر ''عَابِرِیْ سَبِیْلٍ'' کا صادق آنا مشکل نظر آتا ہے، اس لئے کہ دُوسرا متبادل راستہ، جو اُسے منزلِ مقصود تک لے جائے،

موجود ہے۔لہٰذا اس صورت میں اس کا مسجد سے عبور کرنا صرف عبور کرنے کی حیثیت نہیں رکھتا۔

ہاں! اگر مسجد کو مدِ نظر رکھے بغیر دو راستوں میں سے ایک راستے کے طور پر وہاں سے عبور کرے تو اس صورت میں ''عَابِرِیْ سَبِیْلٍ'' کے اطلاق میں داخل ہونے کا امکان موجود ہے۔

مسئلہ: 102 جن آیات میں سجدہ واجب ہے، صرف اُن کی تلاوت حالتِ جنابت میں حرام ہے، نہ کہ اُن سورتوں کی جن میں یہ آیات ہیں۔آیاتِ سجدہ صرف اُن چار سورتوں میں نہیں ہیں جو

معروف ہیں بلکہ وہ تمام آیات جن میں سجدہ کا حکم یا ترکِ سجدہ کی مذمت پائی جاتی ہے، ان سب میں سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ اس طرح چار معروف سورتوں کے علاوہ پانچ اور سورتیں بھی عزائم ہیں۔

(عزائم سے مراد وہ سورتیں ہیں جن میں سجدہ واجب ہے)۔

مسئلہ: 103 چونکہ غسلِ واجب سے وضو کی ضرورت نہیں، لہٰذا غسل اور وضو کو جمع کرنا حرام اور بدعت ہے۔

مسئلہ: 104 ظاہرِ قرآن وسنت یہ ہے کہ تمام اغسالِ واجب، جن کا وجوب اصلی ہے اور اغسالِ مستحب، وضو سے کفایت کرتے ہیں۔ سوائے اُن موارد کے جہاں نص غسل کے علاوہ وضو کے وجوب پر بھی دلالت کرتی ہے، جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا۔ اس کے باوجود اغسالِ مستحب میں احتیاطِ مستحب یہ ہے کہ وضو بھی کر لیا جائے۔

مسئلہ: 105 **''فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠''.** (187:2)

''اب ان (بیویوں) سے مباشرت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھا ہے، اُسے طلب کرو اور کھاؤ پیو جب تک کہ فجر کی سفیدی رات کی سیاہی سے تمہارے لئے نمودار ہو جائے''۔

اس آیہ شریفہ کی روشنی میں رمضان شریف کی راتوں میں مباشرت اور کھانا پینا طلوعِ فجر تک جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ سلام اللہ علیہم اجمعین سے منقول روایات میں بھی آیا ہے کہ بعض اوقات جنابِ رسولِ خداؐ ماہِ رمضان کی راتوں میں عمداً فجر تک جنابت پر رہتے تھے۔

اس آیہ شریفہ اور ان روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان شریف میں طلوعِ فجر تک حالتِ جنابت پر رہنا حرام نہیں ہے اور روزے کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ مزید تفصیل روزے کے

باب میں آئے گی۔

استحاضہ

مسئلہ: 106 خونِ استحاضہ، خونِ حیض ونفاس کے برخلاف رنگت میں زرد، سرد اور سوزش اور دباؤ کے بغیر ہوتا ہے۔ حیض ونفاس یا زخم کے خون کے علاوہ عورت کے مقامِ تناسل سے آنے والا خون استحاضہ ہے۔

مسئلہ: 107 استحاضہ کی تین اقسام ہیں: قلیلہ، متوسطہ اور کثیرہ۔

استحاضہ قلیلہ وہ ہے جس میں روئی کی صرف اُوپر والی سطح آلودہ ہو۔ یہ عام طور پر حیض و نفاس کے استمرار، بلوغ سے قبل، یائسگی کے بعد اور حمل کے دوران ہوتا ہے۔

متوسطہ میں خون روئی کے اندر تک چلا جاتا ہے اور کثیرہ میں روئی کی دُوسری طرف تک جا پہنچتا ہے۔

مسئلہ: 108 استحاضہ قلیلہ میں احتیاط یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے روئی کو دھونے یا بدلنے اور شرمگاہ کو دھونے کے علاوہ ایک وضو واجب ہے۔

مسئلہ: 109 استحاضہ متوسطہ میں ہر نماز کیلئے صرف ایک غسل کافی ہے اور اگر استحاضہ کم ہو جائے تو وہی ایک وضو کافی ہے۔ یہاں بھی روئی اور شرمگاہ کو خون سے پاک کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ: 110 استحاضہ کثیرہ میں ہر نماز کیلئے ایک وضو اور غسل ضروری ہے مگر یہ کہ دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے کہ اس صورت میں دونوں نمازیں ایک غسل اور ایک وضو سے پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر تین غسل اور تین وضو ضروری ہوں گے: ایک صبح کی نماز کیلئے، ایک ظہر وعصر اور ایک مغرب وعشاء کیلئے۔

اگر تینوں وقت استحاضہ قلیلہ ہو جائے تو ہر بار صرف ایک وضو کافی ہے۔ اگر سارا دن استحاضہ متوسطہ ہو تو ہر بار صرف ایک غسل کافی ہے۔ اگر کثیرہ ہو تو غسل اور وضو دونوں لازم ہیں۔ اگر

ان تین اوقات میں کبھی قلیلہ، کبھی متوسطہ اور کبھی کثیرہ ہو تو اس کے مطابق وضو، غسل یا غسل اور وضو دونوں کو انجام دینا ہوگا۔

ضروری ہے کہ یہ وضو اور غسل نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد نماز ادا کرنے کے وقت انجام پائیں ورنہ صحیح نہیں ہیں۔

مسئلہ: 111 خون بند ہو جانے کے بعد احکامِ استحاضہ صرف پہلی نماز کیلئے ہیں۔

مسئلہ: 112 اگر عورت کو علم نہ ہو کہ اس کا استحاضہ کس قسم کا ہے تو ضروری ہے کہ نماز کے وقت آزمائش کر کے معلوم کرے کہ اس کا استحاضہ کس قسم کا ہے تا کہ نماز سے قبل اپنے موجودہ استحاضہ کے پیش نظر اپنے فرض کو انجام دے سکے۔

مسئلہ: 113 حیض و نفاس و استحاضہ کے حکم صرف اُس صورت میں جاری ہوتے ہیں جب یہ خون باہر نکلیں کیونکہ جب تک یہ خون جسم کے اندر ہیں، کوئی خون کسی قسم کا حکم نہیں رکھتا۔

مسئلہ: 114 جب تک دوبارہ خون نہ آئے، استحاضہ والی عورت کا وضو باقی رہتا ہے اور اس سے دُوسری نمازیں پڑھ سکتی ہے، اگر کسی اور وجہ سے اس کا وضو باطل نہ ہوا ہو۔

مسئلہ: 115 اگر احتمال ہو کہ آخر وقت میں استحاضہ سے پاک ہو جائے گی تو واجب ہے کہ نماز میں اُس وقت تک تاخیر کرے تا کہ نماز کو بغیر استحاضہ کے پڑھ سکے۔

مسئلہ: 116 خونِ استحاضہ سے بقدرِ امکان طہارت یا وضو یا جہاں غسل ضروری ہے، وہاں غسل کے بغیر مستحاضہ کی نماز باطل ہے لیکن روزہ صحیح ہے، اس لئے کہ روزہ کے بطلان پر ایک غیر معتبر حدیث کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ صحتِ روزہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب غسل جنابت روزہ کی صحت کیلئے واجب نہیں ہے تو استحاضہ کے وضو اور غسل تو دُور کی بات ہیں۔

مسئلہ: 117 مستحاضہ کے ساتھ جماع کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح وضو اور غسل کے بغیر مسجد میں جانا یا آیاتِ سجدہ کی تلاوت کرنے کی حرمت پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ حرمت

پر دلیل کا نہ ہونا ہی جواز کی دلیل ہے۔

حیض

مسئلہ: 118 خونِ حیض وہ خون ہے جو عام طور پر ہر ماہ خواتین کے مقامِ تناسل سے باہر آتا ہے اور اکثر اوقات گاڑھا، گرم، سیاہی مائل، سرخ، دباؤ اور کسی قدر سوزش کے ساتھ ہوتا ہے اور بالغ ہونے سے لے کر یائسگی سے پہلے تک آتا ہے۔

مسئلہ: 119 جس لڑکی کے بالغ ہونے میں شک ہو یا وہ عورت جو نہ جانتی ہو کہ یائسہ ہے یا نہیں، اگر ایسا خون دیکھے جس میں حیض کی علامات پائی جاتی ہوں تو اس پر حیض کے احکام جاری ہوں گے اور یہی لڑکی کے بالغ اور عورت کے یائسہ نہ ہونے کی علامت بھی ہے۔ یائسہ ہونے میں سیّدہ اور غیر سیّدہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مسئلہ: 120 حیض کی مدت کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ حیض کے دنوں کا متصل ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ پس اگر حیض کے مقررہ وقت پر خون آئے تو اگر چہ لگاتار نہ ہو، اس پر حیض کا حکم جاری ہوگا۔ احتیاط یہ ہے کہ حیض اور مستحاضہ دونوں کے احکام پر عمل کیا جائے، مثلاً ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور بعد میں قضا بھی بجالائے۔ اگر چہ ظاہراً قضا واجب نہیں ہے کیونکہ اس کا حیض یقینی نہیں ہے۔

مسئلہ: 121 حیض کی کم از کم مدت جو تین دن یا اس سے زیادہ ہو سکتی ہے، ان کا دس دن کے اندر اندر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ حیض نہیں ہے بلکہ استحاضہ یا کوئی اور خون ہے۔

مسئلہ: 122 دس دن کی مدت میں جن دنوں میں خون نہیں آتا، ان میں احتیاطاً حیض اور استحاضہ کے احکام پر عمل کرے کہ نماز پڑھے اور روزہ بھی رکھے اور بعد میں قضا بجالائے۔ اگر چہ ظاہراً روزہ کی قضا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ حیض ثابت نہیں ہے۔

مسئلہ: 123 جو کچھ جنابت کی حالت میں حرام ہے، حیض کی حالت میں بھی حرام ہے۔ اس

کے علاوہ حیض والی عورت سے جماع بھی حرام ہے، چاہے آگے سے ہو یا پیچھے سے، اگر چہ پیچھے سے جماع عام حالت میں بھی حرام ہے۔ احتیاط واجب یہ ہے کہ ناف اور زانو کے درمیان ہر قسم کا شہوانی عمل حرام ہے، اس لئے کہ:

''وَلَا تَقْرَبُوْاهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ''. (222:2)

''جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان کے قریب نہ جاؤ''۔

اس آیت کی رُو سے حیض کے ایام میں عورت سے ہر قسم کے جنسی عمل کی ممانعت پائی جاتی ہے۔ ظاہراً ناف سے زانو تک بھی اس میں داخل ہیں اور اس سے زیادہ سے اجتناب کرنا اضافی احتیاط ہے، واجب نہیں۔

مسئلہ: 124 حیض والی عورت سے حیض کی پہلی تہائی میں جماع کرنے پر ایک دینار، دُوسری تہائی میں آدھا دینار اور تیسری تہائی میں دینار کا چوتھا حصہ کفارہ کے واجب ہونے کے متعلق احادیث متعارض ہیں، لہٰذا یہ کفارہ واجب نہیں ہے بلکہ احتیاط مستحب ہے۔

مسئلہ: 125 حیض کی حالت میں عورت کو طلاق دینا حرام اور طلاق باطل ہے۔ اگر شوہر کو عورت کی حالت کا علم نہ ہو اور اس کی حالت سے آگاہی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ اور امکان بھی نہ ہو تو اس صورت میں اگر حیض کی حالت میں طلاق دی جائے تو وہ درست ہے۔

مسئلہ: 126 اگر عورت کو علم ہو کہ نماز کا کچھ وقت گزرنے کے بعد اُسے حیض آجائے گا تو اس مدت میں اُس پر واجب ہے کہ حیض سے پہلے نماز ادا کرے۔ اگر دانستہ یا نادانستہ طور پر نماز نہ پڑھے تو حیض سے پاک ہونے کے بعد اُس کی قضا بجالانا اُس پر واجب ہے۔

مسئلہ: 127 غسلِ حیض، غسلِ استحاضہ کثیرہ کے علاوہ دُوسرے اغسال کی مانند وضو سے کفایت کرتا ہے یعنی صرف غسل کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

نفاس

مسئلہ: 128 بچے کی پیدائش کے وقت جو خون عورت کے مقامِ تناسل سے آتا ہے، اُسے نفاس کہتے ہیں۔ بچے کی پیدائش سے صرف زندہ بچے کا باہر آنا مراد نہیں ہے بلکہ مردہ بچہ یا ناقص الخلقت بچہ، جو اگر عورت کے شکم میں رہتا تو کامل بچہ بن جاتا، بھی یہی حکم رکھتے ہیں۔

دُوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس پر ''جنم دینا'' صادق آتا ہو۔ اگر صادق نہ آتا ہو، جیسا کہ علقہ (جمے ہوئے خون کا لوتھڑا) باہر آئے یا اس کے صادق آنے میں شک ہو تو اس صورت میں آنے والا خون نفاس نہیں ہے۔ بہر حال صرف وہی خون نفاس ہے جو بچے کی پیدائش کے وقت باہر آئے، صرف بچے کی ولادت موجبِ نفاس نہیں ہے۔

پس اگر بچے کی پیدائش کے ساتھ خون نہ آئے تو نفاس نہیں ہے۔ صرف وہ خون نفاس ہے جو ولادت کے وقت یا اُس کے بعد آئے اور اس کا ولادت سے تعلق ہو۔

مسئلہ: 129 خونِ نفاس کی کم از کم مدت ایک لحظہ اور زیادہ سے زیادہ مدت حیض کی مانند دس روز ہے۔

مسئلہ: 130 جو چیزیں حالتِ حیض میں حرام ہیں، حالتِ نفاس میں بھی حرام ہیں جن میں طلاق اور مباشرت بھی داخل ہیں۔

مسئلہ: 131 اگر خونِ نفاس دس دن سے زیادہ آئے تو اگر عورت کے حیض کے ایام کی تعداد معین ہو تو اُتنے ہی دن نفاس ہے، اس سے زائد دنوں میں آنے والا خون استحاضہ ہے۔ اگر حیض کے ایام کی تعداد معین نہیں ہے تو دس دن تک آنے والا خون نفاس اور اس سے زائد استحاضہ ہے۔

غسلِ مسِ میّت

مسئلہ: 132 مردہ انسان، نہ کہ مردہ حیوان کے جسم کو اگر غسل سے پہلے، جس حال اور جس صورت میں مس کیا جائے تو غسلِ مسِ میّت واجب ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 133 اگر میّت سرد نہ ہوئی ہو یا یہ کہ جس حصے کو مس کیا ہے، وہ ابھی گرم ہو تو غسل واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 134 اگر کسی کے جسم کے بال میّت کے بدن سے لگیں یا میّت کے بال اس کے جسم سے لگیں تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ البتہ اگر ایسا ہو کہ اس پر مس میّت صادق آتا ہو تو غسل واجب ہے۔ چونکہ میّت کے بال میّت کے احکام نہیں رکھتے، لہٰذا میّت کے بال سے بدن کو ملنا، چاہے بال چھوٹے ہوں یا لمبے، موجبِ غسل نہیں ہے۔

مسئلہ: 135 اگر زندہ یا مردہ انسان کا کوئی عضو الگ ہو جائے، چاہے ہڈی یا گوشت یا ہڈی اور گوشت پر مشتمل ہو تو اس پر میّت کے احکام جاری ہوتے ہیں، البتہ انہی مذکورہ شرائط کے ساتھ۔ انسان کے مردہ عضو کا ہڈی پر مشتمل ہونا شرط نہیں ہے اور یہاں احتیاط بہتر ہے۔

مسئلہ: 136 میّت کو تینوں غسل دینے کے بعد مس کرنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔

مسئلہ: 137 تمام اغسالِ اصلی کی طرح غسل مس میّت کے بعد بھی وضو کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئلہ: 138 غسل مس میّت سے قبل کسی بھی مسجد میں داخل ہونا حرام ہے۔ اسی طرح 'لَا یَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ' کی رُو سے قرآن مجید کے خط اور اللہ کے اسمائے مقدسہ کو مس کرنا حرام ہے، اس لئے کہ جس پر غسل واجب ہو، وہ "مطھرون" میں سے نہیں۔

مسئلہ: 139 غسل مس میّت صرف اُس صورت میں واجب ہوتا ہے جب مسِ میّت یقینی ہو۔ لہٰذا شک کی صورت میں واجب نہیں ہے۔ اگر شک ہو کہ میّت کو غسل دے کر دفن کیا گیا ہے یا بے غسل تو اگر مسلمانوں کے شہر میں یا مسلمانوں کے ہاتھوں یا مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہو تو ان اسلامی حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غسل دیا گیا ہے۔ اگر یقین ہو کہ غسل نہیں دیا گیا تو اگر ممکن ہو تو غسلِ میّت اور غسلِ مسِ میّت دونوں واجب ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ لاش بوسیدہ ہو چکی ہو، اس صورت

میں غسل کی بجائے تیمّم واجب ہے اور اگر کوئی عذر نہ ہو تو غسلِ مسِ میّت بھی واجب ہے ورنہ عذر کی برطرفی تک تیمّم کافی ہے۔

غسلِ میّت

مسئلہ: 140 مسلمان کی میّت کو، اگر معرکہ جہاد میں شہید نہ ہوا ہو، غسل دینا تمام مسلمانوں پر واجبِ کفائی ہے اور درصورتِ امکان پہلے خالص پانی سے، پھر آبِ سدر سے اور پھر آبِ کافور سے غسل دینا چاہیئے۔ سدر اور کافور کی مقدار اتنی زیادہ نہیں ہونی چاہیئے کہ پانی مضاف ہو جائے۔

مسئلہ: 141 اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں مرجائے تو اُسے آبِ کافور سے غسل نہیں دینا چاہیئے بلکہ صرف آبِ خالص اور پھر آبِ سدر سے اُسے غسل دینا چاہیئے۔

مسئلہ: 142 چار ماہ سے زیادہ کے جنین کی میّت کو غسل دینا واجب ہے اور احتیاط واجب یہ ہے کہ اگر چار ماہ سے کم کا مردہ بچہ، جس کا بدن مکمل ہو چکا ہو، یا چار ماہ سے زیادہ کا مردہ بچہ جس کا بدن مکمل نہ ہوا ہو، اُسے بھی غسل دیا جائے۔ ایسے بچے کو جنم دینے والی عورت پر غسلِ مسِ میّت واجب ہے۔

مسئلہ: 143 واجب ہے کہ میّت کو غسل دینے والا مسلمان اور میّت کا ہم جنس ہو، سوائے بیوی اور شوہر کے، اگرچہ بیوی عدۂ رجعیہ میں ہو۔ لیکن تین سال تک کے بچے کو غسل دینے والے کیلئے اس کا ہم جنس ہونا ضروری نہیں ہے۔

مسئلہ: 144 اگر میّت کو غسل دینے کیلئے ہم جنس نہ ملے تو جو اُس کے محرم ہیں، اُن میں سے کوئی اُس کو غسل دے سکتا ہے، بشرطیکہ اُس کی شرمگاہ پوشیدہ ہو۔

مسئلہ: 145 غسل میّت کی اُجرت لینا حرام ہے۔ اگر غسال اُجرت لے کر غسل دے تو اگر قصدِ قربت کرے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کی نیت سے غسل دے، نہ کہ اس اُجرت کی خاطر جو اُس نے لی ہے تو غسل صحیح ہے لیکن جو اُجرت اُس نے لی ہے، وہ حرام ہے۔

مسئلہ: 146 جب غسل کیلئے پانی نہ ملے تو اس کے بدلے میّت کو تیمّم دینا چاہئے۔ اگر کسی بھی غسل کیلئے پانی نہ ہو تو تینوں غسلوں کے بدلے میں تیمّم دینا واجب ہے۔ اگر دُوسرے اور تیسرے غسل کیلئے سدر اور کافور میسر نہ ہوں تو ظاہراً صرف آبِ خالص سے پہلا غسل اور دو تیمّم واجب ہیں۔

مسئلہ: 147 اگر مشقت یا دُشوار نہ ہو تو میّت کو تیمّم دینے کیلئے اُس کے اپنے ہاتھ استعمال کئے جائیں۔

مسئلہ: 148 مسلمان کی میّت کو غسل دینے کے بعد اُسے تین پاک اور مباح کپڑوں میں کفن دینا واجب ہے۔ جو شرائط نماز گزار کے لباس میں ضروری ہیں، وہ سب کفن میں بھی ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ عورت کو بھی ریشم میں کفن دینا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: 149 غسل اور کفن کے بعد میّت کو مباح جگہ میں اس طرح دفن کرنا چاہئے کہ اس کا بدن چھپ جائے اور درندوں کی دستبرد سے بھی محفوظ رہے اور اس کی بدبو بھی نہ پھیلے، اس لئے کہ مردہ مسلمان کا احترام بھی زندہ مسلمان کے احترام کی مانند ہے۔

مسئلہ: 150 میّت کو قبر میں دائیں کروٹ پر قبلہ رُو لٹانا واجب ہے۔

مسئلہ: 151 شہید، جو معرکہ جنگ میں جان دیتا ہے، اُسے غسل اور کفن دینا واجب نہیں ہے۔ اس کو اسی جنگی لباس میں دفن کرنا چاہئے، اس لئے کہ ایک تو اُسے غسل وکفن دینا دُشوار ہے اور دُوسرے یہ کہ شہید زندہ ہے اور زندہ کو غسل وکفن کی ضرورت نہیں۔

غسل جمعہ

مسئلہ: 152 ظاہراً غسل جمعہ واجب ہے، خصوصاً اُن لوگوں پر جو نمازِ جمعہ میں شرکت کرتے ہیں یا شرکت کرنا اُن پر واجب ہے۔ دُوسرے واجب اور مستحب اغسال کی مانند اس میں بھی وضو کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ حدیث 'اَیُّ وَضُوْءٍ اَنْقٰی مِنَ الْغُسْلِ' یعنی "کون سا وضو غسل سے زیادہ

پاکیزگی کا موجب ہے''، ہر واجب اور مستحب غسل کو شامل ہے۔اس کے واجب نہ ہونے کی شہرت اُن کثیر اور صحیح روایات کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو اسے واجب قرار دیتی ہیں۔



تیمّم

مسئلہ: 153 تیمّم، وضو اور غسل کا بدلِ اضطراری ہے۔اس کے لغوی معنی ''اہتمام کے ساتھ قصد کرنا'' ہیں اور اس مقام پر:

''فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ''. (6:5)

''پس اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمّم کرو پاکیزہ صعید (بلند جگہ) پر''

کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں ضرورت کے وقت وضو کی جگہ کسی بلند اور پاکیزہ زمین سے چہرے اور ہاتھوں کے کچھ حصہ پر مسح کرنا واجب ہے۔

اس آیہ شریفہ کی روشنی میں ضروری ہے کہ مکلّف حتی الامکان پانی کی تلاش کرے اور اس امکان میں شرعی، عقلی اور عرفی امکان سب داخل ہیں۔ بنابرایں اگر پانی موجود ہو لیکن اس کا استعمال شرعی لحاظ سے ممکن نہ ہو، مثلاً مباح نہ ہو یا نقصان دہ ہو یا اسے استعمال کرنے کی صورت میں کسی انسان یا حیوان کی جان پیاس کی شدت کی وجہ سے خطرے میں ہو یا حرج ہو یا فرصت اس قدر کم ہو کہ غسل یا وضو کرنے کی صورت میں نماز قضا ہوتی ہو تو ان تمام حالات میں ''فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً'' (پس تم پانی نہ پاؤ) حاکم ہے۔

بالآخر آیہ شریفہ کے درست اور عمومی معنی یہ ہوں گے کہ اگر تم وضو یا غسل کرنے سے معذور

ہوتو پھر تیمّم واجب ہے۔لیکن اگر ابھی پانی دسترس میں نہ ہولیکن آخر وقت سے اتنی دیر پہلے تک کہ جس میں نماز پڑھی جاسکے، بغیر عسروحرج کے پانی مل جانے کا امکان ہو تو اس صورت میں ''فاقدماء''یعنی'' پانی سے محروم''نہیں ہے۔

مسئلہ: 154 عسروحرج کے بغیر جس طرح بھی ممکن ہو، طہارت کیلئے پانی حاصل کرنے کی کوشش کرنا واجب ہے، چاہے پانی ایک تیر کی پہنچ تک ہو یا دس تیروں یا سو تیروں کی پہنچ تک ہو، اس لئے کہ عسروحرج اور مشقت کے بغیر پانی کے حصول کی کوشش واجب ہے۔اس میں فاصلے اور مسافت کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔اگر صرف یہ عاقلانہ احتمال ہی موجود ہو کہ آخر وقت تک پانی مل جائے گا تو یہی اس وقت تک صبر کرنے اور پانی کی جستجو کرنے کیلئے کافی ہے۔ضروری نہیں کہ پانی کی جستجو مکلّف خود ہی کرے بلکہ اس کیلئے ہر شرعی طریقہ جس کا استعمال ممکن ہو، اختیار کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 155 اگر ابھی پانی کا استعمال نقصان دہ ہولیکن آخر وقت سے اتنی دیر پہلے تک جس میں نماز ادا کی جاسکتی ہو، اس حالت کو علاج یا کسی اور طریقہ سے برطرف کرسکتا ہوتو واجب ہے کہ اس عذر کو برطرف کرنے کی کوشش کرے، اس لئے کہ ایک تو علاج بذاتِ خود بھی واجب ہے اور نماز کے مقدمہ کے طور پر بھی واجب ہے۔

مسئلہ: 156 چونکہ ''**فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا**''، ''پس پاکیزہ بلندی پر تیمّم کرو''۔''**فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً** ''(پس تمہیں پانی نہ ملے) کے بعد تیمّم کو واجب کرتی ہے، لہٰذا اگر پانی کی تلاش کی کوشش کے بغیر تیمّم کرے، چاہے تلاش کرنے کی صورت میں پانی ملے یا نہ ملے، دونوں صورتوں میں تیمّم باطل ہے، اس لئے کہ تیمّم صرف اس صورت میں کیا جائے گا جب ''فَلَمْ تَجِدُوا'' واقع ہو چکا ہو۔

مسئلہ: 157 اگر پوری کوشش کے باوجود پانی ملنے سے مایوس ہو کر تیمّم کر کے نماز پڑھ لے اور نماز کا وقت گزرنے کے بعد معلوم ہو کہ پانی کے ملنے اور اس کے استعمال کا امکان موجود تھا تو اس صورت میں اگر چہ اس لحاظ سے اس کا تیمّم صحیح ہے کہ اس نے پوری کوشش کی تھی لیکن اس کے باوجود

اس احتیاط کی گنجائش موجود ہے کہ وضو یا غسل کر کے دوبارہ نماز پڑھ لے۔لیکن اگر ابھی نماز کا وقت باقی ہوتو اس صورت میں چونکہ 'فَلَمْ تَجِدُوْا' واقع نہیں ہوا ہے، لہٰذا واجب ہے کہ وضو یا غسل کر کے دوبارہ نماز ادا کرے۔

مسئلہ: 158 اگر کوئی شخص نماز کے وقت سے قبل یا نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد باوضو یا باغسل ہے اور اُسے یقین ہے یا اس بات کا احتمال ہے کہ اگر اُس کا وضو یا غسل باطل ہو جائے تو آخر وقت تک وضو یا غسل کیلئے اُسے پانی نہیں ملے گا تو اس وضو یا غسل کو باقی رکھنا واجب ہے تاکہ نماز کو اس کے ساتھ پڑھے، مگر یہ کہ وضو یا غسل کو باقی رکھنا اس قدر مشکل ہو جو عام طور پر قابل برداشت نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ عسر و حرج ہے۔

مسئلہ: 159 اگر کسی کے پاس صرف اتنا پانی ہو جس سے کسی مضطرب پیاسے حیوان یا انسان کو اضطراب سے نجات دے سکتا ہے یا وضو یا غسل کرسکتا ہے تو یہ بھی تیمّم کا مقام ہے، اس لئے کہ مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ کسی جاندار کو پیاس سے جاں بلب دیکھے اور اُسے پانی نہ دے۔ پس یہاں بھی ''فَلَمْ تَجِدُوْا'' واقع ہے۔

مسئلہ: 160 اگر کسی کے پاس صرف اتنا پانی ہو جس سے لباس یا بدن سے نجاست کو برطرف کیا جاسکتا ہو یا وضو یا غسل کیا جاسکتا ہو تو اس صورت میں بھی تیمّم کرنا واجب ہے کیونکہ تیمّم ، وضو اور غسل کا بدل ہے جبکہ بدن یا لباس سے نجاست کو برطرف کرنا صرف پانی سے ممکن ہے، اس کا متبادل موجود نہیں ہے۔ پس جس کا بدل موجود ہو، اُس کو اس پر مقدم نہیں کیا جاسکتا جو بے بدل ہو۔ یہ قاعدہ قرآن اور احادیث کی رُو سے ثابت ہے۔

مسئلہ: 161 اگر پانی دستیاب ہو لیکن اُسے حاصل کرنے کیلئے مہنگی قیمت ادا کرنا پڑتی ہو تو اس صورت میں اگر قیمت ادا کرنا اس کیلئے سنگین نہ ہو اور پانی کا مالک بھی ناجائز منافع خوری کیلئے نہیں بلکہ پانی کی کمی اور مشکل سے فراہمی اور طلب کی کثرت کے پیش نظر اس کی مناسب قیمت لے رہا ہو،

جیسا کہ سرزمین حجاز میں ہوتا ہے، تو پانی خرید کر وضو یا غسل کرنا واجب ہے۔

لیکن اگر قیمت ادا نہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں پانی خریدنا واجب نہیں ہے یا پانی کا مالک ناجائز منافع خوری کیلئے اس کی زیادہ قیمت طلب کر رہا ہو تو اس صورت میں پانی خریدنا نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے بلکہ اسراف اور مفت خوری کی حوصلہ افزائی ہونے کی وجہ سے دُہرا حرام ہے اور نماز کیلئے تیمّم کرنا ہوگا۔

مسئلہ: 162 اگر کسی کے پاس پانی موجود ہو اور وہ صرف احسان کے ساتھ پانی دینے پر تیار ہو تو اس صورت میں بھی تیمّم واجب ہے، اس لئے کہ خدا مؤمن کی ذِلت پر راضی نہیں ہے۔

مسئلہ: 163 جب بھی پانی کے استعمال کے نقصان دہ ہونے کا یقین یا احتمال موجود ہو تو پانی کے استعمال کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔ اس حالت میں تیمّم کرنا ہوگا مگر یہ کہ آخر وقت سے قبل اس ضرر کے برطرف ہونے کا یقین یا احتمال ہو۔

مسئلہ: 164 اگر نماز کے دوران عذر برطرف ہو جائے تو اگر اتنا وقت باقی ہو کہ وضو کر کے نماز پڑھی جا سکے تو نماز باطل ہے اور وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ لیکن اگر وقت باقی نہ ہو تو نماز درست ہے اور آئندہ نمازوں کیلئے وضو یا غسل انجام دینا واجب ہے، اس لئے کہ تیمّم اُس وقت تک رہتا ہے جب تک ''فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً'' واقع ہو اور اب جبکہ پانی مل چکا ہے تو ''فَتَيَمَّمُوا'' کی گنجائش بھی نہیں رہی۔

مسئلہ: 165 اگر ایسا عذرِ شرعی رکھتا ہو جس کی وجہ سے پانی کا استعمال حرام ہو یا کم از کم واجب نہ ہو اور اس کے باوجود وضو یا غسل کرے تو پہلی صورت میں اس کا وضو اور غسل قطعاً حرام ہے، دُوسری صورت میں حرام نہیں بلکہ مستحبِ موکد ہے، اس لئے کہ یہ آیہ شریفہ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ (جو کوئی زحمت کے ساتھ اچھا عمل انجام دے، وہ اس کیلئے بہتر ہے) کے زمرے میں آجاتا ہے۔

مسئلہ: 166 اگر کسی کے پاس برف یا بھاپ موجود ہو اور وہ اُسے پانی میں تبدیل کر سکتا ہو تو

اس کا فرض یہی ہے کہ اُسے پانی میں تبدیل کرے یا برف ہی سے نہا لے۔اس کیلئے برف کو بدن پر مل لینا کافی ہے، اگر چہ بعض اوقات وضو کیلئے کافی نہ ہو۔

مسئلہ: 167 عسر وحرج جو تمام تکالیف میں بنیادی مانع ہیں، ان کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی کام کے انجام میں تمام توانائی کو اس طرح صرف کر دینا پڑے کہ سانس تک لینا ممکن نہ ہو تو اسے حرج کہتے ہیں اور اگر بہت زیادہ مشقت کرنا پڑے جو عام طور پر قابلِ برداشت نہیں ہوتی تو یہ عسر ہے۔ اسلامی فرائض کا معیار انسان کی توانائی ہے کہ تمام توانائی صرف نہ کرنی پڑے بلکہ کچھ توانائی صرف کرنے سے فرض ادا ہو جائے اور سختی اور تنگی سے بھی دوچار نہ ہو۔

بنابرایں اگر بہت سرد یا بہت گرم پانی سے یا بہت سرد موسم میں وضو یا غسل بہت زیادہ مشقت کا سبب ہو تو ان حالات میں انسان کا فرض تیمّم ہے۔ اگر چہ وضو اور غسل بھی جائز ہیں، اس لئے کہ وہ ممنوع نہیں ہیں بلکہ بہت زیادہ مشقت کے پیش نظر صرف ان کا وجوب اُٹھایا گیا ہے۔

مسئلہ: 168 وہ تیمّم جو مستحب غسل کے بدلے میں کیا گیا ہو، وضو کیلئے کافی نہیں ہوگا۔صرف واجب غسل کے بدل میں انجام دیا جانے والا تیمّم بھی ان چیزوں کیلئے بدلِ اضطراری کی حیثیت رکھتا ہے جن میں طہارت شرط ہو، سوائے غسل جمعہ کے۔ پس اگر چہ غسل جمعہ خود واجب ہے لیکن اس کے بدلہ میں کیا گیا تیمّم وضو کیلئے کافی نہیں ہوگا۔لہٰذا وضو کرنا واجب ہے۔

غسل جمعہ کے بدلہ میں تیمّم کا درست ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ صرف غسل جنابت، حیض ونفاس واستحاضہ اور غسل مس میّت کے بدل میں کئے گئے تیمّم اُن کاموں کیلئے کافی ہیں جن میں طہارت ضروری ہے۔لیکن غسل جمعہ اور دُوسرے مستحب غسل، جن کے بغیر نماز صحیح ہے، ان کے بدلے میں تیمّم کرنا اگر صحیح بھی ہو تو وضو کیلئے کفایت نہیں کرتا، اس لئے کہ تیمّم کی باری صرف وہاں آتی ہے جہاں پانی کی دسترس نہ ہو۔ یہاں چونکہ وضو کیلئے پانی موجود ہے اور غسل بھی نماز کیلئے واجب نہیں ہے، لہٰذا قطعاً غسل یا غسل مستحب کے بدل میں کیا گیا تیمّم وضو کیلئے کفایت نہیں کرتا۔

مسئلہ:169 ''فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا'' کی رُو سے تیمّم صرف اُس صورت میں واجب اور وضو یا غسل کا بدل ثابت ہوسکتا ہے جب اس چیز پر کیا گیا ہو جس پر ''صعید'' صادق آتا ہو جو کہ زمین کے اُن تمام اجزاء کو شامل ہے جنہیں زمین کہا جاسکتا ہے۔

صعید ہونے کے علاوہ اس کا طیب ہونا بھی ضروری ہے۔ پس اگر خاک یا اس کی مانند، جس کو صعید کہا جاسکتا ہو، پاک ہو لیکن گندی اور بدبودار اور طبعِ انسانی اس سے نفرت کرتی ہو تو اس صورت میں تیمّم واجب نہیں۔ اگر اس سے تیمّم کر بھی لیا جائے تو وہ وضو کا قائم مقام نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ جس طرح تیمّم کیلئے صعید پر ہونا ضروری ہے، اسی طرح صعید کا طیب ہونا بھی ضروری ہے۔ پس جس طرح غیر صعید پر تیمّم باطل ہے، اسی طرح غیر طیب صعید پر بھی باطل ہے۔

کن چیزوں پر تیمّم ہوسکتا ہے؟

مسئلہ:170 ''صَعِيدًا طَيِّبًا'' جس پر تیمّم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لغوی لحاظ سے پاک اور صاف بلندیاں ہیں۔ ان میں صرف پاک ہونا ہی کافی نہیں بلکہ صاف ہونا بھی ضروری ہے۔ چونکہ آیت میں ''صَعِيدًا'' کا ذکر غائط کے بعد آیا ہے جس کے معنی لغت کے اعتبار سے زمین کے پست حصے ہیں، جو عام طور پر پاک اور صاف نہیں ہوتے کیونکہ انہیں پیشاب پاخانہ وغیرہ کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے ''صَعِيدًا طَيِّبًا'' سے مراد پاکیزہ زمین ہے۔

''صَعِيدًا'' کو ''طَيِّبًا'' سے اس لئے متصف کیا گیا ہے کہ ان بلندیوں سے پرہیز کیا جائے جو بعض اوقات طیب نہیں ہوتی ہیں۔

بہرصورت تیمّم میں جو بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے پاک اور صاف زمین پر انجام دیا جائے جس کیلئے بلند ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ بلندی میں اس کے علاوہ اور کوئی خاصیت نہیں پائی جاتی کہ وہ عام طور پر پاک ہوتی ہے۔

جو کچھ اس آیہ شریفہ سے سمجھا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی حدیث

میں بھی پایا جاتا ہے:

"جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًاوَّ طَھُوْرًا".

"زمین کو میرے لئے سجدہ گاہ اور طہور قرار دیا گیا ہے"۔

زمین دو لحاظ سے طہور ہے، ایک تیمّم کیلئے اور دُوسرے جوتے کے تلوے وغیرے کو نجاست سے پاک کرنے کیلئے۔

مسئلہ: 171 چونکہ طیب پاک ہونے کے علاوہ صاف ہونے کے معنی بھی دیتا ہے، پس صعید میں زمین کے پاک ہونے کے علاوہ صاف ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر زمین پاک ہو لیکن صاف نہ ہو بلکہ گندی اور متعفن ہو تو اس سے تیمّم نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں انسان **فاقد الطھورین** ہے یعنی اس کے پاس دو طہور، پانی اور زمین میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ ایسے شخص کا فرض یہ ہے کہ وضو اور تیمّم کے بغیر ہی نماز ادا کرے، اس لئے کہ صفائی کو جزوِ ایمان قرار دینے والی شریعت انسان کو ایسی زمین پر تیمّم کرنے کا حکم نہیں دیتی جو پاک یا صاف نہ ہو اور اس نماز کی قضا بھی نہیں ہے۔

مسئلہ: 172 چونکہ اس آیہ شریفہ میں خطاب مؤمنین سے ہے، لہٰذا "**طیبًا**" سے مراد ایسی چیز ہے جس سے مؤمن نہ صرف یہ کہ نفرت نہیں کرتا بلکہ اس کی طرف مائل بھی ہے۔ بنا بر ایں پاک اور صاف ہونے کے علاوہ اس کا مباح ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر انسان زندان میں یا کسی اور جگہ ہو جو غصبی ہو اور مجبور ہو کہ وہاں تیمّم کرے تو اس کا تیمّم درست ہے لیکن اگر خود اپنے اختیار سے غصبی جگہ میں پھنس گیا ہو تو **اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ** (مگر یہ کہ تم مضطر کر دیئے جاؤ) کے زمرے میں نہیں آتا۔ اس صورت میں تیمّم واجب بھی ہے اور حرام بھی۔ واجب اس لحاظ سے ہے کہ نماز وغیرہ کیلئے طہارت واجب ہے اور حرام اس لحاظ سے کہ خود اس غصب کا مرتکب ہوا ہے۔

مسئلہ: 173 جب تک مٹی یا ریت تک دسترس ہو، ان کے علاوہ کسی اور چیز پر تیمّم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بعد سنگریزے، پتھر، ڈھیلے، لکڑی اور درختوں کے پتے وغیرہ کا مرحلہ آتا ہے۔ مٹی اور اس

جیسی دیگر چیزوں میں یہ شرط نہیں ہے کہ پکی ہوئی نہ ہوں، اس لئے کہ اس میں زمین ہونے کے علاوہ صرف پاک صاف اور مباح ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: 174 اگر ان چیزوں میں سے کوئی بھی دستیاب نہ ہو تو پھر قالین یا اس جیسی چیزوں پر پائے جانے والے غبار پر تیمّم کرنا چاہئے۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو پھر پاکیزہ کیچڑ پر، اور کیچڑ کو جہاں تک ہوسکے، خشک کرنا واجب ہے۔ البتہ جہاں تک پہلی چیز یعنی مٹی اور ریت وغیرہ کا امکان ہو تو دُوسروں چیزوں تک نوبت نہیں پہنچتی۔

مسئلہ: 175 تیمّم چاہے غسل کے بدلے ہو یا وضو کے بدلے، اس میں اتنا کافی ہے کہ دونوں ہتھیلیوں کو ایک دفعہ زمین پر مارے اور پھر پہلے پوری پیشانی پر دونوں ہتھیلیوں سے مسح کرے۔ اس کے بعد دائیں ہاتھ کی پشت پر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اور آخر میں بائیں ہاتھ کی پشت پر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے مسح کرے۔ تیمّم کے اعضاء کے پاک ہونے کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ ان پر کوئی ایسی چیز نہ ہو جو جلد پر مسح کرنے میں رُکاوٹ ہو۔

مسئلہ: 176 جب تک یہ اُمید ہو کہ آخر وقت تک نماز کو غسل یا وضو سے پڑھ سکے گا، تیمّم نہیں کرنا چاہئے۔ اگر نا اُمید ہونے کے بعد تیمّم کر کے نماز پڑھ لے تو نماز کا وقت تمام ہونے سے قبل پانی مل جائے تو وضو یا غسل کر کے دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے، اس لئے کہ تیمّم میں یہ شرط ہے کہ آخر وقت تک پانی نہ ملے۔

مسئلہ: 177 جس طرح پانی دستیاب ہونے سے تیمّم باطل ہوجاتا ہے، اسی طرح ان تمام چیزوں سے بھی باطل ہوجاتا ہے جو وضو یا غسل کو باطل کردیتی ہیں۔

مسئلہ: 178 جس طرح ایک وضو یا ایک غسل چند لحاظ سے کافی ہوتا ہے، اسی طرح ایک تیمّم بھی غسل یا وضو کی چند جہات سے کافی ہوتا ہے۔

مسئلہ: 179 جس طرح غسل وضو سے کافی ہوتا ہے، اسی طرح ایسا تیمّم جو غسل کے بدلے

میں ہو، وضو سے کافی ہے، سوائے مستحب غسل کے، جن کے بدل کے طور پر تیمّم کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

مسئلہ: 180 اگر غسل کے بدلے کئے گئے تیمّم کے بعد کوئی ایسا کام انجام دے جس سے وضو باطل ہو جاتا ہے تو اس صورت میں ہر اُس کام کے انجام دینے کیلئے جس کیلئے وضو شرط ہے، اگر ممکن ہو تو وضو کرنا واجب ہے۔ اگر وضو سے بھی معذور ہو تو اس کے بدلے بھی تیمّم کرنا واجب ہے۔ اس کا وہ تیمّم جو غسل کے بدلے میں تھا، باقی ہے۔ وہ صرف اُسی چیز سے باطل ہوگا جس سے غسل باطل ہوتا ہے۔ اس صورت میں دوبارہ غسل کے بدلے تیمّم کرنا واجب ہے اور وہ پہلے کی طرح وضو سے بھی کافی ہے۔

مسئلہ: 181 اگر تیمّم واجب غسل کے بدلے میں ہو تو وہ مسجد میں داخل ہونے کیلئے کافی نہیں ہے مگر اس ضرورت کی حالت میں (مثلاً طوافِ واجب وغیرہ) جو اس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہ ہو، جیسا کہ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں آ چکی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ دیر مسجد میں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔

نماز

نماز دینِ الٰہی کا اہم ترین فریضہ ہے جو کسی صورت میں بھی کسی مکلّف سے ساقط نہیں ہوتا، سوائے خواتین کے حیض و نفاس کی حالت کے۔ نماز جو جنابِ رسولِؐ خدا کے فرمان کے مطابق دین کا ستون اور مؤمن کی معراج ہے، اپنے ظاہر و باطن اور مقدمات و شرائط کے لحاظ سے عباداتِ خدا کا نمایاں ترین اور جمیل ترین مظہر ہے۔ اگر اسے اس طرح انجام دیا جائے جیسے انجام دینا چاہیئے تو یہ انسان کو ہر قسم کی عقیدتی اور عملی برائی سے روکنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے کہ:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (45:29)

''یقیناً نماز تمام فحش کاموں اور منکرات سے روکتی ہے''۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اُس نے اپنے ان سراپا تقصیر اور گناہگار

بندوں کو نہ صرف یہ کہ اجازت دی ہے بلکہ اُن پر واجب کیا ہے کہ ہر روز پانچ مرتبہ دین کے ستون اور ایمان کی معراج پر حاضر ہوں اور خدائے رحمٰن کی بارگاہ میں شرفیاب ہوں۔

نماز اپنے اندر تین ایسے ارکانِ معرفت رکھتی ہے جو اس کے ظاہری ارکان سے مل کر نمازی کے ظاہر و باطن کو خدائے قدوس کے نزدیک کرتی ہے، وہ تین ارکانِ معرفت یہ ہیں:

1۔ سب سے پہلے یہ کہ تجھے معلوم ہو کہ تو کون ہے اور کیا ہے؟

2۔ پھر یہ کہ تو کس کے حضور کھڑا ہے؟

3۔ آخر میں یہ کہ کس لئے اس معراج پر روانہ ہوا ہے؟

تو ناچیز ہے، اُس نے تجھے ''چیز'' بنایا ہے جبکہ وہ سب کچھ ہے، اس لحاظ سے کہ تمام موجودات اور اُن کے کمالات اس کے فیض سے اور اُس کا عطیہ ہیں اور تو اُس کے حضور شکر گزاری اور حاجت مندی کے اظہار کیلئے کھڑا ہے۔ اسے ہرگز تیری ضرورت نہیں ہے، یہ تُو ہی ہے جسے صرف اُس کی بارگاہ میں سراپا نیاز بن کر اپنے شکر اور فقر کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اگر تُو ناشکری اور بے نیازی کی راہ اختیار کرے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ تُو خود پستی اور نیستی کی گہری کھائیوں میں جا گرے گا۔

خدا کی بندگی اور عبادت کا جوہر نماز میں کمال پر ہوتا ہے۔ یہ بندگی تیرے بندہ ہونے اور اُس کے خدا ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے جسے ترک کرنا کسی حالت میں صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ بہت حساس اوقات میں عبادت کی اس حساس ترین صورت کو انسان پر واجب کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ صبح ان پانچ فرائض میں سے پہلے فرض یعنی نمازِ صبح کے ساتھ صبح کا آغاز کرو اور رات کو سوتے وقت ان میں سے آخری فرض یعنی عشاء کی نماز کے ساتھ دن بھر کی سرگرمیوں کا اختتام کرو، جس کا وقت آدھی رات تک ہے۔

قرآن شریف اور روایات کی روشنی میں اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو جدا کر کے پڑھنا زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ انہیں یکجا پڑھنے

کی اجازت معذور اور بے حال افراد کی سہولت کی خاطر دی گئی ہے۔خود ظہر،عصر،مغرب اور عشاء کے نام اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ بنیادی طور پر ان میں علیحدگی قرار دی گئی اور علیحدگی کو بغیر کسی وجہ کے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

صبح یعنی فجر صادق کے وقت جب گہری اور میٹھی نیند سے آنکھ کھولو تو سب سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرو۔ظہر کے وقت جب زندگی کے کاموں میں مصروف ہوتے ہو تو ہر چیز کو چھوڑ کر نماز کی طرف یعنی مؤمن کی معراج کی طرف رُخ کرو۔عصر کے وقت جبکہ ابھی تک زندگی کی سرگرمیاں نا تمام اور جاری ہیں، دوبارہ اسی عمل کو دُہراؤ اور نمازِ ظہر کی مانند ہر شے کو نظر انداز کر کے معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاؤ۔

رات کا آغاز مغرب کی نماز سے کرو اور آدھی رات تک نمازِ عشاء کو بجالاؤ۔اس طرح ان پانچ حساس اوقات میں، جو اوقاتِ شب و روز کے اصلی ارکان ہیں، اس رُکنِ ایمان کو انجام دو تا کہ زندگی کا ہر رُکن اللہ کی یاد اور اُس کے ذکر سے نورانی ہو جائے اور زندگی کے تمام کاموں کو منور کر دے کہ زندگی کے فرائض کو ادا کرتے وقت اللہ اور اُس کے احکام سے غافل نہ رہو کہ:

"اَلا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنَّ الْقُلُوْبُ"(28:13)

"آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ(45:29)

"نماز تمام فحش کاموں اور منکرات سے روکتی ہے"۔

عاشقانِ حضرت کبریا کیلئے کس قدر لذت بخش اور دل نشین ہے کہ صدقِ دل سے اور صفائے نیت سے:

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ".

کہہ کر بارگاہِ اقدسِ الٰہی میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اہل معرفت کیلئے اس سے بہتر اور

برتر کوئی لذت نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر کونسی عزت ہوسکتی ہے کہ اس اعتراف کی اساس پر اپنے صدق کے پہلے نمونہ کے طور پر رکوع میں جائے اور چونکہ معراج المؤمن میں صرف رکوع کافی نہیں ہے، لہٰذا خود کو اس کی بارگاہ میں سجدہ میں گرا دے کہ سجدہ کا ظاہر و باطن، عبادت اور خضوع کی حسین ترین صورت ہے۔

اگر ہم نماز کے معنی اور مقصد کو جان لیتے تو ہرگز حالتِ نماز سے باہر نہ آتے۔

''خوشا آنانکه دائم در صلواتند''.

مگر چونکہ زندگی کی شرائط اور ضروریات ہمیں یہ فرصت نہیں دیتیں کہ دائم نماز میں رہیں، تاہم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ ہم شب و روز تمام کاموں اور تمام حالات میں نماز سے پیدا ہونے والی نورانی اور معنوی حالت کو برقرار رکھیں تا کہ:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (45:29)

جو نماز کی خاصیت ہے، نماز کے بعد بھی ہمیں برائیوں سے روکے رہے۔

واجب نمازیں

مسئلہ: 182 یومیہ نمازوں کے علاوہ نمازِ جمعہ، نمازِ عیدین، نمازِ آیات، نمازِ میّت اور نمازِ طواف کا وجوب اصلی ہے اور ان کے علاوہ نمازِ نذر، عہد یا قسم کا وجوب فرعی ہے۔ ماں باپ کی قضا نمازوں کے بڑے بیٹے پر واجب ہونے یا نہ ہونے کے حکم کے بارے میں بعد میں بیان ہوگا۔

مسئلہ: 183 صبح کی نماز کا وقت طلوعِ فجرِ صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہے۔ نمازِ ظہر وعصر کا وقت زوالِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک اور نمازِ مغرب وعشاء کا وقت غروبِ آفتاب سے آدھی رات تک ہے۔ آدھی رات کا معیار غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب کا درمیانی لمحہ ہے، جیسا کہ قرآن شریف میں بھی ہے کہ ''اِلٰی غَسَقِ اللَّیۡلِ''، جس سے مراد رات کی تاریکی کا عروج ہے۔

مسئلہ: 184 مغرب کی ابتداء میں تین رکعات کے انجام دینے کا وقت نمازِ مغرب کا مخصوص

وقت ہے اور جب آدھی رات ہونے میں اتنا وقت رہ جائے جس میں چار رکعات نماز پڑھی جاسکے تو یہ عشاء کی نماز کا مخصوص وقت ہے۔ زوالِ آفتاب سے چار رکعات کا وقت نمازِ ظہر کا مخصوص وقت ہے اور جب سورج کے غروب ہونے میں چار رکعات کا وقت باقی رہ جائے تو وہ نمازِ عصر کا مخصوص وقت ہے۔

مسئلہ: 185 مغرب کے مخصوص وقت میں نمازِ عشاء پڑھنا یا عشاء کے مخصوص وقت میں نمازِ مغرب پڑھنا، اسی طرح نمازِ ظہر کے مخصوص وقت میں نمازِ عصر اور نمازِ عصر کے مخصوص وقت میں نمازِ ظہر پڑھنا باطل ہے۔ لیکن اگر دُوسری نماز کو مشترک وقت میں پہلی نماز سے پہلے پڑھ لے، مثلاً مشترک وقت میں نمازِ عصر کو نمازِ ظہر سے قبل یا نمازِ عشاء کو نمازِ مغرب سے پہلے پڑھ لے تو اگر نماز تمام ہونے سے پہلے اپنی غلطی کا احساس ہوجائے اور وہ نیت بدل دے تو اس کی نماز صحیح ہے۔ اگر نماز مکمل کرنے کے بعد اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوجائے تو اُس کی نماز اُسی نیت کے ساتھ صحیح ہے اور پہلی نماز کو بعد میں ادا کرے۔

مسئلہ: 186 اگر نماز کا وقت گزر رہا ہو اور صرف ایک رکعت کا وقت موجود ہو تو بلا تاخیر واجب کی نیت سے نماز کو انجام دے۔ لیکن اگر نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے نماز پڑھ لے تو ہر صورت میں نماز باطل ہے، اس لئے کہ قاعدہ ُمن ادرک رکعة فقد ادرک کله ُیعنی ''جس نے ایک رکعت کا وقت پالیا، اُس نے پوری نماز کا وقت پالیا''۔ ظاہراً آخر وقت کے متعلق ہے، نہ کہ اوّل وقت کے متعلق۔

مسئلہ: 187 نماز کو اوّل وقت میں ادا کرنا مستحبِ موکدہ ہے مگر یہ کہ کوئی ایسا واجب درپیش ہو جس کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔ اس صورت میں اُس واجب کو پہلے انجام دینا لازم ہے۔ اگر اوّل وقت میں نماز کے مقدمات، شرائط یا اجزاء میں سے کسی سے مانع کوئی عذر موجود ہو اور نماز میں تاخیر کرنے سے اُس کے برطرف ہوجانے کا یقین یا احتمال ہو تو ان حالات میں نماز میں تاخیر واجب

ہے،اس لئے کہ فریضہ واجب یہ ہے کہ اس وسیع وقت کے دوران جہاں تک ممکن ہو، نماز کو تمام شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے۔

مسئلہ: 188 نماز گزار کا فرض ہے کہ ہر صورت میں نماز کو تمام شرائط کے ساتھ ادا کرنے کیلئے آمادہ رہے، چاہے یہ آمادگی نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے ہو یا اس کے بعد۔ اگر وقت شروع ہونے کے بعد نماز کی صحت کی بعض شرائط کو انجام نہ دے سکتا ہو تو واجب ہے کہ ہر ممکن حد تک نماز کے وقت سے پہلے خود کو آمادہ کر لے۔ پس اگر اُسے علم ہو کہ نماز کا وقت شروع ہو جانے کے بعد بدن یا لباس کی طہارت یا غسل یا وضو وغیرہ کو انجام نہیں دے سکے گا تو اگر قبل از وقت ان اُمور کو انجام دے سکتا ہو تو واجب ہے کہ ایسا کرے۔

احکامِ قبلہ

مسئلہ: 189 نماز گزار کا رُو بہ قبلہ ہونا نماز کی ضروری شرائط میں سے ہے۔ جو لوگ کعبہ کی طرف نماز ادا کر سکتے ہیں، اُن کا قبلہ خود کعبہ ہے اور دُوسروں کا قبلہ مسجد الحرام۔ جو لوگ مسجد الحرام کو بھی قبلہ نہ بنا سکتے ہوں، اُن کا قبلہ شطر المسجد الحرام ہے کہ مسجد الحرام کی طرف قبلہ ہے۔

مسئلہ: 190 اگر کسی وجہ سے مسجد الحرام کی سمت معلوم نہ ہو سکے اور آخر وقت تک اس کا امکان بھی نہ ہو تو جس طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی جائے، کافی ہے، اس لئے کہ مکلّف پر نماز واجب ہے اور اب جبکہ قبلہ کی شناخت ممکن نہیں ہے تو:

”فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ“. (115:2)

”تم جس طرف منہ پھیرو، اُسی طرف وجہ اللہ ہے“۔

اس لئے کہ خدا کسی خاص سمت میں نہیں ہے۔ مسجد الحرام کی جانب منہ کرنا بعض حکمتوں کی غرض سے ہے، جو امکان کی صورت میں واجب ہے۔ جبکہ عذر کی صورت میں:

''فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ''.(115:2)

کا مرحلہ آتا ہے۔تاہم دو یا تین یا چار اطراف میں نماز کو دُہرانے کے واجب ہونے پر کوئی قابل قبول دلیل موجود نہیں ہے۔

مسئلہ: 191 کعبہ کے اندر یا اُس کی چھت پر ہر طرف قبلہ ہے، اس لئے کہ وہ خود قبلہ ہے اور قبلہ کا کوئی قبلہ نہیں بلکہ اس کی جس جانب نماز پڑھی جائے تو وہ رُو بہ قبلہ ہے۔

مسئلہ: 192 قبلہ کی سمت معلوم کرنے کیلئے حتی الامکان اتنی کوشش کرنا واجب ہے جس سے کم از کم اطمینان بخش گمان حاصل ہو جائے۔ مسلمانوں کی قبور اور مساجد کی محرابیں اطمینان بخش علامات میں سے ہیں۔

مسئلہ: 193 اگر قبلہ کی سمت کا اطمینان ہونے یا قبلہ کی سمت کے معلوم ہونے کا امکان نہ ہونے کی وجہ سے کسی سمت نماز پڑھ لی جائے اور نماز کا وقت ختم ہونے سے قبل علم ہو جائے کہ نماز قبلہ کی طرف نہیں پڑھی گئی تھی تو اس صورت میں اگر قبلہ سے اس کا انحراف 90 درجہ یا اس سے زیادہ ہو تو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے، اس لئے کہ:

''فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ''(44:2)

''اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لے''۔

اور ''مابین المشرق والمغرب قبله''(مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے) کی رُو سے اگر مشرق اور مغرب کی طرف سے منحرف نہ ہو اور ان کے درمیان جو کہ 90 درجے کا زاویہ ہے، اگر 89 درجے پر بھی ہو تو نماز درست ہے اور معتبر احادیث بھی اس حکم پر گواہ ہیں۔

مسئلہ: 194 اگر وقت گزرنے کے بعد علم ہو کہ قبلہ سے انحراف 90 درجے یا اس سے زیادہ تھا تو اس کی نماز ظاہراً صحیح ہے کیونکہ نماز کے وقت جو اُس کا فریضہ تھا، اُس نے انجام دے دیا۔ معتبر احادیث بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔

مسئلہ: 195 عام حالت میں اور کسی ضرورت کے بغیر حرکت کی حالت میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے، اس لئے کہ نماز کی حالت میں جسم کے ساکن ہونے کے علاوہ قبلہ کا لحاظ رکھنا بھی واجب ہے مگر ظاہراً گاڑی یا ہوائی جہاز یا کشتی میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، بشرطیکہ حتی الامکان اپنے آپ کو قبلہ رُخ رکھا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ سائیکل، موٹر سائیکل، گھوڑے اور اُونٹ وغیرہ پر سواری کی حالت میں نماز بغیر مجبوری کے درست نہیں ہے۔

واجباتِ نماز

واجباتِ نماز کی دو اقسام ہیں: 1۔ واجباتِ رُکنی 2۔ واجباتِ غیر رُکنی

واجباتِ رُکنی یہ ہیں: نیت، تکبیرۃ الاحرام، قیامِ متصل بہ رکوع، رکوع و سجود۔

ان ارکان میں کمی بیشی ہر صورت میں نماز کو باطل کر دیتی ہے، مگر یہ کہ اضافہ نمازِ جماعت میں ہو جو امام کی اتباع میں بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔

واجباتِ غیر رُکنی یہ ہیں: حالتِ قیام میں حمد اور سورۃ کی قرأت، رکوع اور سجود میں ذکرِ واجب، تشہد اور سلام۔

مسئلہ: 196 نیت صرف نماز کا قصد نہیں بلکہ قصدِ قربت بھی ہے اور ان دو قصدوں کا مرکب نماز کی نیت کو، جو واجب ہے، تشکیل دیتا ہے۔

مسئلہ: 197 تکبیرۃ الاحرام، حمد، سورۃ، رکوع و سجود کے واجب ذکر، تشہد اور سلام کو بدن کی حالتِ سکون میں انجام دینا ضروری ہے۔ لیکن اگر سہو، فراموشی یا اضطرار کی وجہ سے بدن حرکت میں ہو تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ: 198 قیام کے دو حصے ہیں: ایک رُکنی اور دُوسرا غیر رُکنی۔ رُکنی حصہ قیام متصل بہ رکوع ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حالتِ قیام سے رکوع میں جائے۔ غیر رُکنی قیام، حمد اور سورۃ کی قرأت کے وقت ہے۔ پس اگر رکوع کرتے وقت حالتِ قیام میں نہ ہو تو رُکن چھوٹ جاتا ہے۔ اگر حمد اور سورۃ کو

بغیر حالتِ قیام پڑھا جائے تو صرف واجب ترک ہوتا ہے۔

مسئلہ: 199 قیام کی دونوں صورتیں، جہاں تک ممکن ہو، واجب ہیں۔ پس اگر سہارے کے بغیر کھڑا ہوسکتا ہو تو واجب ہے کہ سہارے کے بغیر ہی کھڑا ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو سہارا لے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو لیٹ کر نماز پڑھنا کافی ہے۔ [1]

قرأت

تکبیرۃ الاحرام کے بعد سورۂ حمد اور پھر کوئی بھی قرآنی سورت، جو آپ چاہیں، پڑھنا واجب ہے، سوائے اُن سورتوں کے جن میں سجدہ واجب ہے۔ قرأت کے متعلق چند مسائل درج ذیل ہیں:

مسئلہ: 200 جس طرح سورۂ حمد کے بعد سورۃ الکوثر کا پڑھنا کافی ہے، جو بسم اللہ سمیت چار آیات پر مشتمل ہے تو کیا قرآن شریف کی کسی سورۃ کی چار آیات سورۂ حمد کے بعد پڑھنا کافی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ روایاتِ معتبرہ میں ایک سورۃ کو دو رکعات میں تقسیم کرنے کا جواز واضح طور پر پایا جاتا ہے اور چونکہ ان روایات کے معتبر ہونے کے علاوہ ان کا کوئی معارض بھی

1۔ قیام باعثِ تکلیف ہو اور اس کی وجہ سے دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہو سکتے ہوں اور معانی پر بھی توجہ قائم نہ رہ سکتی ہو تو ایسی صورت میں بیٹھ کر نماز ادا کرنا افضل ہے۔ اگر کسی شخص کی کمر یا ٹانگوں میں تکلیف ہو یا کسی اور بیماری کی وجہ سے کھڑا ہونا اس کے لئے تکلیف دہ ہو اور یہ شخص اپنی ماں، باپ یا کسی مہربان استاد سے ملنے جائے تو کیا وہ اس سے کہیں گے کہ چونکہ ہم بڑے ہیں لہٰذا تکلیف کے باوجود تم حتی الامکان ہمارے سامنے کھڑے ہو کر بات کرو؟ یا یہ کہ اپنی محبت اور مہربانی کی وجہ سے اسے کہیں گے کہ بیٹا بیٹھ جاؤ، اور بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔ اللہ تعالیٰ جو ماں باپ سے بڑھ کر اپنے بندوں پر مہربان ہے اس کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا شخص کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھے تو وہ ناراض ہو جائے گا اور نماز بھی قبول نہیں کرے گا۔ (ہمدانی)

نہیں ہے، لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ ایک سورۃ کو تقسیم کرنا جائز ہے، خصوصاً اس حکمت کے پیش نظر جو فضل بن شاذان نے امام رضا علیہ السلام سے نقل کی ہے کہ نماز میں قرأت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ قرآن ضائع اور متروک نہ ہو جائے بلکہ محفوظ اور رائج رہے تاکہ اضمحلال و جہالت کا شکار نہ ہو جائے۔

(وسائل الشیعہ، ابوابِ قرأتِ نماز، باب اوّل، حدیث:3)۔

یہ حکمت صرف اس صورت میں درست ہوسکتی ہے جب قرآنی سورۃ کو نماز میں تقسیم کرنا جائز ہو، اس لئے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران جیسی طویل سورتوں کو مکمل طور پر نماز میں پڑھنا اکثر لوگوں کیلئے ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود احتیاط یہ ہے کہ سورۂ حمد کے بعد چار آیات سے کم نہ پڑھی جائیں۔

مسئلہ: 201 ظاہراً سورۂ حمد کے بعد ایک سے زائد سورتیں پڑھنا جائز ہے، خصوصاً اگر یہ سورتیں چھوٹی ہوں۔ بہت زیادہ احتیاطِ موکد یہ ہے کہ چند چھوٹی سورتوں کی بجائے ایک ایسی بڑی سورت پڑھی جائے جو چند چھوٹی سورتوں کے برابر یا اُن سے کم وبیش ہو۔

مسئلہ: 202 اگر رکوع سے قبل علم ہو جائے کہ حمد اور سورۃ نہیں پڑھی یا یہ شک رونما ہو کہ پڑھی یا نہیں تو اس صورت میں سورۃ کی قرأت کے دوران حمد کے پڑھنے یا نہ پڑھنے میں شک ہو تو شک کی طرف توجہ نہ کرے لیکن اگر حمد کی قرأت کے دوران شک ہو تو اس کی تلافی واجب ہے۔ اگر یقین ہو جائے کہ حمد اور سورۃ نہیں پڑھی ہیں یا ناقص پڑھی ہیں تو ان دونوں صورتوں میں ان کی تلافی اس طرح واجب ہے کہ پہلے حمد اور پھر سورۃ کو پڑھے۔ لیکن اگر یہ یقین رکوع کے بعد ہو تو نماز کے بعد ہر ایک کیلئے دو سجدۂ سہو احتیاطاً انجام دے۔

مسئلہ: 203 سورۂ توحید اور سورۂ کافرون کے علاوہ باقی تمام سورتوں میں ایک سورۃ سے دُوسری سورۃ کی طرف منتقل ہونا جائز ہے۔

مسئلہ: 204 ظاہراً سورۂ فیل اور سورۂ لایلاف ایک شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح سورۂ والضحیٰ اور

سورۂ الم نشرح بھی ایک سورۃ شمار ہوتی ہیں۔ پس اگر سورۂ حمد کے بعد کامل سورۃ واجب ہو تو یہ دونوں باہم پڑھی جانی چاہئیں۔ لیکن چونکہ سورۃ کو پورا پڑھنا واجب نہیں ہے اور چند آیات ہی کافی ہیں، لہٰذا سورۂ حمد کے بعد ان میں سے ہر سورۃ پڑھی جاسکتی ہے۔

مسئلہ: 205 سورۂ حمد کی تلاوت میں اللہ تعالیٰ سے نقل کی نیت سے پڑھنا نہ صرف یہ کہ واجب نہیں ہے بلکہ جائز بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہے:

"اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ".

کیا خدا کسی اور خدا کی توحید کا اقرار کر رہا ہے؟ کہ وہ کہتا ہو اور ہم اُس کا یہ قول نقل کرتے ہوں کہ "صرف تیری عبادت کرتے ہیں" بلکہ واجب ہے کہ سورۂ حمد کو اس طرح پڑھے کہ خود اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو رہا ہے اور اُس کی حمد کر رہا ہے، اس لئے کہ سورۂ حمد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ سے کس طرح ہم کلام ہوں۔

مسئلہ: 206 **"وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا وَابۡتَغِ بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا".** (110:17)

اس آیہ شریفہ کی رُو سے بہت اُونچی آواز میں نماز پڑھنا حرام ہے اور اسی طرح اس قدر آہستہ پڑھنا بھی حرام ہے کہ انسان خود بھی نہ سن سکے بلکہ ان دونوں کا درمیانی راستہ اختیار کرنا واجب ہے جو یہ ہے کہ فجر و مغرب و عشاء کی نماز میں حمد اور سورت کو بلند آواز میں پڑھنا مردوں کے لئے واجب ہے اور عورتوں کے لئے جائز ہے۔ دُوسری نمازوں میں انہیں آہستہ پڑھنا چاہئے۔

مسئلہ: 207 ظاہراً جمعہ کے دن ظہر کی نماز میں حمد اور سورۃ کو نمازِ جمعہ کی مانند اُونچی آواز میں پڑھنا واجب ہے۔ بنیادی طور پر جمعہ کے دن صرف جمعہ کی نماز ہی واجب ہے جو شرائطِ جماعت کے ساتھ دو رکعات اور بصورتِ دیگر چار رکعات ہے۔ روایات کی کثیر تعداد کی رُو سے دونوں قسم کی نمازِ جمعہ میں سورۂ حمد کے بعد سورۂ جمعہ پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ:208 اگر جہالت، سہو یا فراموشی کی وجہ سے اُونچا پڑھنے کی بجائے آہستہ پڑھے یا آہستہ کی بجائے اُونچا پڑھے تو نماز صحیح ہے اور دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئلہ:209 نماز کے دوران سورۂ حمد اور سورۃ کو قرآن شریف سے دیکھ کر پڑھنا جائز ہے۔ جو شخص زبانی نہیں پڑھ سکتا یا اُسے اپنے حافظہ پر اعتماد نہ ہو، اُس کے لئے دیکھ کر پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ:210 اگر کوئی شخص گونگا ہو یا اُس کی زبان میں نقص ہو یا موجودہ حالت میں صحیح نہ پڑھ سکتا ہو تو جس حد تک جس طرح پڑھ سکے، پڑھے۔ اگر نماز کے آخر وقت تک اپنی قرأت درست کر سکتا ہو تو اُس وقت تک نماز میں تاخیر واجب ہے۔ اگر نماز کے وقت کے گزر جانے کا خوف ہو تو مجبوری کی وجہ سے جس حد تک پڑھ سکتا ہو، اسی طرح پڑھے۔ اگر ممکن ہو تو نماز کو باجماعت پڑھے مگر یہ کہ ہمیشہ معذور ہو اور یہ عذر اُس کا اپنا بنایا ہوا نہ ہو۔

مسئلہ:211 حمد اور سورۃ کو رائج قرآن شریف کی قرأت کے مطابق پڑھنا واجب ہے۔ دُوسری قرأتیں جو موجودہ رائج قرآن شریف سے مختلف ہیں، کافی نہیں ہیں۔ پس اگر "**مالک یوم الدین**" کی بجائے "**ملک یوم الدین**" پڑھا جائے یا "**کفواً احد**" کو کسی اور طرح پڑھا جائے تو نماز باطل ہے۔

مسئلہ:212 قرأت میں حروف اور کلمات کے تلفظ کو ممکن حد تک صحیح معیار کے مطابق ادا ہونا چاہئے۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تلفظ مکمل طور پر عربوں کی طرح ہو، اس لئے کہ لہجہ کو تبدیل کرنا بذاتِ خود ایک مشکل کام ہے اور اکثر لوگوں کیلئے دُشوار ہے لیکن کم از کم اتنی کوشش ضرور کرنا چاہئے کہ آیت یا لفظ کے معنی لاپرواہی کی وجہ سے تبدیل نہ ہو جائیں۔ دُوسرے یہ کہ رائج قرآن شریف کے اعراب کا کمی بیشی کے بغیر خیال رکھا جائے، اگرچہ اعراب کی تبدیلی معنی کو تبدیل نہ بھی کرے، اس لئے کہ جو کچھ قرآن شریف میں ہے، اُسے پڑھنا واجب ہے، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ عربی ہی میں پڑھا جائے، کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ ہرگز کافی نہیں ہے، اس لئے کہ قرآن ایمان کا رُکن اور نماز

ایمان کی بنیاد ہے۔لہٰذا دونوں کو وحی کی زبان میں ہونا چاہئے تا کہ وحی کی آخری کتاب کی عالمی حیثیت برقرار رہے۔

وحی کی زبان سے کم از کم آشنائی کی حد یہ ہے کہ نماز جو دین کا ستون ہے، اسی زبان میں بین الاقوامی اور ہمہ گیر صورت پر برقرار رہے۔

مسئلہ:213 تین رکعات کی نماز اور چار رکعات کی نمازوں میں تیسری اور چوتھی رکعت میں نمازی کو اختیار ہے کہ صرف سورۂ حمد یا ایک دفعہ "**سبحان اللّٰہ و الحمدللّٰہ و لا الٰہ الااللّٰہ و اللّٰہ اکبر**" پڑھے اور بہتر ہے کہ تین مرتبہ پڑھے۔

رکوع

رکوع کی حالت اُن حالات میں سے ہے جو بارگاہِ الٰہی سے مخصوص ہیں اور غیر خدا کیلئے جائز نہیں ہے۔ پس اگر غیر خدا کو عبودیت کے قصد سے رکوع کیا جائے تو شرک ہے اور اگر احترام کی نیت سے ہو تو اس آیہ شریفہ کا مصداق ہے:

"**تَاللّٰہِ اِنْ کُنَّالَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. اِذْنُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ**".

"اللہ کی قسم! ہم کھلی گمراہی میں تھے کہ تمہیں رب العالمین کے مساوی قرار دیتے تھے"(98:26)۔

چونکہ رکوع صرف نماز میں مقرر کیا گیا ہے، لہٰذا نماز کے علاوہ اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جائز نہیں ہے، جیسا کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی، رمی جمرات، وقوف در عرفات و مشعر اور منیٰ میں رات کا قیام حج سے مختص ہیں اور حج کے علاوہ جائز نہیں ہیں۔

رکوع جو بارگاہِ الٰہی سے مختص ہے اور نماز میں ایک مستقل مقام رکھتا ہے، درحقیقت سجدہ کا مقدمہ ہے جو مزید خضوع کی حالت ہے۔ گویا نمازی کو یہ سمجھانے کے لئے ہے کہ رب العالمین کی

بارگاہ میں رکوع کی حد تک خضوع کافی نہیں ہے بلکہ دوبارہ حالتِ قیام میں جا کر سجدہ میں گر جاؤ کہ یہ خضوع کی انتہا ہے۔

رکوع سورۃ کی قرأت کے بعد ہے اور اس میں اتنا جھکنا واجب ہے کہ ہاتھ کی اُنگلیوں کے سرے بلکہ احتیاطِ شدید یہ ہے کہ ہتھیلیاں زانو تک جا پہنچیں۔

رکوع کے مسائل یہ ہیں:

مسئلہ: 214 خود رکوع نماز کے واجباتِ رُکنی میں سے ہے اور ذکرِ رکوع واجبِ غیر رُکنی ہے۔ ذکرِ رکوع میں جو کچھ کم از کم اور مسلم طور پر واجب ہے، ذکر اللہ یعنی اللہ کا ذکر ہے، چاہے اللہ اکبر یا صرف اللہ کہنے کی صورت میں ہو۔ بہتر یہ ہے کہ ایک مرتبہ سبحان اللہ یا "**سبحان ربی العظیم و بحمدہ**" کہا جائے۔ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو تین مرتبہ کہا جائے تاکہ ذکر کو کامل طور پر انجام دینے کے علاوہ یہ اطمینان بھی حاصل ہو جائے کہ ذکرِ واجب حالتِ سکون میں انجام پایا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں درمیانی ذکر لازماً حالتِ سکون میں ہوتا ہے۔

مسئلہ: 215 واجب ہے کہ رکوع کا ذکرِ واجب اس طرح انجام دیا جائے کہ بدن سکون کی حالت میں ہو اور اس واجب کی ادائیگی کا اطمینان حاصل کرنے کیلئے بہتر ہے، جیسا کہ حدیث میں بھی ہے، سبحان اللہ کو تین مرتبہ کہا جائے تاکہ کم از کم درمیان میں کہا گیا سبحان اللہ حالتِ سکون میں ہو۔

مسئلہ: 216 رکوع کے بعد بالکل سیدھا کھڑا ہونا واجب ہے اور اگر ایسا کئے بغیر سجدہ میں چلا جائے تو یہ درست نہیں ہے۔ اگر سیدھا کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو جس قدر ممکن ہو، اُسی قدر کھڑا ہونا واجب ہے یا رکوع سے تھوڑا سا کھڑا ہو جائے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو حالتِ رکوع میں ہی اشارے سے قیام کرے اور سجدہ میں چلا جائے۔ اگر قیام کی بجائے بیٹھ جائے کہ یہ بھی واجب اور کافی ہے کہ اگر حالتِ قیام سے سجدہ میں نہ جا سکتا ہو مگر سیدھا بیٹھ سکتا ہو تو بیٹھ جائے کہ یہ قیام کا قائم مقام ہے اور پھر سجدہ میں چلا جائے۔

مسئلہ: 217 اگر کسی ذریعے یا وسیلے سے رکوع کے بعد کھڑا ہو سکتا ہو اور کوئی حرج اور مشقت بھی نہ ہو تو اس وسیلہ کے ذریعہ کھڑا ہونا واجب ہے۔ اگر کسی طور سے بھی رکوع سے سر اُٹھانا یا بیٹھنا ممکن نہ ہو تو حالتِ قیام کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے۔

مسئلہ: 218 رکوع کیلئے بھی نماز کے دیگر واجبات کی مانند ضروری ہے کہ اسے اس کی مخصوص نیت کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اگر رکوع کی نیت نہ کرے تو چاہے کسی اور کام کی نیت سے جھکے یا محض جھکنے کی نیت کرتے ہوئے جھکے تو یہ رکوع کافی نہیں ہے۔ رکوع کی نیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ نماز کی نیت اور ارادے کے بعد، واجباتِ نماز میں سے ایک واجب کے طور پر انجام دیا جائے کہ اگر کہا جائے کہ کیا کر رہے ہو تو اُسے معلوم ہو کہ رکوع کر رہا ہے۔

مسئلہ: 219 اگر رکوع کرنا بھول جائے یعنی قیام سے سجدہ میں چلا جائے اور سجدہ میں پہنچنے سے پہلے اُسے یاد آ جائے کہ رکوع نہیں کیا تو واجب ہے کہ حالتِ قیام میں لوٹ جائے اور پھر رکوع کرے۔ غلطی سے جھکی ہوئی حالت سے رکوع میں جانا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں قیام متصل بہ رکوع، جو کہ نماز کے واجباتِ رُکنی میں سے ہے، ادا نہیں ہوا ہے اور اس کی تلافی واجب ہے۔

اگر رکوع کے بغیر سجدہ میں چلا جائے اور پہلے سجدہ کے دوران یا دُوسرے سجدہ سے قبل غلطی کا علم ہو جائے تو اس صورت میں بھی واجب ہے کہ حالتِ قیام میں لوٹ جائے، پھر رکوع کرے، بعد ازاں سجدوں کو انجام دے اور نماز تمام ہونے کے بعد اس زائد عمل کیلئے دو بار سجدۂ سہو کو بجالائے۔ دُوسرے سجدہ کے دوران یا اس کے بعد اس غلطی کا احساس ہو تو نماز باطل ہے اور اسے دوبارہ انجام دینا واجب ہے۔

مسئلہ: 220 حالتِ عذر میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں بھی رکوع میں اتنا جھکنا ضروری ہے جتنا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی صورت میں واجب ہے کیونکہ جہاں تک ہو سکے، بدل کو اصل کی مانند ہونا چاہیئے تا کہ اس کو بدل کہا جا سکے۔

سجود

سجدہ کی حالت، مکمل طور پر خاک پر گر جانے اور پیشانی کو زمین پر رکھ دینے کی حالت، جو کہ خضوع کی اعلیٰ ترین صورت ہے، بارگاہِ حضرتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے مختص ہے۔ سجدہ، اللہ کے علاوہ کسی اور کیلئے کسی صورت میں جائز نہیں ہے، حتیٰ کہ جنابِ رسولِ خداؐ اور آئمہ معصومین علیہم اجمعین کو بھی احترام کی نیت سے سجدہ کرنا حرام اور عبادت کی نیت سے شرک ہے۔ فرشتوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت آدم علیہ السلام کیلئے جو سجدہ کیا تھا، اس میں مسجود وہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور آدم علیہ السلام جیسا معلم مقرر کرنے پر اللہ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر تھا۔ اس کی تفصیل ہم نے تفسیر الفرقان میں بیان کی ہے۔

مؤمن کی معراج نماز میں سب سے پہلے تکبیرۃ الاحرام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر شے اور ہر کام کی طرف توجہ کو اپنے اُوپر حرام کرتے ہیں۔ پھر منظّم طور پر قبلہ رُو کھڑے ہو کر حمد اور سورۃ کی تلاوت کے ذریعے کمالِ بندگی اور عبودیت کا اقرار کرتے ہیں، پھر اس اقرار کو عملی جامہ پہناتے ہوئے رکوع کرتے ہیں جو خدا کی بارگاہ سے مختص خضوع کی پہلی اور نمایاں صورت ہے۔ مگر اس کے باوجود چونکہ یہ ناکافی ہے، لہٰذا حکم ہے کہ دوبارہ حالتِ قیام کو اختیار کریں اور پھر سجدہ میں جائیں جو کہ عاجزی و خاکساری کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔

سجدہ میں ہم اپنی انسانیت کے مرکز، اپنی پیشانی سمیت اپنے تمام اعضاء دونوں ہاتھوں، دونوں زانوؤں اور دونوں پیروں کو، جن کی مدد سے ہم ہر کام کرتے ہیں، پست ترین موجود یعنی زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ ان سات اعضاء کو خاک پر رکھ کر جہنم کے سات دروازوں کو اپنے اُوپر بند کر دیتے ہیں۔ نماز کے معراج المؤمن ہونے کا راز یہی ہے کہ نماز میں مؤمن کا ظاہر و باطن اور تمام احوال و اقوال و افعال حضرتِ اقدسِ الٰہی کی بارگاہ کی جانب عروج کر رہے ہوتے ہیں اور جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام سے منقول ہے، یہ دو سجدے اور ان سے اُٹھنا اس آیتِ قرآنی کی عملی تفسیر ہیں:

"مِنۡهَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَفِیۡهَا نُعِیۡدُکُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَةً اُخۡرٰی". (55:20)

''اسی (خاک) میں سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور تم کو اسی میں لوٹائیں گے اور اسی میں سے ایک بار پھر تم کو نکالیں گے''۔

یقیناً اے پالنے والے! تو نے ہمیں اسی خاک سے پیدا کیا۔ یہ پہلے سجدہ کی رمز ہے۔ پہلے سجدہ سے اُٹھنے کی رمز ہے، اسی خاک سے تو نے ہمیں نکالا، یہ دونوں ''مِنۡهَا خَلَقۡنٰکُمۡ'' میں پوشیدہ ہیں۔ دُوسرا سجدہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بارِ الٰہا! تو ہمیں پھر اسی خاک میں لوٹائے گا۔ دُوسرے سجدے سے اُٹھنا یہ رمز اپنے ساتھ لئے ہوئے کہ یا اللہ! تو پھر ہمیں اسی خاک میں سے باہر نکالے گا۔

رکوع کے برخلاف سجدہ نماز سے مختص نہیں ہے۔ پس ہر سجدہ، چاہے سجدۂ تلاوت، سجدۂ شکر یا کوئی بھی سجدہ ہو، جو بارگاہِ ربوبیت کے احترام اور عبودیت کے پیش نظر کیا جائے، عبادت ہے۔

سجدہ کے احکام

مسئلہ: 221 رکوع سے اُٹھنے کے بعد دو سجدے واجبِ رُکنی ہیں اور ان دونوں میں سے ہر سجدہ واجبِ غیر رُکنی ہے۔ پس دونوں سجدوں کو ترک کرنے یا دو زائد سجدے انجام دینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: 222 سجدے کا بنیادی رُکن، پیشانی کو خاک پر رکھنا، واجب ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ہتھیلیاں، دونوں زانو (گھٹنے) اور دونوں پیروں کے انگوٹھے زمین پر رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ نص میں بھی آیا ہے، بہتر ہے کہ ناک کو بھی خاک پر رکھا جائے کہ یہ بذاتِ خود کمالِ خضوع کی نشانی ہے کہ اس عظیم معراج میں تم اپنی پیشانی کے ساتھ ناک کو بھی خاک پر رکھ دو، اس لئے کہ تم اس خاک میں لوٹائے جاؤ گے۔ پس زندگی کے ہر شعبے میں اپنے خالق کے سامنے خاکساری اختیار کرو۔

مسئلہ: 223 سجدہ کا ذکرِ واجب بھی انہی شرائط کے ساتھ واجب ہے جن کی تفصیل رکوع میں گزر چکی ہے، سوائے اس کے کہ سجدہ میں **سبحان ربی العظیم وبحمدہ** کی بجائے **سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ** کہنا زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ سجدہ میں اعلیٰ درجہ کی تعظیم ہوتی ہے۔

رکوع کی طرح سجدہ میں بھی ذکرِ واجب کی کم از کم حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ سبحان اللہ یا کوئی اور ذکر ضرور کیا جائے۔

مسئلہ: 224 رکوع کے تمام واجبات، سوائے اُن کے جو رکوع سے مختص ہیں، حالتِ سجدہ میں بھی موجود ہیں۔ یہ بھی واجب ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان اور سکون سے بیٹھے تا کہ "**مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى**" صحیح طور پر عملی جامہ پہن سکے کہ "ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور ایک بار پھر اسی میں سے تمہیں نکالیں گے۔(55:20)

یہ دو سجدے اس قرآنی ارشاد کا حقیقی اور ادیبانہ نقشہ ہیں کہ جس خاک سے تمہیں پیدا کیا گیا ہے، اسی پر اپنے خالق کو سجدہ کرو۔

پہلے سجدہ سے اُٹھنے کے بعد دُوسرا سجدہ دوبارہ اسی مٹی میں لوٹائے جانے کو نمایاں کرتا ہے اور دُوسرے سجدے کے بعد اُٹھنا قیامت کے دن قبر سے اُٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ: 225 سجدہ کے ذکرِ واجب میں ساتوں اعضاء کا سکون کی حالت میں زمین پر رکھا جانا واجب ہے۔

مسئلہ: 226 چونکہ سجدہ کا بنیادی رُکن یہ ہے کہ پیشانی کو زمین پر رکھا جائے، لہٰذا سجدہ کے ذکرِ واجب سے پہلے سہواً سر سجدہ سے اُٹھالے تو وہ ایک سجدہ شمار ہوگا اور اس کے بعد سیدھے بیٹھ کر دُوسرا سجدہ ادا کرے۔ لیکن اگر دُوسرے اعضاء میں سے کسی کو سہواً ذکرِ واجب سے پہلے زمین سے اُٹھا لے تو اسے زمین پر رکھ کر سجدہ کے ذکرِ واجب کا پڑھنا ضروری ہے۔

مسئلہ: 227 زانو اور پیروں کے انگوٹھے رکھنے کی جگہ سجدہ کی جگہ سے چار اُنگلیوں سے زیادہ اُونچی یا نیچی نہ ہو، البتہ اگر یہ اُونچائی یا پستی زمین کے تدریجی نشیب یا بلندی کی وجہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ یہ شرط دُوسرے اعضاء میں نہیں ہے کہ اگر ہاتھ سجدہ کی جگہ سے اُونچے یا نیچے ہوں تو سجدہ درست ہے، بشرطیکہ سجدہ کی صورت برقرار رہے۔

مسئلہ: 228 سجدہ میں پیروں کے انگوٹھوں کے سروں کا زمین پر لگنا واجب نہیں ہے بلکہ ان کی پشت یا اندرونی حصہ بھی زمین پر ہو تو کافی ہے۔ اگرچہ سروں کا زمین پر ہونا بہتر ہے، کیونکہ دلیل کی رُو سے انگوٹھوں کا زمین پر ہونا واجب ہے، نہ کہ ان کے سروں کا۔

مسئلہ: 229 اگر زمین پر پیشانی رکھنے کے بعد غیر اختیاری طور پر پیشانی زمین سے اُٹھ جائے اور غیر اختیاری طور پر دوبارہ سجدہ میں سر چلا جائے تو ان دونوں کو ایک ہی سجدہ شمار کیا جائے گا۔ اگر ممکن ہو تو دوبارہ سر سجدے میں نہ رکھے بلکہ پہلی دفعہ کو ہی ایک سجدہ شمار کرے اور سیدھا بیٹھنے کے بعد دُوسرا سجدہ کرے۔ اگر پہلے سجدے کا ذکرِ واجب نہ کہا ہو تو نماز کے بعد دو سجدے سہو کیلئے انجام دے۔

ایسی چیزیں جن پر سجدہ صحیح ہے

مسئلہ: 230 زمین اور جو کچھ اس کے اُوپر ہے، چاہے معدنیات ہوں یا نباتات، اگر پاک ہوں تو ان پر سجدہ کرنا کلی طور پر جائز ہے، جیسا کہ حدیثِ نبویؐ میں آیا ہے:

"جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا".

"زمین کو میرے لئے سجدہ کی جگہ اور طہارت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے"۔

روایات میں صرف کھانے اور پہننے کی چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے کہ ان پر سجدہ جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: 231 زمین کی پیداوار صرف درخت اور پودے ہی نہیں ہیں بلکہ معدنیات بھی زمین

کی پیداوار ہیں، لہٰذا نباتات میں داخل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کم از کم زمین میں ضرور داخل ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں معدنیات، جو زمین کا جزو ہیں، زمین کے دیگر اجزاء کی طرح سجدہ گاہ ہیں، ان پر سجدہ کرنا درست ہے، سوائے اُن معدنیات کے جو قیمتی ہیں اور پہنی جاتی ہیں جیسے سونا، چاندی، عقیق، فیروزہ وغیرہ۔ یہ ملبوسات میں شامل ہیں، لہٰذا ان پر سجدہ جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: 232 کیا ہر قیمتی چیز اُن چیزوں میں سے ہے جن کو سجدہ گاہ ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب مثبت ہو تو پھر پتھر اور مٹی پر بھی سجدہ درست نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ بھی قیمت رکھتی ہیں۔ پس زمین کے وہ اجزاء جو کھانے اور پہننے کے کام آتے ہیں اور سب لوگ ان میں رغبت رکھتے ہیں، صرف یہی سجدہ گاہ ہونے سے مستثنیٰ ہیں یعنی صرف انہی پر سجدہ درست نہیں ہے۔

مسئلہ: 233 آیا گچ، چونا اور پکی ہوئی مٹی یعنی اینٹ وغیرہ پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ اس لئے کہ یہ احتمال موجود ہے کہ اپنی تبدیلی کی بناء پر یہ زمین نہ رہی ہوں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زمین سے مراد زمین ہی ہے، چاہے پختہ ہو، مصنوعی ہو یا غیر مصنوعی۔ علاوہ ازیں چونکہ صرف کھانے اور پہننے والی چیزیں مستثنیٰ ہیں، لہٰذا گچ، چونا اور پکی ہوئی مٹی وغیرہ، جو نہ کھائے جاتے ہوں اور نہ پہنے جاتے ہوں، ہرگز سجدہ گاہ ہونے سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور ان پر سجدہ کرنا صحیح ہے۔

مسئلہ: 234 کیا خوراک اور پوشاک میں یہ شرط ہے کہ موجودہ حالت میں خوراک اور پوشاک کا کام دے سکیں؟

اگر اس سوال کا جواب مثبت ہو تو گندم، کپاس، اُون اور کتان جیسی چیزیں استثناء سے خارج ہوں گی اور ان پر سجدہ کرنا درست ہوگا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خوراک اور پوشاک سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے خوراک اور

پوشاک کہا جاسکتا ہو، چاہے موجودہ حالت میں ان سے یہ کام نہ لیا جاسکتا ہو۔ روایات میں رُوئی اور کتان کو پوشاک ہونے کی وجہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اگرچہ موجودہ حالت میں انہیں ہرگزنہیں پہنا جاسکتا۔

مسئلہ: 235 کیا قالین اور دری جیسی چیزیں، جو کسی بھی حالت میں پوشاک کا کام نہیں دے سکتی ہیں، ان پر سجدہ جائز ہے یا نہیں؟

چونکہ روایاتِ معتبرہ میں صرف خوراک اور پوشاک کا استثناء کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ دُنیا کی معبود ہیں جیسا کہ صحیحہ ہشام میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور صحیحہ زرارہ میں تارکول، لباس، حیوان کے اعضاء، اُون، کھانے والی اشیاء، پھل اور پروں وغیرہ کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے کہ ان میں سے بعض خوراک اور بعض پوشاک کے زمرہ میں آتی ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ جو چیزیں خوراک کے زمرہ میں آتی ہیں یا جو پوشاک کہلاتی ہوں، جن میں تمام جواہر بھی داخل ہیں، صرف وہی مستثنیٰ ہیں۔

مسئلہ: 236 زمین اور ہر وہ چیز جو زمین سے ہے، اس پر سجدہ کرنا جائز ہے۔ اس سے جو چیزیں یقینی طور پر مستثنیٰ ہیں، وہ خوراک اور پوشاک ہیں، چاہے موجودہ حالت میں کھانے کے قابل ہوں یا انہیں معمول کے مطابق خوراک میں تبدیل کیا جاسکتا ہو، چاہے موجودہ حالت میں ان سے پوشاک کا کام لیا جاسکتا ہو یا مستقبل میں اس کو لباس میں تبدیل کیا جاسکتا ہو۔ قالین اور دری وغیرہ اس پوشاک کے زمرہ سے خارج ہیں۔ پوشاک سے مراد صرف وہی چیز ہے جو حال یا مستقبل میں پہنی جاسکتی ہو۔

لہٰذا بعض درختوں کے بڑے بڑے پتے سجدہ گاہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور ان پر سجدہ جائز ہے۔ لیکن وہ نائلون کا لباس جو پٹرول سے تیار کیا جاتا ہے، چونکہ حالِ حاضر میں پوشاک کا کام دیتا ہے، لہٰذا اس پر سجدہ جائز نہیں ہے۔ اس کے برعکس کپاس، کتان اور اُون جو حال یا مستقبل میں معمول

کے مطابق لباس کا کام دیتے ہیں، اگر خاکستر میں تبدیل ہو جائیں یا قالین یا دری بن جائیں اور یوں مکمل طور پر لباس و پوشاک کے زمرہ سے خارج ہو جائیں تو اس صورت میں یقینی طور پر ''زمین اور جو کچھ اس سے اُگے'' میں شامل ہیں اور ہرگز ملبوسات میں داخل نہیں ہیں۔

جس طرح پٹرول لمبے اور پیچیدہ مراحل طے کر کے پوشاک میں تبدیل ہوتا ہے لیکن چونکہ لباس میں تبدیل ہونے کیلئے اس کو لمبے اور پیچیدہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، لہٰذا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ پٹرول یا تارکول پوشاک ہیں اور اس پر سجدہ جائز نہیں۔

اسی طرح اگر یہ تین پوشاکیں، اُون، کپاس اور کتان جل کر راکھ ہو جائیں یا قالین یا دری میں تبدیل ہو جائیں تو اس صورت میں اس کو پوشاک میں تبدیل ہونے کے لئے پٹرول اور تارکول کے لمبے اور پیچیدہ راستے سے بھی زیادہ لمبا اور پیچیدہ راستہ طے کرنا ہوگا۔ پٹرول یا تارکول کا لباس میں تبدیل ہونا تو ممکن ہے لیکن قالین اور دری کے متعلق کوئی عقل مند انسان تو درکنار، کوئی سبک مغز اور دیوانہ بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ اسے اُدھیڑ کر اس کے دھاگوں سے کپڑا بنائے۔

بنابرایں یہ بات بہت قوی اور حقیقت کے نزدیک ہے کہ قالین اور دری پر سجدہ کرنے میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ یہ قیمتی اشیاء ہیں اور حدیث کی رُو سے اہل دُنیا کی معبود ہیں، لہٰذا ان پر سجدہ نہیں کیا جا سکتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس اعتراض کے بہت سے توڑ اور رَد موجود ہیں، اس لئے کہ بہت سی ایسی قیمتی چیزیں بھی ہیں جن پر سجدہ کرنا صحیح ہے۔ مثال کے طور پر قیمتی لکڑی پر سجدہ کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف اور شک نہیں ہے، حالانکہ اس اعتراض کی رُو سے اس پر بھی سجدہ جائز نہیں ہونا چاہیئے۔

بہرصورت صرف اُن بیش قیمت چیزوں پر سجدہ درست نہیں ہے جو خوراک یا پوشاک ہوں۔ معبودِ اہل دُنیا ہونا حکمتِ مانع ہے، علت نہیں ہے۔ یہ حکمت چونکہ خوراک اور پوشاک میں نمایاں ہے، لہٰذا نصوص میں ان دو کے ذکر پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

مسئلہ: 237 جو چیزیں عام طور پر خوراک اور پوشاک کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، ان کا حکم معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن جو چیزیں عام طور پر کھائی یا پہنی نہیں جاتی ہیں بلکہ بعض حالات میں مثلاً جڑی بوٹیاں جو بیماری کی حالت میں دوا کے طور پر کھائی جاتی ہیں، ظاہراً سجدہ گاہ ہونے سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور ان پر سجدہ صحیح ہے۔ اگرچہ احتیاط یہ ہے کہ صرف خوراک کا صادق آنا ہی ممانعت کیلئے کافی ہے۔

مسئلہ: 238 انگور کے تازہ پتے پر ظاہراً سجدہ جائز ہے مگر یہ کہ معمول کے مطابق دُوسری چیزوں کی طرح کھایا جاتا ہو ورنہ تو مٹی بھی بعض لوگ کھاتے ہیں۔ لیکن تربوز اور خربوزہ وغیرہ کے چھلکے پر سجدہ درست ہے، اس لئے کہ یہ ہرگز خوراک کے زمرہ میں نہیں آتے اور مربہ کی صورت میں ان کا کھایا جانا انہیں خوراک میں داخل نہیں کر دیتا۔

مسئلہ: 239 ہر قسم کے کاغذ پر سجدہ کرنا جائز ہے، چاہے کپاس یا اُس کی مانند اشیاء سے بنا ہو یا ان چیزوں سے بنا ہوا ہو جن پر سجدہ کرنا صحیح ہے، اس لئے کہ نص میں کاغذ مطلق ہے اور ہر قسم کے کاغذ کو شامل ہے۔ اگر اس کی اصل پوشاک بھی ہو تو چونکہ کاغذ بن جانے کے بعد وہ پوشاک کے زمرہ سے مکمل طور پر خارج ہو چکی ہے اور اسے دوبارہ پوشاک میں تبدیل کرنا معمولاً ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا قالین اور دری کی طرح اس پر بھی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ: 240 جن چیزوں پر سجدہ درست ہے، اگر اُن میں سے کوئی بھی میسر نہ ہو تو پھر جو چیزیں اُن سے نزدیک تر ہوں، اُن پر سجدہ کرنا چاہئے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو بتدریج بعد والی چیز پر اور پھر ہاتھ کی پشت پر اور اگر یہ بھی نہ ہو تو آخر کار عقیق اور فیروزہ پر سجدہ کرنا چاہئے۔ قالین اور دری جیسی چیزیں جن پر عام حالت میں بھی سجدہ جائز ہے، دُوسری چیزوں پر مقدم ہیں۔

مسئلہ: 241 اگر پہلے سجدے میں سجدہ گاہ پیشانی سے چپک جائے تو دُوسرے سجدہ کیلئے اس کو پیشانی سے الگ کر کے زمین پر رکھنا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ نمازی کا فریضہ صرف یہ ہے کہ اُس کی پیشانی سجدہ میں ایسی چیز پر ہو جس پر سجدہ کرنا جائز ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سجدہ کرتے وقت

اس پر رکھی جائے۔ بہرصورت اطلاقِ دلیل کی رُو سے دُوسرا سجدہ صحیح ہے اور سجدہ صحیح سجدہ گاہ پر واقع ہوا ہے۔

مسئلہ: 242 اگر نماز کے دوران سجدہ گاہ کھو جائے اور اُسے یا اس کی مثل کو حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو نماز صحیح ہے۔ اس صورت میں مسئلہ 240 پر عمل کرنا ہوگا۔

مسئلہ: 243 سجدہ گاہ کیلئے پاک اور مباح ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی ایسی مجبوری کی وجہ سے جو اس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہ ہو، پاک اور مباح سجدہ گاہ میسر نہ ہو تو ناپاک یا غیر مباح سجدہ گاہ پر ہی سجدہ کرنا چاہئے اور نماز درست ہے۔

مسئلہ: 244 اگر غیر اختیاری طور پر یا غلطی سے یا سہو کی وجہ سے ایسی چیز پر پیشانی رکھ دی جائے جس پر سجدہ کرنا جائز نہیں تو اس صورت میں یہ سجدہ صحیح ہے۔ باقی سجدوں کیلئے اگر ممکن ہو تو ایسی چیز حاصل کی جائے جس پر سجدہ کرنا صحیح ہے۔ اگر ممکن نہ ہو تو اس کی نماز صحیح ہے، اس لئے کہ سجدہ گاہ کا خوراک یا پوشاک نہ ہونا دُوسری تمام شرائط کی طرح اس صورت میں واجب العمل ہے جب ان پر عمل کرنا ممکن ہو لیکن اگر یہ مجبوری جس کی وجہ سے ایسی چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے جس پر اصل میں سجدہ کرنا جائز نہیں ہے، انسان کی اپنی پیدا کی ہوئی ہو تو پھر اس نماز کو اسی طرح مکمل کرنا چاہئے اور بعد میں صحیح سجدہ گاہ حاصل کر کے نماز کو دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔

تشہد اور سلام

مسئلہ: 245 تشہد میں شہادتین کا کہنا واجب ہے، خواہ معمول کے مطابق ہو، یعنی:

"اشھدان لاالٰہ الاالّٰلہ وحدہٗ لاشریک لہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ".

یا اس مختصر صورت میں ہو:

"اشھدان لاالہ الااللّٰہ واشھدان محمداً رسول اللّٰہ".

اگرچہ پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔ اس شہادت کے بعد پیغمبرؐ اکرم اور ان کی آل پر درود بھیجنا واجب ہے۔

مسئلہ: 246 آخری دو سلاموں میں سے کوئی ایک واجب ہے کہ یا "**السلام علینا وعلیٰ عباداللّٰہ الصالحین**" اور یا "**السلامُ علیکم**" اور اس کے بعد "**و رحمة اللّٰہ وبرکاتہ**" مستحب ہے۔ پس اگر پہلے سلام کے بعد وضو کو باطل کرنے والی کوئی چیز سرزد ہو جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی۔

سلام کی مناسبت سے اس مقام پر سلام کے متعلق اسلام کے عمومی احکام کی مختصر وضاحت کرنا بے جا نہ ہوگا۔

سلام میں اخبار اور دُعا کے دو معنی پائے جاتے ہیں۔ اگر سلام دُعا کے معنی رکھتا ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ اگر خبر ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تمہیں میری طرف سے سلامتی کے علاوہ کچھ پیش نہیں آئے گا۔ اس بنیاد پر مسلمان کو دونوں معانی میں سلام کیا جا سکتا ہے لیکن وہ غیر مسلم جس کے جہنمی ہونے کا یقین ہو، اُس کو صرف اخبار کے معنی میں سلام کرنا صحیح ہے۔ دُعا کے معنی میں اس کو سلام کرنا اگر اللہ تعالیٰ سے اُس کیلئے مغفرت طلب کرنے کے لحاظ سے ہو تو حرام ہے۔

کافر پر سلام کرنا نہ صرف یہ کہ حرام نہیں ہے بلکہ اُس کو اسلام اور ایمان کی طرف راغب کرنے کیلئے اس پر سلام کرنا ضروری ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر کو، جو بت سازوں کا سرغنہ ہونے کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے باپ کی حیثیت بھی رکھتا تھا، سلام کیا اور سلام علیک کہا۔ اس سلام میں اخبار اور دُعا کے دونوں معنی پائے جاتے تھے، اس لئے کہ اس کے اسلام لانے کی اُمید تھی اور اس کے جہنمی ہونے کا یقین ابھی تک حضرت ابراہیمؑ کو حاصل نہ تھا۔ جب یہ یقین حاصل ہو گیا تو اس کے بعد اُنہوں نے اس کیلئے کبھی مغفرت طلب نہ کی۔

سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ اگرچہ سلام کرنے والا بچہ یا غیر مسلم ہو، حتیٰ کہ نماز کی

حالت میں بھی سلام کا جواب دینا واجب ہے لیکن اس صورت میں جواب کے الفاظ سلام کے الفاظ سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں۔

سلام کے متعلق آیہ شریفہ یہ ہے:

"وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا".

"جب تمہیں کوئی تحیت وسلام پیش کیا جائے تو جواب میں اس سے بہتر یا ویسا ہی سلام کرو"۔ (86:4)

پس سلام کے برابر جواب دینا واجب ہے اور اس سے زیادہ مستحب ہے، بشرطیکہ نماز میں نہ ہو، اس لئے کہ نماز میں نماز سے مناسبت رکھنے والی بات کے علاوہ کچھ اور کہنا جائز نہیں ہے اور سلام کے جواب میں واجب پر ہی اکتفا کرنا ضروری ہے۔

نماز کے متعلق جدید مسائل

مسئلہ: 247 اگر کوئی شخص کسی اُفق پر صبح کی نماز پڑھنے کے بعد تیز رفتار طیارے کے ذریعے کسی ایسی سمت پرواز کرے جہاں راستہ میں یا منزل پر پہنچ کر فجر ہو جائے تو صبح کی نماز کو دوبارہ ادا کرنا واجب ہے، اس لئے کہ قرآن الفجر کی رُو سے فجر کی نماز ہر مکلّف پر ہر حال میں واجب ہے۔

مسئلہ: 248 اگر کوئی شخص تیز رفتار طیارے کے ذریعے سورج کی حرکت کی سمت میں سفر کرتے ہوئے چوبیس گھنٹے طلوعِ فجر اور طلوعِ آفتاب کے درمیان رہے تو اس صورت میں چوبیس گھنٹوں کو اس طرح تقسیم کرنا واجب ہے جن میں یومیہ پانچ نمازیں ادا کی جاسکیں۔

مسئلہ: 249 جو لوگ ایسے اُفق پر رہتے ہوں جہاں دن اور رات کا مجموعہ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ ہو، مثلاً چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہو تو اُن کیلئے نماز اور روزہ کا نظام الاوقات مکہ مکرمہ کے

اُفق کوقرار دیا جائے گا،اس لئے کہ یہ اُم القریٰ ہے۔1؎ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

نمازی کا لباس

مسئلہ: 250 نماز گزار کے ظاہری لباس کا باطنی لباس، جو تقویٰ ہے، سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے،اس لئے کہ معراج المؤمن میں عروجِ رُوحی کی طرح

عروجِ بدن کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔بنابرایں نماز کی مقدس وادی میں ''**فاخلع نعلیک**'' یعنیٰ ''اپنے جوتے اُتاردو'' (طٰہٰ:12) کی رُو سے جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے،اس لئے کہ نماز کی مقدس وادی کو وِطور کی مقدس وادی سے کمتر نہیں ہے۔نماز کی مقدس وادی کو وِطور کی مقدس وادی سے کمتر ہو یا اس کے برابر ہو، وادیٔ مقدس ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں جوتے پہننا نماز کی وادیٔ مقدس کے احترام کے خلاف ہے۔

مسئلہ: 251 مرد اور عورت دونوں پر نماز میں شرمگاہوں کا ڈھانپنا واجب ہے، چاہے کوئی

1؎ بشرطیکہ عملی طور پر ایسا ممکن یا آسان ہو۔ہر علاقے کے لوگوں کا ایک نظام الاوقات ہوتا ہے جس کے مطابق وہ اپنے تمام معمولات کو انجام دیتے ہیں۔سکنڈ ینیوین ممالک میں رہنے والے لوگ بھی گھڑی کے مطابق اپنا ایک شب و روز کا نظام رکھتے ہیں۔12am ان کے ہاں آدھی رات کا وقت ہوتا ہے جبکہ 12pm نصف روز کا وقت ہوتا ہے۔ان ممالک کا وقت سعودی عرب سے دو گھنٹے پیچھے ہوتا ہے۔اگر مکہ مکرمہ میں انتہائے سحر 5am ہو تو اس وقت ان ممالک میں 3am ہوگا۔اسی طرح اگر مکہ مکرمہ میں افطار کا وقت 7pm ہو تو اس وقت ان ممالک میں وقت 5pm ہوگا۔ممکن ہے ان ممالک کے مسلمانوں کے لئے سحر و افطار کے یہ اوقات اختیار کرنا تکلیف دہ ہو۔ایسے میں ان ممالک کے مسلمانوں کیلئے قابل عمل راستہ یہ ہوگا کہ جس دن مکہ مکرمہ میں یکم رمضان ہو اس دن سے وہ ماہ رمضان کا آغاز کریں اور اگر مکہ مکرمہ میں سحر و افطار کے اوقات 5am سے 7pm تک ہوں تو وہ اپنے نظام الاوقات کے مطابق 5am سے 7pm تک روزہ رکھیں۔لیکن یہ بھی واجب نہیں ہے۔ان ممالک کے مسلمان am سے pm تک کا کوئی بھی 13 سے 14 گھنٹے کا وقفہ روزے کے لئے مخصوص کر سکتے ہیں۔(ہمدانی)

دیکھنے والا موجود ہو یا تنہائی میں ہوں۔ علاوہ ازیں عورت پر یہ بھی واجب ہے کہ نماز میں اُس کا لباس وہی ہو جو نامحرم کے سامنے ہونا چاہیئے، اس لئے کہ یہی لباس اُس کیلئے مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے کہ:

"خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" (31:7)

"ہر سجدہ کے وقت اپنی زینت کو ساتھ لئے رہو"۔

چونکہ حجاب عورت کی زینت ہے، لہٰذا نماز میں اُسے ساتھ رکھنا اس آیت کی رُو سے اُس پر واجب ہے۔ مردوں کیلئے بھی ضروری ہے کہ نماز میں ایسا لباس پہنیں جو معراج المؤمن کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ بنابرایں مردوں کو نماز میں بہترین لباس پہننا چاہیئے یا کم از کم ایسا لباس پہننا چاہیئے جو موجبِ اہانت نہ ہو۔ 1

مسئلہ: 252 اگر نمازی کا لباس اس قدر کھلا اور کشادہ ہو کہ وہ خود اپنی شرمگاہ دیکھ سکتا ہو تو اس کی نماز صحیح ہے، بشرطیکہ دُوسرے نہ دیکھ سکیں، اس لئے کہ شرمگاہوں کو ڈھانپنے کی دلیل کی رُو سے دُوسروں سے چھپانا واجب ہے، اپنے آپ سے نہیں۔

مسئلہ: 253 مردہ حیوان یا حرام گوشت حیوان کی کھال وغیرہ میں نماز صحیح نہیں ہے۔ اگر نماز گزار کو علم نہ ہو کہ یہ کھال وغیرہ حرام گوشت حیوان کی ہے یا حلال گوشت جانور کے میتہ کی ہے یا ایسے

---

1 چونکہ نماز میں زینت کے ساتھ شرکت کرنا واجب ہے لہٰذا تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی یا پلاسٹک کی بنی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے اس لئے کہ یہ خلافِ زینت ہے۔ پتلون یا شلوار کے پائینچے اُوپر کی طرف موڑ کر نماز پڑھنے کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ یہ خلافِ زینت ہے۔ آپ نے آج تک کسی شخص کو نہیں دیکھا ہو گا جو سر پر تنکوں یا پلاسٹک کی ٹوپی پہن کر اور پائینچے اُوپر کی طرف موڑ کر کسی بڑے شخص سے ملنے جا رہا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہوتے وقت ایسا مضحکہ خیز اور خلافِ زینت انداز اختیار کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے ؟ (ہمدانی)

حیوان کی جو حلال گوشت اور شرعی طریقے پر ذبح کیا گیا ہے تو اس کی نماز صحیح ہے، اس لئے کہ آیت اور احادیث کی رُو سے یہ شرط ہے کہ یہ علم نہ ہو کہ میتہ کے اجزاء میں سے ہے۔

پس اگر اس کے میتہ ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو تو یہ صورت نہی اور ممانعت کی حد سے باہر ہے اور بعض معتبر احادیث میں میتہ ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو تو حرام نہیں۔

مسئلہ: 254 میتہ سے مراد ہر وہ حیوان یا اُس کا جزو ہے جو یا حرام گوشت ہو، چاہے زندہ ہو یا مردہ، یا زندہ حلال گوشت جانور سے جدا کیا گیا ہو یا اُسے غیر شرعی طریقے پر ذبح کیا گیا ہو یا خود بخود مر گیا ہو۔ ان میں سے کسی کا بھی نماز گزار کے ساتھ ہونا حرام اور موجب بِطلانِ نماز ہے۔

مسئلہ: 255 نماز گزار کے لباس کی شرائط میں یہ بھی ہے کہ وہ پاک ہو اور غصبی نہ ہو۔

اگر اس کے ناپاک یا غصبی ہونے کا علم ہو تو نماز باطل ہے مگر یہ کہ ایسی اضطراری حالت میں ہو جو نماز گزار نے اپنے ارادہ اور اختیار سے پیدا نہ کی ہو، اس لئے کہ قرآن شریف کی رُو سے صرف ایسے عذر کو قابل قبول قرار دیا گیا ہے جو ''مَا اضْطُرِرْتُمْ'' یعنی ''تم اضطرار میں ڈال دیئے جاؤ'' کا مصداق ہو، نہ یہ کہ خود اپنے آپ کو مضطر بنا دو۔ آیہ شریفہ:

''اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ''.

''یقیناً نماز فحش کاموں اور منکرات سے روکتی ہے''۔(45:29)

سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قسم کی برائی نماز کو نماز نہیں رہنے دیتی۔ نتیجہ یہ کہ غصبی لباس اور مکان میں نماز پڑھنا اور اسی طرح دیگر محرمات، جو نماز میں انجام پائیں، حرام ہیں اور ایسی نماز درحقیقت نماز ہی نہیں ہے۔ نماز کے برائی سے روکنے کے کم از کم معنی یہ ہیں کہ یہ حالتِ نماز میں برائی سے روکتی ہے۔

مسئلہ: 256 اگر نماز گزار کے ہمراہ ایسی ناپاک چیز ہو جو ستر عورتین (یعنی دونوں شرمگاہوں کو چھپانے) کیلئے کافی نہ ہو تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ صرف ایسی ناپاک چیز کا نمازی کے ہمراہ

ہونا ممنوع ہے اور نماز کو باطل کرتا ہے جو ستر عورتین کیلئے کافی ہو۔

مسئلہ: 257 نماز میں خالص اور اصلی ابریشم کا لباس مرد کیلئے ممنوع ہے، جیسا کہ نماز کے علاوہ بھی ممنوع ہے، سوائے ایسی مجبوری و ناچاری کے جو اُس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہ ہو یا حالتِ جنگ میں ہو کہ مرد پر صرف جنگ میں حریر کا لباس پہننا جائز ہے، نہ کہ اس میں نماز پڑھنا۔

نماز گزار کا مکان

مسئلہ: 258 نماز گزار کے مکان کا مباح ہونا ضروری ہے۔ اگر غصبی ہو تو ظاہراً اُس کی نماز باطل ہے مگر یہ کہ ایسی مجبوری اور اضطرار کی حالت ہو جو اُس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہ ہو، اس لئے کہ:

''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ''.

''یقیناً نماز فحش کاموں اور منکرات سے روکتی ہے''۔(45:29)

کم از کم نماز کی حالت میں نماز تمام منکرات سے سختی سے روکتی ہے اور نماز کے ساتھ کسی بھی قسم کی برائی اس کو نماز ہونے سے خارج کر دے گی۔

نماز کو باطل کرنے والی دُوسری چیزیں

مسئلہ: 259 اگر نماز کی حالت میں ارادی یا غیر ارادی طور پر کوئی ایسی چیز سرزد ہو جائے جو وضو کو باطل کر دیتی ہو تو دونوں صورتوں میں نماز باطل ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو سلس البول یا اس جیسی بیماری میں مبتلا ہوں اور ان کے پاس نماز ادا کرنے کیلئے اور کوئی وقت بھی نہ ہو تو وہ حالتِ اضطرار کے حکم پر عمل کریں۔

مسئلہ: 260 اگر نماز کے دوران تقیہ کے بغیر، جزوِ نماز ہونے کی نیت سے واجب یا مستحب سمجھ کر ہاتھ باندھ لئے جائیں تو نماز باطل ہے لیکن اگر ایسا کوئی مقصد پیش نظر نہ ہو تو پھر نماز باطل ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مسئلہ: 261 اگر نمازی ایک لمحہ کیلئے بھی قبلہ سے عمداً روگردانی کرے تو اُس کی نماز باطل ہے۔

مسئلہ: 262 نماز کے دوران سر کو اتنا گھمانا جس سے یہ کہا جائے کہ قبلہ سے منحرف ہو گیا ہے، نماز کو باطل کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو نماز باطل نہیں ہوتی، اگر چہ یہ سر گھمانا ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔

مسئلہ: 263 اگر نماز گزار نماز کے دوران اپنے ہاتھ پاؤں یا دیگر اعضاء کو اس طرح حرکت دے جس سے وہ نماز کی حالت سے باہر نکل جائے تو اُس کی نماز باطل ہے اور اسے دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ بہرصورت ہر وہ چیز جو نماز کی شکل کو بگاڑ دے یا واجباتِ نماز میں سے بعض واجبات کو ضائع کر دے یا نماز کے دوران کسی بھی حرام فعل کے انجام دینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے، سوائے ایسے عذر کی حالت کے جو قابل قبول ہو۔

وہ واجبات جنہیں نماز کی حالت میں انجام دینا واجب تو ہے لیکن انہیں ترک کر دینے سے ظاہراً نماز باطل نہیں ہوتی، سلام کا جواب دینا اُن میں سے ایک ہے کہ جس طرح اسے سلام کیا جائے، اس پر بھی اتنا ہی جواب دینا واجب ہے، نہ اس سے زیادہ اور نہ کم۔

مسئلہ: 264 اگر نماز کے دوران کھانے پینے سے نماز کی شکل اس طرح دگرگوں ہو جائے کہ اسے نماز نہ کہا جا سکتا ہو تو اس سے بھی نماز باطل ہو جاتی ہے اور نماز کے باطل ہو جانے کی وجہ کھانا پینا نہیں بلکہ نماز کی صورت کا بگڑ جانا ہے ورنہ اس بارے میں کوئی نص موجود نہیں۔

مسئلہ: 265 نماز کے ارکان میں سے کسی رُکن کی کمی یا اضافہ سے نماز باطل ہو جاتی ہے، سوائے ایسے اضافہ کے جو جماعت کے دوران امام کی اتباع کی وجہ سے رُونما ہو۔ لیکن رُکن کی کمی سے بہرصورت نماز باطل ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: 266 اگر عمداً نماز کے دوران ایسی بات کی جائے جو نماز کا ذکر نہ ہو یا نماز سے مناسبت نہ رکھتی ہو تو اس سے بھی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اگر چہ معذور ہو، چاہے وہ بات ایک حرف ہو

یا دو حروف یا زیادہ۔ اہم یہ ہے کہ وہ بات بامعنی ہو، نہ کہ بے معنی اور مہمل۔

مسئلہ: 267 نماز کے دوران قہقہہ لگانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے، چاہے قہقہہ ہنسی میں ہو یا رونے میں۔ لیکن اگر رونا خوفِ خدا سے ہو تو نماز باطل نہیں ہوتی اور غیر خدا کیلئے بغیر آواز کے رونا بھی نماز کو باطل کر دیتا ہے۔

مسئلہ: 268 جن مقامات پر سجدۂ سہو کو واجب کہا گیا ہے، اُن میں سے ایک بے جا کلام ہے، اگر چہ سہواً کلام کرنے کی وجہ سے سجدۂ سہو کے وجوب پر کوئی معتبر دلیل موجود نہیں ہے۔ اسی طرح نماز کے مکمل ہونے سے قبل سلام کہہ دینا۔ ظاہراً نماز میں ہر قسم کی کمی یا اضافہ یا تقدم و تاخر کی وجہ سے نماز کے بعد دو سجدے سہو کیلئے انجام دینے ضروری ہیں لیکن ارکانِ نماز میں کمی یا اضافہ ہو جائے تو سجدۂ سہو سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ: 269 اگر دو رکعات یا تین رکعات نماز یا چار رکعات نماز کی دو رکعتوں میں شک کی حالت اتنی دیر تک باقی رہے جس سے نماز کی صورت برقرار نہ رہے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں واجب ہے کہ غور و فکر کے ذریعے شک کو برطرف کیا جائے یا نماز کی حالت سے خارج ہو جائے۔ یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ شک کے رُونما ہوتے ہی نماز کو باطل کر دیا جائے۔

مسئلہ: 270 کسی اضطراری حالت کے بغیر نماز کو باطل کرنا حرام ہے، کیونکہ:

"**وَلَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَكُمۡ**". (47:23)

"اپنے اعمال کو باطل نہ کرو"۔

تمام اعمال کے متعلق ہے اور نماز تو افضل الاعمال ہے۔

اگر انسان کسی بزرگ اور محترم شخص کے سامنے اُس کے حکم کی اتباع میں کوئی فعل انجام دے رہا ہو تو کیا اس صورت میں اس کام کو ادھورا چھوڑ کر اُس کی بارگاہ سے دُور ہو جانا اس بزرگ اور محترم شخص کی اہانت نہیں ہے؟ کائنات میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ عظیم اور محترم ہستی کون ہے اور کس کا حکم اللہ

تعالیٰ کے حکم کی طرح قدر ومنزلت رکھتا ہے؟ پس اُس کی بارگاہ میں اس طرح کی بے حرمتی کیونکر جائز ہوسکتی ہے! اگر ہمارے پاس اعمال کو باطل کرنے کی حرمت پر کوئی نص موجود نہ بھی ہوتی تو یہی عقلی اور فطری دلیل اسے حرام ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔

رکعات میں شک کے مسائل

بنیادی طور پر لازم ہے کہ نماز جو معراج المؤمن اور بارگاہِ اقدسِ الٰہی میں شرفیابی کا ذریعہ ہے، ہر لحاظ سے مکمل توجہ کے ساتھ ادا کی جائے۔ اگر پوری کوشش کے باوجود نماز کے اجزاء اور شرائط کو یاد نہ رکھ سکے اور نماز کی رکعات کی تعداد میں شک میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر کسی اور طریقہ سے نماز کی رکعات کی تعداد کو یاد رکھنا ضروری ہے، چاہے انگوٹھی کو پھیرنے یا سجدہ گاہ یا جائے نماز پر علامات کے ذریعے ہو۔

اگر اندرونی یا بیرونی طور پر نماز کی رکعات کو یاد رکھنا ممکن ہو اور پھر بھی انسان رکعات کے متعلق شک میں مبتلا ہو جائے تو اُس کی نماز باطل ہے۔ شک کی صورت میں مقرر کئے گئے فرائض اس کو کوئی فائدہ نہیں دیں گے، اس لئے کہ اس شخص کیلئے بغیر شک کے نماز پڑھنا ممکن تھا۔ اس کے باوجود لاپرواہی اور بے توجہی کی وجہ سے شک میں مبتلا ہوا۔ بہر حال جب شک سے پاک نماز پڑھنا ممکن ہو تو مشکوک نماز قابل قبول نہیں ہوگی اور حالتِ شک کے فرائض سے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

لیکن کیا کہا جائے کہ بالعموم پیسے گنتے وقت تو تمام توجہات اور حواس متمرکز ہوتے ہیں، کسی بڑی اور محترم شخصیت کے سامنے تو پوری توجہ اس طرف مبذول ہوتی ہے کہ کہیں کوئی خلافِ ادب حرکت سرزد نہ ہو جائے لیکن نماز کی حالت میں نماز کے مالک کے سوا ہر چیز پر توجہ ہوتی ہے۔

اس مقام پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان تمام باتوں کے پیش نظر ان روایات کی ضرورت ہی کیا ہے جو حالتِ شک کے فرائض کو بیان کرتی ہیں تو جواب یہ ہے کہ یہ روایات اُن لوگوں کیلئے ہیں جو کسی بھی اندرونی یا بیرونی ذریعے سے رکعات کی تعداد کو یاد نہ رکھ سکتے ہوں یا اُن کیلئے یاد رکھنا مشکل

ہو،اس لئے کہ:

یُرِیْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُبِكُمُ الْعُسْرَ (185:2)

''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ مشکل نہیں چاہتا''۔

کی رُو سے اسلام میں کوئی ایسا حکم معین نہیں کیا گیا جو سختی کا باعث ہو۔ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات وظائفِ شک کو انجام دینا رکعات کو یاد رکھنے سے بھی مشکل تر ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ہم رکعات میں شک کے مسائل کو بیان نہیں کریں گے۔ ضرورت پیش آجائے تو ان مسائل میں چنداں اختلاف نہیں ہے اور ہماری رائے میں ان مسائل میں مرحوم و مغفور حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ آقائے بروجردی کے فتاویٰ دُوسرے فقہاء کے فتاویٰ پر برتری رکھتے ہیں۔

دُوسرے واجبات میں شک

مسئلہ: 271 اگر واجباتِ نماز میں سے کسی واجب کا وقت گزر چکا ہو اور نماز گزار نماز کے کسی اور واجب میں مشغول ہو چکا ہو، پھر اب کسی گزشتہ واجب کے انجام دینے یا نہ دینے کے متعلق شک پیدا ہو تو اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ لیکن اگر کسی دُوسرے واجب میں مشغول نہ ہوا ہو تو اس صورت میں اس مشکوک واجب کو انجام دینا واجب ہے۔ مثال کے طور پر اگر سجدہ کے دوران یہ شک ہو کہ رکوع کیا ہے یا نہیں تو اس شک کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی لیکن اگر سجدہ میں جانے سے پہلے یہ شک رُونما ہو تو رکوع کرنا واجب ہے۔ اسی طرح سلام کے بعد کسی قسم کے شک کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔

اگر تعقیبات کے دوران یہ شک ہو کہ سلام کہا ہے یا نہیں تو یہ شک بھی قابلِ توجہ نہیں ہے۔ اس طرح کے دیگر تمام مواقع پر بھی اسی طرح قاعدۂ تجاوز پر عمل کیا جائے گا یعنی اگر آپ کسی عمل یا اس کے وقت سے گزر چکے ہوں اور کسی اور عمل میں مشغول ہوں تو گزشتہ عمل کے متعلق رونما ہونے والا

شک قابل توجہ نہیں ہے۔

ایسے مقامات جن پر نماز کو توڑا جا سکتا ہے

مسئلہ: 272 جو شخص کثیر الشک ہو یعنی بہت زیادہ شک کرتا ہو، کسی بھی صورت میں اپنے شک پر توجہ نہ کرے، گویا اُس نے شک کیا ہی نہیں ہے اور جس طرف کو چاہے، اختیار کرے۔

مسئلہ: 273 کسی عذر کے بغیر اختیاری حالت میں نماز کو باطل کرنا حرام ہے، اس لئے کہ:

”وَلَا تُبْطِلُوٓا اَعۡمَالَكُمۡ“. (33:47)

”اپنے اعمال کو باطل نہ کرو“۔

ایک ایسا ہمہ گیر قرآنی قانون ہے جو تمام اعمال پر جاری ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان معذور ہو تو نماز کو توڑنا جائز اور بعض اوقات واجب بھی ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 274 اگر کسی محترم جان، مال یا آبرو کی حفاظت نماز کو توڑے بغیر ممکن نہ ہو، خصوصاً جبکہ نماز کا وقت بھی کافی ہو تو ایسے مواقع پر، جہاں زیادہ اہم واجب درپیش ہو تو نماز کو توڑنا واجب ہے۔

مسئلہ: 275 اگر قرض خواہ نماز گزار سے اُس کی نماز کے دوران اپنے قرض کا مطالبہ کرے تو اگر اُس کا قرض ادا کرنا ایسا واجب ہو جس کا وقت تنگ ہو کہ اُس کا وقت آن پہنچا ہو اور تاخیر کی گنجائش بھی نہ ہو تو اس صورت میں نماز کو توڑنا شاید جائز بلکہ واجب ہو۔ لیکن اگر ایسی صورتِ حال نہ ہو تو نماز گزار سے اُس کی نماز کے دوران اپنا قرض طلب کرنا حرام ہے۔ نماز گزار پر بھی اس کا جواب دینا حرام ہے اور نماز کو ہرگز نہیں توڑنا چاہیئے، اس لئے کہ:

”وَلَا تُبْطِلُوٓا اَعۡمَالَكُمۡ“. (33:47)

جس طرح اپنے عمل کو باطل کرنے کو حرام کر رہا ہے، اسی طرح دُوسروں کے عمل کو باطل کرنے کو بھی حرام کر رہا ہے۔

مسئلہ:276 **وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ**

''اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔

جیسی آیاتِ مبارکات اور بہت سی روایات کی رُو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز کو باجماعت انجام دینا واجب اور کسی عذر کے بغیر جماعت کو ترک کرنا گناہ ہے۔اسلام کا سیاسی واجتماعی مزاج بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عبادات کو بھی، جو بندے اور خدا کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اجتماعی طور پر انجام دیا جائے۔ جماعت کی کم از کم حد یہ ہے کہ آپ گھر میں ایک ماموم کے ساتھ جماعت قائم کریں لیکن جس قدر جماعت میں افراد کی تعداد زیادہ ہو اور وسیع مقام پر انجام دیا جائے، اُس کا ثواب زیادہ ہوگا۔

مسئلہ: 277 جماعت میں شامل ہونے کی کم از کم صورت یہ ہے کہ امام کے رکوع سے خارج ہونے سے پہلے نمازی رکوع میں چلا جائے۔ یہ ایک رکعت شمار کی جائے گی۔

مسئلہ: 278 ماموم کو اس طرح کھڑا ہونا چاہئے کہ اسے ماموم کہا جاسکے۔ پس اگر امام کے برابر کھڑا ہو تو احتیاط واجب یہ ہے کہ اُس کی نماز کو باجماعت شمار نہ کیا جائے۔

مسئلہ: 279 سطح کے لحاظ سے امام کا ماموم کے برابر یا اُس سے نیچے کھڑا ہونے میں کوئی حرج نہیں۔لیکن اگر امام کے کھڑے ہونے کی جگہ ماموم کی جگہ سے بلند تر ہو تو ظاہراً جماعت صحیح نہیں ہے۔ ہاں! اگر بلندی کم ہو اور عرف میں یہ نہ کہا جاتا ہو کہ امام ماموم سے اُونچا کھڑا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مسئلہ: 280 بہت بہتر اور بجا ہے کہ تمام مامومین اکٹھے اور ایک ساتھ تکبیرۃ الاحرام کہیں۔ اگر اکٹھے نہ بھی کہیں تو آگے کھڑے ہوئے افراد کا تکبیرۃ الاحرام کیلئے آمادہ ہونا اس بات کیلئے کافی ہے کہ پچھلی صف کے نمازی اگلی صف والوں سے پہلے تکبیرۃ الاحرام کہیں۔

مسئلہ: 281 ماموم کو امام کے برابر یا اُس سے آگے نہیں کھڑا ہونا چاہئے۔لیکن مسجد الحرام

میں، جہاں نمازیوں کی صفیں کعبہ کے گرد ہوتی ہیں، صفوں کے دائرہ کی شکل میں ہونے کی وجہ سے ظاہراً جماعت کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مسئلہ: 282 نمازِ جماعت کی موجودگی میں اگر کوئی یوں نماز ادا کرے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جماعت کے ساتھ اپنی نماز ادا نہیں کر رہا یا جماعت کی اہانت اور امام کی تفسیق کا موجب ہو تو اُس کی نماز باطل ہے، اس لئے کہ یہ ایک برا کام ہے اور منکرات میں سے ہے جبکہ صحیح نماز قرآنی آیات کی رُو سے نماز گزار کو منکرات سے روکتی ہے۔ پس اس کے ایسا منکر بننے کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے جو جماعت کی اہانت اور امام کی تفسیق کا باعث ہو۔

مسئلہ: 283 جب امام کیلئے حمد اور سورۃ کو بآوازِ بلند پڑھنا واجب ہو تو وہ ماموین جو اُس کی آواز کو سن رہے ہیں، اُن پر واجب ہے کہ مکمل خاموشی کے ساتھ امام کی قرأت کو سنیں اور حمد و سورۃ کی تلاوت یا کوئی اور ذکر اُن پر حرام ہے۔

مسئلہ: 284 جب قرآن شریف پڑھا جا رہا ہو اور اُس کو سننا ممکن ہو تو اس صورت میں خاموشی اختیار کرنا اور قرآن شریف کو سننا واجب ہے۔ یہ حکم صرف نمازِ جماعت سے مختص نہیں ہے، جیسا کہ آیہ شریفہ میں ہے:

"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ". (7:234)

یہ ایک عام حکم ہے کہ "جب قرآن شریف پڑھا جائے تو اس کیلئے ہمہ تن گوش ہو جاؤ اور خاموشی اختیار کرو، شاید تم پر رحم کیا جائے"۔

اس آیہ شریفہ میں دو واجب حکم پائے جاتے ہیں: "فَاسْتَمِعُوْا" یعنی "سنو" اور "وَاَنْصِتُوْا" یعنی "اور خاموش ہو جاؤ"۔ ان دو اوامر کی مخالفت کرنے والوں کو عذاب کی دھمکی دی جا رہی ہے، اس لئے کہ ان کی اتباع کی صورت میں "لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (تاکہ تم پر رحم

کیا جائے) کہا گیا ہے۔ان کی مخالفت کی صورت میں رحمت کی یہ بشارت اُٹھ جاتی ہے اور اس کی جگہ عذاب کی دھمکی لے لیتی ہے اور یہ معمولی عذاب نہیں بلکہ ایسا عذاب ہے جس کے ساتھ رحمت کا امکان ہی نہیں ہے۔

مسئلہ: 285 اگر امام کی آواز ماموم تک نہ پہنچ رہی ہو یا امام ظہر اور عصر کی نماز کی حمد اور سورۃ پڑھ رہا ہو تو ماموم پر حمد اور سورۃ کا پڑھنا واجب ہے، اس لئے کہ حمد و سورۃ کی قرأت صرف اُس صورت میں ماموم سے ساقط ہے جب وہ امام کی آواز سن رہا ہو۔

نمازِ قضا

مسئلہ: 286 ہر واجب نماز جو عمداً یا سہواً فراموشی یا کسی اور وجہ سے مقررہ وقت پر ادا نہ کی گئی ہو، اُسے اوّلین فرصت میں انجام دینا واجب ہے۔قرآن مجید سے اس کی دلیل یہ آیت ہے:

"اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ".

جس کے معنی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "جب تمہیں میری یاد آئے، نماز قائم کرو"، اس لئے کہ نماز خدا کو فراموش کرنے کی وجہ سے چھوٹ جاتی ہے۔پس جب خدا کی یاد آئے، چاہے نماز کے وقت میں ہو یا وقت گزر جانے کے بعد، اس نماز کا بجالانا واجب ہے۔

مسئلہ: 287 اگر نماز کے ترک ہو جانے کی وجہ کوئی ایسی حالت ہو جس میں نماز واجب نہیں ہوتی اور ایسی حالت کو پیدا کرنے میں اُس کا اپنا قصور بھی نہ ہو تو اس پر قضا بھی واجب نہیں ہے۔مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نماز کے پورے وقت کے دوران بیہوش ہو تو بعد میں ہوش میں آنے کے بعد اُس پر قضا واجب نہیں ہے۔لیکن نشہ کی حالت، جو نماز کے وجوب کو ساقط نہیں کرتی بلکہ صرف اُسے ادا کرنے سے مانع ہوتی ہے، اگر نماز کے تمام وقت کے دوران برقرار رہے تو نشہ کی حالت برطرف ہونے کے بعد نماز کی قضا واجب ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مستی اور نشہ کی حالت میں نماز حرام ہے لیکن چونکہ نماز کا وجوب

بھی برقرار ہے اور نشہ کی حالت بھی اس کی اپنی ایجاد کی ہوئی تھی، لہٰذا اس صورت میں نماز کا فوت ہونا صادق آتا ہے۔ چونکہ جان بوجھ کر نشہ کی یہ حالت پیدا کر کے ترکِ نماز کا موجب ہوا ہے، لہٰذا اس کے قاعدہ کے تحت نہیں آتا کہ:

''كُلَّمَا غَلَبَ اللّٰهُ عَلَى الْعَبْدِ فَهُوَ اَعْذَرُ لَهُ''.

''جب بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر غالب ہو تو وہ معذور ہے''۔

بلکہ صرف وہی حالت اس قاعدہ کے تحت آتی ہے جو انسان کے اختیار میں نہ ہو۔ بنابرایں اگر کوئی شخص بیدار ہونے کے امکان کے باوجود نماز کے تمام وقت کے دوران سویا رہے تو اس پر قضا واجب ہے۔ لیکن اگر اُس کی نیند مکمل طور پر اُس کے اختیار سے باہر ہو تو یہاں مذکورہ بالا قاعدہ صادق آتا ہے اور ظاہراً اس صورت میں قضا واجب نہیں ہے۔ نماز کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہے جب انسان اپنے اختیار سے ترکِ نماز کا موجب ہو۔

مسئلہ: 288 فوت شدہ نمازوں کی قضا کو اسی ترتیب کے مطابق بجالانا چاہئے جس طرح وہ فوت ہوئی ہوں اور موجودہ وقت میں جب تک موجودہ نماز کو ادا کرنے کی یقینی فرصت باقی ہو، فوت شدہ نمازوں کی قضا کو بجالانا مقدم ہے۔ لیکن اگر فوت شدہ نمازوں کی قضا کو بجالانے کی صورت میں موجودہ نماز کے فوت ہو جانے کا عقلی احتمال موجود ہو تو موجودہ نماز کو ادا کرنا فوت شدہ نمازوں پر مقدم ہے۔

مسئلہ: 289 اگر انسان کا عذر اس وقت برطرف ہو جائے جب صرف ایک رکعت کا وقت باقی رہ چکا ہو تو نماز کو ادا کرنا واجب ہے۔ اگر نماز کو ادا نہ کرے تو بعد میں قضا واجب ہے، اس لئے کہ اس نے بغیر کسی عذر کے نماز کو ترک کیا ہے کیونکہ قاعدہ:

''مَنْ اَدْرَکَ رَكْعَةً فَقَدْ اَدْرَکَ كُلَّهَا''.

''جس نے ایک رکعت کو پالیا، اُس نے پوری نماز کو پالیا''۔

کی رُو سے اُس کے پاس پوری نماز کا وقت موجود تھا۔

نمازِ آیات

مسئلہ: 290 سورج گرہن، چاند گرہن اور زلزلہ کی وجہ سے نمازِ آیات ہر صورت میں واجب ہے۔ علاوہ ازیں طوفان، سیلاب اور رعد و برق جیسے ارضی و سماوی حوادث اگر لوگوں کی اکثریت کیلئے خوفناک ہوں تو بھی نمازِ آیات واجب ہے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن کی صورت میں ان کے مکمل طور پر برطرف ہو جانے تک نمازِ آیات کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ باقی موارد میں اسے فوری طور پر انجام دینا حتمی اور یقینی ہے۔

مسئلہ: 291 ان حوادث میں سے ہر ایک کیلئے ایک نمازِ آیات واجب ہے، اگرچہ تکرار کے ساتھ ہو۔ مثال کے طور پر اگر سورج گرہن چند مرتبہ رُونما ہو تو ہر مرتبہ کیلئے ایک نمازِ آیات واجب ہے۔

مسئلہ: 292 نمازِ آیات صرف اُن لوگوں پر واجب ہے جن پر یہ حوادث رُونما ہوں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شہر میں زلزلہ آئے تو دُوسرے شہر کے رہنے والوں پر اُس کی نمازِ آیات واجب نہیں ہے بلکہ اگر ایک شہر کے ایک حصے میں زلزلہ آئے اور دُوسرے حصے میں نہ آئے تو صرف اُس حصے کے لوگوں پر نمازِ آیات واجب ہے جہاں زلزلہ آیا ہے۔

مسئلہ: 293 اگر سورج گرہن یا چاند گرہن کے برطرف ہو جانے کے بعد معلوم ہو کہ گرہن پورے سورج یا پورے چاند پر تھا تو نمازِ آیات کی قضا بجالانا واجب ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ گرہن پورے چاند یا سورج پر نہیں تھا تو اس صورت میں قضا واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 294 اگر انسان کے پاس صرف اتنا وقت ہو جس میں نمازِ یومیہ یا نمازِ آیات میں سے کوئی ایک ہی پڑھ سکتا ہو تو نمازِ یومیہ نمازِ آیات پر مقدم ہے۔ لیکن اگر وقت وسیع ہو تو ان میں کوئی ترتیب نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں واجب ہیں اور تقدم و تاخر کی کوئی بات نہیں ہے۔

مسئلہ: 295 نمازِ آیات صبح کی نماز کی طرح دو رکعات ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ نمازِ آیات میں ہر رکعت میں پانچ رکوع ہیں، اس طرح سے کہ حمد اور مکمل سورۃ کی قرأت کے بعد رکوع کرے یا اس طرح مختصر کرسکتا ہے کہ ہر رکعت میں سورۂ حمد پڑھنے کے بعد ایک سورۃ کو پانچ حصوں میں تقسیم کرے اور ہر حصے کے پڑھنے کے بعد رکوع کرے۔اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ سورۃ تمام ہو جائے اور پانچ رکوع تمام نہ ہوئے ہوں تو یہاں واجب ہے کہ دوبارہ سورۂ حمد اور پھر مکمل سورۃ یا آیت پڑھے اور رکوع کرے تو کافی ہے۔

مسئلہ: 296 جو شرائط یومیہ نمازوں کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہیں، وہ سب نمازِ آیات میں بھی ضروری ہیں۔

نمازِ جمعہ

اپنے رسالہ ''نمازِ جمعہ'' میں ہم نے نمازِ جمعہ کے سیاسی اور احکامی پہلو پر مفصل اور مستدل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ جمعہ بغیر کسی شرط کے واجبِ عینی ہے، سوائے اس ایک شرط کے کہ اگر کسی نمازِ جمعہ کی حدود یعنی ایک فرسخ کے فاصلے پر سات افراد جمع ہوں اور ان میں سے ایک شخص امامت کی صلاحیت رکھتا ہو تو نمازِ جمعہ واجب ہے۔اگر پانچ افراد میں سے کسی ایک میں امامت کی صلاحیت ہو تو نمازِ جمعہ جائز ہے۔

مسئلہ: 297 واجب ہے کہ نمازِ جمعہ کے دونوں خطبے ظہر کی اذان کے بعد دیئے جائیں اور ان کے بعد بلا فاصلہ نمازِ صبح کی مانند دو رکعات نماز ادا کی جائے جس میں مستحب ہے کہ پہلی رکعت میں حمد اور سورۃ کی قرأت کے بعد اور رکوع سے پہلے دُعائے قنوت پڑھی جائے اور دُوسری رکعت میں رکوع کے بعد دُعائے قنوت پڑھی جائے۔

مسئلہ: 298 چونکہ دو خطبے اور دو رکعات ایک ہی عمل یعنی نمازِ جمعہ کی تشکیل کرتے ہیں جو نمازِ ظہر کی جگہ انجام دی جاتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ خطیب اور امامِ جمعہ ایک ہی شخص ہو۔اگر خطبہ ایک

شخص کہے اور نماز دُوسرا شخص پڑھائے تو خطبہ اور نماز دونوں باطل ہیں۔

مسئلہ: 299 وہ پانچ احادیث جو نمازِ جمعہ کے دو خطبوں کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں، اُن کا حاصل یہ ہے کہ دونوں خطبے حمد وثنائے الٰہی، شہادتین اور رسولؐ اللہ وآئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین پر صلوات پر مشتمل ہوں۔ اس کے بعد تقویٰ کی وصیت کی جائے، پھر ایک مکمل سورۃ اور اس آیہ شریفہ کی تلاوت کی جائے:

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ". (90:16)

دونوں خطبوں میں صرف یہ فرق ہے کہ دُوسرے خطبہ میں سورۃ پڑھنا واجب نہیں ہے جبکہ صلوات میں حضراتِ آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین میں سے ہر ایک کا نام لینا واجب ہے۔

مسئلہ: 300 خطیب کو چاہیئے کہ پہلے خطبہ میں اسلامی سیاست کی بنیاد پر مسلمانوں کو ملکی اور بین الاقوامی سیاسی واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے ان واقعات کے متعلق انہیں اُن کی ذمہ داری سے آگاہ کرے۔ دُوسرے خطبہ میں پہلے خطبہ کے باقی ماندہ مسائل کو بیان کرنے کے بعد موعظہ اور تقویٰ کی نصیحت کے بعد دُعا مانگے۔

مسئلہ: 301 خطبہ میں ظاہراً صرف قرآنی سورۃ اور مذکورہ آیت کا عربی میں ہونا ضروری ہے۔

مسئلہ: 302 دونوں خطبوں میں حاضرین کی اکثریت کی زبان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر حاضرین کی زبانیں متعدد ہوں تو بہتر ہے کہ دونوں خطبوں کو ان سب زبانوں میں پڑھا جائے۔ اگر خطبے ایسی زبان میں دیئے جائیں جسے کم از کم چار آدمی بھی نہ سمجھتے ہوں تو نمازِ جمعہ باطل ہے بلکہ ظاہراً خطبوں کو اکثریت کی زبان میں ہی ہونا چاہیئے، اس لئے کہ:

”فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ“.(9:62)

”اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو“۔

کا خطاب تمام حاضرین سے ہے اور ذکر اللہ، جو پہلے خطبوں اور بعد میں نماز میں ہوتا ہے، اگر حاضرین اُسے نہ سمجھیں تو خطبوں میں ان کی شرکت کے کوئی صحیح معنی نہیں ہوں گے۔

مسئلہ: 303 خطبوں کے دوران حاضرین کا آپس میں گفتگو کرنا حرام ہے۔ اگر عمداً خطبوں کے دوران بات کی جائے تو نمازِ جمعہ کے بعد احتیاطاً نمازِ ظہر بھی پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ: 304 جہاں نمازِ جمعہ ہو رہی ہو، وہاں سے دو فرسخ (جو گیارہ کلومیٹر کے برابر ہیں) کے فاصلے تک معذور افراد کے علاوہ سب پر نمازِ جمعہ میں شرکت واجب ہے۔ اگر کوئی شخص نمازِ جمعہ میں حاضر نہ ہو تو اگر نمازِ ظہر کو نمازِ جمعہ کے وقت، چاہے جہاں بھی پڑھے، اُس کی نماز باطل ہے۔

مسئلہ: 305 جن لوگوں پر نمازِ جمعہ میں حاضر ہونا واجب ہے، اُنہیں چاہیئے کہ خطبوں کی ابتداء سے ہی نمازِ جمعہ کے اجتماع میں پہنچ جائیں کیونکہ بغیر عذر کے دیر سے جانا گناہ ہے۔

مسئلہ: 306 خطیبِ جمعہ کے عہدہ کیلیئے، سیاست، حالاتِ حاضرہ سے آگاہ اور شجاع مجتہدین کو اوّلیت حاصل ہے، اس لئے کہ یہی امام معصوم علیہ السلام کے نائب اور اسلامی حکومت کے رُوحانی پیشوا ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جن افراد کو حکومتِ اسلامی کا عادل سربراہ اس عہدہ پر مقرر کرے، وہ اس کے حقدار ہیں۔ اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو ہر خطے میں ایسے افراد، جو علمِ دین اور معاشرتی معاملات کا علم رکھتے ہوں اور تقویٰ و عدالت سے بھی آراستہ ہوں، نمازِ جمعہ قائم کر سکتے ہیں۔[1]

مزید تفصیلات کیلیئے ہمارے عربی رسالہ ”علی شاطی الجمعۃ“ یا فارسی رسالہ ”نمازِ جمعہ“ کی

---

[1] ان شرائط کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان میں ہونے والے نماز جمعہ کے اجتماعات میں شاید ہی یہ شرائط کہیں پائی جاتی ہوں۔ لہٰذا نماز جمعہ کے ان اجتماعات میں شرکت وجوب کی نیت سے نہیں کی جاسکتی اور نماز جمعہ کے بعد نماز ظہر ادا کرنا واجب ہے۔ (ہمدانی)

طرف رجوع کریں۔

نمازِعیدین

مسئلہ: 307 عیدالفطر،عیدِقربان اور جمعہ کی نماز میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ نمازِعید میں خطبے نماز کے بعد اور نمازِ جمعہ میں نماز سے پہلے ہیں۔عید کی نماز بھی نمازِ جمعہ کی طرح واجب ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اگر جماعت میسر نہ ہوتو نمازِعید کوتنہا پڑھنا واجب ہے۔نمازِعید کا وقت صبح کی اذان سے ظہر تک ہے۔نمازِعید میں پہلی رکعت میں حمد اور سورۃ کی تلاوت کے بعد پانچ اور دُوسری رکعت میں چار تکبیریں ہیں اور ہر تکبیر کے بعد دُعائے قنوت ہے جس کی دُعا معروف ہے۔اگر ممکن ہوتو پہلی رکعت میں حمد کے بعد سورۃ الاعلیٰ اور دُوسری رکعت میں سورۂ شمس پڑھی جائے، اگر ممکن نہ ہوتو جو سورۃ پڑھ سکتا ہو، پڑھے۔

نمازِمیّت

مسئلہ: 308 ہر مسلمان کی میّت پر نمازِ جنازہ پڑھنا واجب ہے۔میّت کیلئے ضروری ہے کہ اس کی عمر کم از کم چھ سال ہو۔اگر میّت کی عمر چھ سال نہ ہو لیکن وہ نماز کو سمجھتا تھا تو پھر بھی اُس پر نماز پڑھنا واجب ہے۔البتہ منافقین، جو بظاہر مسلمان لیکن حقیقت میں کافر ہیں، اُن پر نمازِ جنازہ پڑھنا اس آیت کی رُو سے حرام ہے:

”وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ“.(84:9)

”اوران میں سے کوئی مرجائے تو کبھی اُس پر نماز نہ پڑھو“۔

مسئلہ: 309 نمازِ جنازہ کو غسل اور کفن کے بعد پڑھنا چاہیئے۔اگر ان سے پہلے یا ان کے دوران پڑھ لی جائے تو باطل ہے اور دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ: 310 نمازِ جنازہ پڑھنے والے کو اس طرح قبلہ رُو ہونا چاہیئے کہ میّت اُس کے سامنے

ہو۔میّت کا سر اُس کی دائیں طرف اور پاؤں اُس کے بائیں طرف ہوں۔اگر جماعت کے ساتھ پڑھی جائے تو ماموین کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ میّت کے سامنے ہوں،اُن کا قبلہ رُو ہونا کافی ہے، اس لئے میّت نماز گزاروں کا قبلہ نہیں ہے بلکہ امام کا میّت کے سامنے اور ماموین کا قبلہ رُو ہونا ضروری ہے۔

مسئلہ : 311 کفن اور تابوت کے علاوہ کوئی چیز میّت اور نماز گزار کے درمیان حائل نہیں ہونی چاہیئے۔

مسئلہ:312 نمازِ میّت کو کھڑے ہو کر قصدِ قربت کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔میّت کا متعین ہونا بھی ضروری ہے، چاہے ایک میّت ہو یا ایک سے زیادہ، اس لئے کہ ایک نماز سب کیلئے کافی ہے، بشرطیکہ نماز کے جملے میّت کی تعداد سے ہم آہنگ ہوں۔اگر میّت دو سے زیادہ ہوں تو اُن کیلئے ضمیرِ جمع کو استعمال کرنا کافی ہے، اگر اُن کی تعداد معلوم نہ ہو۔

مسئلہ:313 نمازِ میّت پہلے تو اُس کے ولی (باپ، بیٹے، شوہر) پر واجب ہے لیکن اگر میّت نے وصیت کی ہو کہ اُن کے علاوہ کوئی اور شخص اُس کی نمازِ جنازہ پڑھے تو وصیت پر عمل کرنا واجب ہے اور ولی کی اجازت شرط نہیں ہے۔

مسئلہ:314 نمازِ میّت میں پانچ تکبیرات کہنا کافی ہیں۔پہلی تکبیر کے بعد شہادتین، دُوسری تکبیر کے بعد محمد وآلِ محمد علیہم السلام پر صلوات، تیسری تکبیر کے بعد مؤمنین کیلئے مغفرت کی دُعا، چوتھی تکبیر میں میّتِ حاضر کی مغفرت کی دُعا ہوتی ہے اور پانچویں تکبیر کے بعد، جو سلام کا حکم رکھتی ہے، نماز تمام ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:315 یہ جملہ:

''اَللّٰھُمَّ اِنَّا لَا نَعۡلَمُ مِنۡہُ اِلَّا خَیۡرًا''.

''اے اللہ! ہم اس (میّت) سے خیر کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے''۔

جو چوتھی تکبیر کے بعد کہا جاتا ہے، اس میں خیر سے تمام خیرات مراد نہیں ہیں بلکہ صرف ایمان مراد ہے، اس لئے کہ نمازِ میّت فاسق مسلمان پر بھی واجب ہے اور یہ اعتراف اس کے بارے میں بھی ہے کہ خدایا! ہم اس سے صرف خیر ہی کو جانتے ہیں۔ یہ دراصل اُس کے ایمان کی گواہی ہے، عدالت کی نہیں۔

نماز و روزۂ مسافر

اسلامی واجبات میں جو اہمیت اور مقام نماز کو حاصل ہے، وہ کسی اور عمل کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن شریف، احادیث اور عقل کی رُو سے یہ ایک ثابت اور مسلّم قانون ہے کہ جب کبھی دو واجبات میں اس طرح ٹکراؤ ہو جائے کہ دونوں کو انجام نہ دیا جاسکتا ہو یا دو حرام افعال میں اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ دونوں کو ترک نہ کیا جاسکتا ہو یا ایک واجب اور ایک حرام کے درمیان ایک ایسی کیفیت رُونما ہو جائے کہ انجامِ واجب اور ترکِ حرام دونوں بیک وقت ممکن نہ ہوں تو ایسی صورت میں ان دونوں کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے زیادہ اہمیت والے عنصر کو کم اہمیت والے عنصر پر مقدم کیا جائے گا، مثلاً دو واجبات کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں زیادہ اہمیت والے واجب کو اختیار کر کے کم اہمیت والے واجب کو ترک کر دیا جائے گا۔

اسی طرح دو حرام افعال یا ایک واجب اور ایک حرام کے درمیان بھی زیادہ اہمیت والے عنصر کو لے لیا جائے گا اور کم اہمیت والا عنصر چھوڑ دیا جائے گا۔

شریعتِ اسلامی، عقل، حس اور کسی بھی دُوسرے معیار کی رُو سے یہ ہرگز درست نہیں ہے کہ مندرجہ بالا صورتوں میں سے کسی صورت میں کم اہمیت والے عنصر کو اختیار کر لیا جائے اور زیادہ اہمیت والے عنصر کو قربان کر دیا جائے۔

اب یہاں یہ سوال زیرِ بحث لاتے ہیں کہ سفر میں کس طرح روزہ حرام اور نماز قصر ہو جاتی ہے؟ حالانکہ سفر جتنا بھی طویل ہو، ہرگز ان واجبات کے ساتھ نہیں ٹکراتا کہ اس کی وجہ سے روزہ ترک

کر دیا جائے اور نماز بھی قصر کر دی جائے!

قرآن شریف کی رُو سے اس سوال کا جواب یہ ہے:

''حالتِ 'حرج' میں جبکہ روزہ دار کی ساری طاقت صرف ہو جائے مگر اُسے کوئی نقصان بھی نہ ہو، روزہ کا وجوب ختم ہو جاتا ہے اور حالتِ عُسر میں، جو کہ بیماری کی حالت ہے، حرام ہو جاتا ہے۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے، نماز کی رکعات میں کمی صرف اُس صورت میں جائز ہے جبکہ اس کی تکمیل کسی خطرے کی موجب ہو اور کیفیت کے لحاظ سے اس وقت اس میں کمی کی جائے گی جب کوئی ایسی صورتِ حال درپیش ہو جس سے اجتناب واجب ہے۔

روزہ کے بارے میں معمولی اور عسر و حرج کی تین حالتیں بالکل نمایاں ہیں:

معمولی حالت کا حکم یہ ہے:

''یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' (183:2)

''اے مؤمنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی ہو جاؤ''۔

اس کے بعد حالتِ عُسر کا ذکر ہے جس میں روزہ، روزہ دار کیلئے مضر ہے:

''فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ''. (184:2)

''پس تم میں سے جو مریض یا مسافر ہو تو بعض دُوسرے دنوں میں (جبکہ معذور نہ ہو) روزہ رکھ لے''۔

یہاں سفر کا مرض کے بعد مذکور ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد صرف سفر نہیں ہے بلکہ وہ سفر ہے جو بیماری کی طرح موجبِ عسر و ضرر ہو۔

''يُرِيْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُبِكُمُ الْعُسْرَ''.

''اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، مشکل نہیں چاہتا'' (185:2)۔

یہاں بھی عسر (مشکل) سے مراد معمولی زحمت نہیں ہے، اس لئے کہ ہر روزہ باعثِ زحمت ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد ضرر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کفار کی حالت کے بارے میں فرمایا ہے:

''فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ''. (9:74)

''پس وہ روز عسر کا روز ہوگا''۔

کیا جہنم کی سختی معمولی سختی ہے یا غیر معمولی ضرر رساں سختی؟

تیمّم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا''. (6:5)

''پس اگر تم مریض یا مسافر ہو.....اور پانی نہ پاؤ تو تیمّم کرلو''۔

مریض کا پانی نہ پانا بیماری کے عذر کی وجہ سے ہے، کہ اس حالت میں پانی کے موجود ہونے کے باوجود اُسے وضو یا غسل کے بدلے تیمّم کرنا ہوگا۔لیکن مسافر کیلئے خود سفر بحیثیت سفر نہیں بلکہ پانی کا نہ ملنا جوازِ تیمّم کا سبب ہے، اس لئے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں حجاز میں پانی کی شدید کمی ہوتی تھی اور بعض اوقات سفر میں پیاس کی وجہ سے لوگ موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ روزے کی بھی یہی صورت تھی کہ سفر کی دیگر مشکلات کے ساتھ سفر میں پانی کی کمی، سفر کو موجبِ عسر وضرر بنادیتی تھی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ حکم بھی نہ ہوتا۔

روزے کی مذکورہ بالا دو حالتوں یعنی عام حالت، جس میں روزہ واجب ہے اور عسر کی حالت جس میں روزہ حرام ہے، ان دونوں کے درمیان ''حرج'' کی حالت ہے۔ اس حالت کا حکم یہ

ہے:

''وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''. (184:2)

''جن لوگوں کیلئے روزہ طاقت فرسا ہے، اُن پر فدیہ واجب ہے جو کہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو کوئی مشقت کے ساتھ کارِ خیر انجام دے تو یہ اُس کیلئے اچھا ہے اور روزہ رکھ لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو''۔

اس صورت میں روزہ رکھنا واجب ہے نہ حرام بلکہ مستحب ہے۔ جب طاقت فرسا روزہ حرام نہیں ہے تو غیر طاقت فرسا روزہ صرف سفر کی بنیاد پر کیونکر حرام ہوسکتا ہے جبکہ بعض اوقات وہ سفر جسے باعثِ ترکِ روزہ سمجھا جاتا ہے، فرحت بخش بھی ہوتا ہے۔

یہ تو روزے کا حکم تھا جس کا وجوب نماز کے وجوب سے کمتر ہے۔ اب نماز کی طرف آتے ہیں کہ آیا سفر کی وجہ سے، جبکہ عسر وحرج نہ ہو، کیا سفر میں نماز کی رکعات میں کمی ہوسکتی ہے؟

یہ بات طے ہے کہ کوئی ایسا خطرہ یا ضرر ہرگز موجود نہیں ہے جس سے بچنا نماز کی تکمیل سے زیادہ اہم ہو، سوائے اس ایک صورت کے جو قرآن شریف نے بیان کی ہے:

''وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا''. (101:4)

''جب تم جنگ کیلئے سفر کرتے ہو تو تم پر اپنی نماز میں کمی کرنے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہے ، اگر تمہیں خوف ہو کہ کفار تم پر حملہ کردیں گے''۔

یہاں حفاظتِ جان کی خاطر، جو کہ نماز کی تکمیل سے زیادہ اہم ہے، نماز قصر کرنے کی

اجازت دی گئی ہے۔ پھر اس کمی کی تلافی کیلئے حکم دیا:

’’فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِکُمْ‘‘. (103:4)

’’پھر جب تم نماز پوری کر چکو تو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کا ذکر کرو‘‘

خوف کی حالت میں قصر کی اجازت کے بعد اب اطمینان کی حالت میں نماز کی تکمیل کا حکم دیا گیا ہے۔ خوف کی حالت سے متعلق ایک اور آیت یہ ہے:

’’حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ..... فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا ج فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ‘‘. (238:2)

’’اپنی نمازوں کی حفاظت کرو..... پس اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سوار نماز پڑھو اور جب امن پاؤ تو اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جیسے اُس نے تمہیں سکھایا جو تم نہ جانتے تھے‘‘۔

گزشتہ آیت میں کفار کے فتنہ کے خوف کو قصر کا موجب قرار دیا جبکہ یہاں ہر قسم کا خوف یعنی جان، مال، عزت و ناموس وغیرہ کا خوف مراد ہے۔ یعنی ان سب کی حفاظت کیلئے نماز میں کچھ کمی کی جائے گی تا کہ نماز کا فریضہ بھی ادا ہو جائے اور ان واجب الحفظ چیزوں کی حفاظت کا فریضہ بھی۔ بنا برایں ایسا سفر جس میں کوئی خوف، عسر اور حرج نہ ہو تو اس میں نماز قصر نہیں ہوگی۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے تو اس مسئلہ سے متعلق روایات خلافِ قرآن قرار پاتے ہوئے نظر انداز کر دی جائیں گی، خصوصاً جبکہ خود ان روایات میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ اگر بالفرض ان روایات کو قبول بھی کر لیا جائے تو 44 کلومیٹر کے سفر میں قصر کا فتویٰ پھر بھی قابل قبول نہیں ہوگا، اس لئے کہ احادیث میں آئمہ علیہم السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آٹھ فرسخ میں نماز کے قصر کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ آٹھ فرسخ غالب سفروں میں دن بھر کا سفر ہوتا ہے۔ (غالب سفروں سے مراد

عام طور پر کئے جانے والے سفر ہیں)۔

اس لحاظ سے قصر کا معیار غالب سفروں کے ذریعے دن بھر کا سفر قرار پائے گا۔ موجودہ دَور میں غالب سفر بسوں، ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ پس بس یا ٹرین وغیرہ سے سفر کی صورت میں ایک ہزار کلومیٹر سے بھی زائد سفر میں اور ہوائی جہاز کی صورت میں پچاس ہزار کلومیٹر کے سفر میں قصر کا حکم جاری ہوگا۔

قصر کے بارے میں یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ قصر کے معنی کم کرنے کے ہیں جس کی دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ نماز کی رکعات کی تعداد میں کمی کر دی جائے اور دُوسری یہ کہ رکعات کی تعداد میں کمی کی بجائے بعض مستحب یا واجب اذکار میں کمی کر دی جائے، مثلاً سجدہ اور رکوع وغیرہ میں صرف ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے پر اکتفا کرنا۔ پہلی اور دُوسری رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھ لینا اور تیسری اور چوتھی رکعت میں تسبیحاتِ اربعہ کی تعداد میں کمی کر دینا وغیرہ۔

مختصر یہ کہ قرآن وسنت کی رُو سے مسافر صرف اُسی صورت میں روزہ ترک اور نماز قصر کر سکتا ہے جبکہ اُس کا سفر خطرناک یا مضر ہو۔

روزہ

اسلامی فرائض میں نماز کے بعد روزہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ تمام مکلفین پر واجب ہے، سوائے بعض حالات کے۔ قرآن شریف میں روزہ کو صوم کی بجائے صیام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ صوم کے معنی حفاظت اور نگہبانی کے ہیں جبکہ صیام کے معنی دوطرفہ ہم آہنگ نگہبانی کے ہیں۔ مکلّف کی طرف سے نگہبانی اس صورت میں رُونما ہوتی ہے کہ وہ اپنی زبان کو حرام گفتگو، شکم اور شرمگاہ کو حلال وحرام دونوں سے محفوظ رکھے۔ اس نگہبانی کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نگہبانی مکلّف کو برائیوں اور گناہوں سے بچاتی ہے، جیسا کہ صیام کی آیت میں ہے:

”یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی

الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ''(183:2)

''اے مؤمنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی ہو جاؤ''۔

اس آیت کی رُو سے روزہ جو بذاتِ خود شہوات سے پرہیز کا نام ہے، اس کا حقیقی مقصد وسیع پیمانے پر دُوسری تمام شہوات سے پرہیز کرنا ہے۔

فقہِ اکبر میں جو کہ فقہِ معرفت ہے، روزہ درحقیقت تمام اعضاء کا روزہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزہ کی حالت میں شکم اور شرمگاہ کے روزہ کے علاوہ جان و دل، عقل وفکر، چشم و زبان، ہاتھ اور پاؤں روزہ سے ہوں۔ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی ہر قسم کی مخالفت سے پرہیز کیا جائے، جو کچھ غیر از حق ہے، اُس سے مکمل اجتناب کیا جائے۔

اگر چہ فقہِ ظاہری یا بالفاظِ دیگر فقہِ اصغر میں شکم اور شرمگاہوں کو حلال اور حرام شہوت سے اور زبان کو خدا اور جنابِ رسولِ خدا کی طرف جھوٹی نسبت دینے سے بچا رکھنا کافی ہے۔ لیکن فقہِ اکبر میں روزہ ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو غیر خدا اور غیر خدائی اشیاء واعمال سے رہائی دلائے۔

''**لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ**'' جو ہر قسم کی قید اور شرائط سے عاری تقویٰ کو روزہ کا نتیجہ قرار دے رہی ہے، اسی حقیقت کو مدِنظر رکھے ہوئے ہے۔

مسئلہ: 316 تمام عبادات کی طرح روزہ کیلئے بھی قصدِ قربت ضروری ہے اور کسی دُوسری نیت سے ہرگز درست نہیں ہے۔ نیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کس حال میں ہیں تو آپ کہیں کہ روزہ سے ہوں یا دُوسرے الفاظ میں آگاہانہ طور پر اس فعل کو انجام دینا چاہئے۔ یہی نیت ہے، چاہے ایک ہی مرتبہ پورا مہینہ روزہ رکھنے کی نیت کی جائے یا ہر روزہ کی الگ الگ نیت کی جائے۔ اس کے علاوہ اور کسی احتیاط پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی پر کئی قسم کے روزے واجب ہوں تو ہر ایک کو اس کی مخصوص نیت کے ساتھ رکھنا ضروری ہے ورنہ روزہ صحیح نہیں

ہوگا۔

مسئلہ: 317 ماہِ رمضان کے قضا روزوں کی نیت کا وقت ظہر تک ہے۔خود ماہِ رمضان کے روزوں کی نیت کا وقت طلوعِ فجر تک اور مستحب روزوں کی نیت کا وقت غروبِ آفتاب کے نزدیک تک ہے۔ پہلی دوصورتوں میں یعنی رمضان کی قضا اور رمضان کے روزہ میں اگر نیت مقررہ وقت سے گزر جائے تو ظاہراً روزہ باطل ہے اوران دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ رمضان شریف کے روزہ میں اگرنیت مقررہ وقت سے گزر جائے تو روزہ باطل ہونے کے باوجودافطار کے وقت تک اسے جاری رکھنا واجب ہے، بعد میں قضا بھی واجب ہے۔

لیکن رمضان کی قضا میں اگرنیت مقررہ وقت سے گزر جائے تو صرف اُس صورت میں آخر تک اُسے جاری رکھنا واجب ہے جب اس کے علاوہ اور کوئی وقت نہ ہو۔لیکن اگر وقت کافی ہوتو پھر اسے جاری رکھنا واجب نہیں ہے بلکہ کسی اور دن روزہ رکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 318 اگر معلوم نہ ہو کہ ماہِ شعبان کا آخری دن ہے یا ماہِ رمضان کا پہلا دن تو اس صورت میں آخرِشعبان کے مستحب روزہ یاماہِ رمضان شریف کی قضا کی نیت سے روزہ رکھنا چاہئے کہ اگراوّل رمضان ہوتو خودبخو د رمضان کا روزہ شمار ہوگا ورنہ مستحب یا قضا محسوب ہوگا۔

اگر ماہِ رمضان کی نیت سے روزہ رکھے اور ماہِ رمضان ہی ہو،تب بھی روزہ صحیح ہےلیکن اس صورت میں اگر ماہِ رمضان نہ ہوتو مستحب یا قضا روزہ شمار نہیں ہوگا۔اگر یہ نیت کر لی جائے کہ اگر ماہِ رمضان ہوتو ماہِ رمضان کا روزہ اور اگر ماہِ رمضان نہ ہوتو قضا یا مستحب روزہ ہے تو ظاہراً اس صورت میں بھی روزہ صحیح ہے۔

اگر دن کے دوران معلوم ہو جائے کہ اوّل ماہِ رمضان ہےاورکوئی مفطر انجام نہ دے چکا ہو تو مغرب سے قبل رمضان کی نیت کر لے اور اگر کوئی مفطر انجام دے چکا ہو تب بھی مغرب تک کھانے پینے سے پرہیز کرے اور بعد میں قضا کرے۔

روزہ کے سامنے مکلفین کی اقسام

مسئلہ:319 جن لوگوں کو روزہ رکھنے سے کوئی عذر مانع نہیں ہے، وہ کسی بھی صورت میں روزہ ترک نہیں کر سکتے۔

مسئلہ:320 جو لوگ بیمار ہوں یا مقررہ شرعی حدود و شرائط کے لحاظ سے مسافر ہوں، اُن کیلئے روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ:321 وہ ضعیف اور ناتواں لوگ جو اگرچہ روزہ رکھنے سے بیمار نہیں ہوتے لیکن روزہ رکھنا اُن کیلئے طاقت فرسا ہے، اُن کا حکم اس آیہ مبارکہ کی رُو سے معلوم ہوتا ہے:

''وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''. (184:2)

''جن لوگوں کیلئے روزہ طاقت فرسا ہے، اُن پر فدیہ واجب ہے جو کہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو کوئی مشقت کے ساتھ کارِ خیر انجام دے تو یہ اُس کیلئے اچھا ہے اور روزہ رکھ لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو''۔

بنابرایں روزہ کی یہ تین صورتیں ہیں: واجب، حرام، مستحب۔

مسئلہ:322 واجب روزہ کو ترک کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی ترک کردے تو بھی اُس پر واجب ہے کہ دن کے آخر تک امساک (کھانے پینے اور جماع سے اجتناب) کرے۔ ماہِ رمضان کے بعد اس پر کفارہ بھی واجب ہے جو یہ ہے کہ یا ساٹھ دن روزہ رکھے، جن میں سے پہلے اکتیس دن لگاتار بلا فاصلہ روزہ رکھنا ضروری ہے اور باقی روزوں میں فاصلہ ہو تو کوئی حرج نہیں یا ساٹھ

مسکینوں کو کھانا کھلائے اور اگر روزہ فعل حرام سے باطل کیا ہو تو یہ دونوں کفارے واجب ہیں جسے کفارۃ الجمع کہا جاتا ہے۔

تیسرا کفارہ ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ موجودہ دَور میں چونکہ غلام وغیرہ نہیں ہیں، لہٰذا کسی مالی یا غیر مالی پریشانی میں مبتلا مؤمن کو نجات دلانا اس کا بدل قرار پائے گا۔

مسئلہ: 323 اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اُسے خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے بیمار ہو جائے گا تو اس صورت میں روزہ رکھنا نہ صرف یہ کہ واجب یا مستحب نہیں بلکہ حرام ہے۔ اگر ایسی حالت میں روزہ رکھ لے تو وہ کافی نہیں ہے اور ماہِ رمضان کے بعد اُس کی قضا واجب ہے۔

مسئلہ: 324 جو شخص مریض یا مسافر نہیں ہے اور مریض ہونے کا خوف بھی نہیں رکھتا لیکن اس قدر ضعیف اور ناتواں ہے کہ روزہ رکھنا اُس کیلئے طاقت فرسا ہے تو اس صورت میں روزہ رکھنا اُس پر واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

مسئلہ: 325 ماہِ رمضان میں خود کو مریض کرنا یا مریض ہونے کے اسباب فراہم کرنا حرام ہے، اس لئے کہ ایسا کرنے والا خود ترکِ واجب کا موجب ہوا ہے۔ ماہِ رمضان کے بعد اس کی قضا واجب ہے اور باقی روزے رکھنے کے لئے صحت کی بحالی کی کوشش کرنا بھی واجب ہے۔

مسئلہ: 326 جو روزہ طاقت فرسا ہے، وہ کسی بھی صورت میں واجب نہیں ہے، چاہے بڑھاپے کی وجہ سے ہو یا مزاج کے ضعیف ہونے یا دِنوں کے طویل ہونے کی وجہ سے ہو۔ بنابرایں بچے کو دودھ پلانے والی عورت، چاہے اُس کی ماں ہو یا دایہ، چاہے اُجرت لے کر دُودھ پلاتی ہو یا بغیر اُجرت کے، اگر روزہ رکھنا اُس کیلئے طاقت فرسا ہو تو اس پر روزہ واجب نہیں ہے اور یہ بات بخوبی واضح ہے کہ اگر روزہ اُس کیلئے یا شیر خوار کیلئے نقصان دہ ہو تو یہ روزہ حرام ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بعد میں ان روزوں کی قضا بجالانا ممکن ہو تو کیا واجب ہے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ آیہ شریفہ ''عِـدَّـۃٌ مِنۡ اَیَّامٍ اُخَر '' (دُوسرے دنوں میں سے چند دن) جو مرض اور مسافر کے متعلق ہے، ایسے شخص پر بخوبی جاری ہوگی جو مریض اور مسافر نہ تھا بلکہ صرف طاقت فرسا ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنا اُس پر واجب نہ تھا۔

مسئلہ: 327 اگر کسی خاص بیماری یا موسم کے بہت زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے صرف پانی پینے کی شدید ضرورت ہو، اس طرح کہ پانی نہ پئیں تو بیماری کے خطرناک صورت اختیار کرنے یا روزہ کو طاقت فرسا بنانے کا موجب ہو تو ایسی صورت میں روزہ کے دوران ہی ضرورت کے مطابق پانی پیا جاسکتا ہے۔ یہ روزہ صحیح ہے اور اس کا قضا و کفارہ بھی نہیں ہے۔

روزہ کی حالت میں حرام کام

مسئلہ: 328 جو کام روزہ کی حالت میں حرام ہیں، اُن کی دو اقسام ہیں: پہلی قسم وہ افعال ہیں جو خود حرام ہیں اور روزہ کو بھی باطل کر دیتے ہیں جیسے جماع کرنا، کھانا، پینا اور خدا اور رسولؐ خدا کی طرف عمداً جھوٹی بات کی نسبت دینا۔

دُوسری قسم وہ افعال ہیں جو خود تو حرام ہیں لیکن روزہ کو باطل نہیں کرتے جیسے پانی میں سر ڈبونا یا مائع چیز سے حقنہ کرنا۔ یہ دونوں روزہ کی حالت میں حرام ہیں لیکن ان سے روزہ کے باطل ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

مسئلہ: 329 جماع اور استمنا (منی نکالنا) ہر صورت میں، سوائے حالتِ خواب یا حالتِ غیر اختیاری کے، حرام ہیں اور روزہ کو باطل کرتے ہیں، چاہے حلال ہو یا حرام۔ لیکن اگر روزہ ان میں سے ایسے فعل سے باطل کیا جائے جو اصل میں حرام ہے تو اس صورت میں قضا کے علاوہ کفارۂ جمع بھی واجب ہے اور اگر حلال ہو تو قضا کے علاوہ ایک کفارہ واجب ہوگا۔

مسئلہ: 330 اگر انسان روزہ کی حالت میں ایسا کام کرے جس سے بے اختیار جماع کا مرتکب ہو یا منی خارج ہو جائے تو اس کا روزہ باطل اور قضا و کفارہ دونوں واجب ہیں۔ اگر یہ عمل اصل

میں بھی حرام ہوں تو اس صورت میں قضا کے علاوہ کفارۂ جمع بھی واجب ہے۔

مسئلہ: 331 کیا طلوعِ فجر اور اذانِ صبح سے چند لمحے پہلے تک جماع میں مشغول رہنا یا عمداً صبح کی اذان تک جنابت پر باقی رہنے سے روزہ باطل ہو جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف کی رُو سے کھانے اور پینے کی طرح جماع بھی طلوعِ فجر تک حلال ہے۔ جنابِ رسولِ خداؐ اور آئمہ سلام اللہ علیہم اجمعین سے مروی روایات بھی آیت کے مطابق اسی حکم کو بیان کرتی ہیں۔ جو روایات اس حکم کے خلاف ہیں، چونکہ قرآن شریف اور پہلی قسم کی روایات کے مخالف ہیں، لہٰذا ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔ بنا بر ایں طلوعِ فجر کے قریب جنب ہونا یا عمداً طلوعِ فجر تک جنب رہنا نہ حرام ہے، نہ ہی روزہ کو باطل کرتا ہے۔

بنیادی طور پر کسی بھی واجب غسل کا روزے کے صحیح ہونے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر اذانِ صبح سے قبل مکلّف پر کوئی غسل واجب ہو اور وہ مغرب تک بھی غسل نہ کرے تو اُس کا روزہ صحیح ہے۔ صرف اُس کی نماز غسل نہ کرنے کی وجہ سے باطل ہوگی۔

کھانا اور پینا

مسئلہ: 332 جماع اور کھانے پینے سے روزے کے باطل ہونے کی دلیل یہ قرآنی آیت ہے:

"فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠" .(187:2)

"پس اب ان (بیویوں) سے مباشرت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے، اُس کو تلاش کرو اور کھاؤ اور پیو، اُس وقت تک جب فجر کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے"۔

اس آیت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جس طرح کھانا پینا طلوعِ فجر تک حلال ہے، جماع بھی اسی طرح طلوعِ فجر تک جائز ہے۔ پس اگر فجر میں داخل ہونے سے قبل غسل جنابت واجب ہوتا تو جماع کو کھانے پینے کی طرح طلوعِ فجر تک جائز قرار نہ دیا جاتا۔

یہ کہنا بالکل غلط اور قرآن کی عظمت کے منافی ہے کہ ''حَتّٰی یَتَبَیَّنَ'' (فجر کے طلوع ہونے تک) کا تعلق جماع سے نہیں بلکہ صرف کھانے اور پینے سے ہے، اس لئے کہ مباشرت، جو مبطلاتِ روزہ میں سب سے زیادہ اہم ہے، اس کی حد کو بیان کرنا کھانے اور پینے کی حد کو بیان کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر یہ حد صرف کھانے اور پینے کی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کھانا پینا تو اس حد تک محدود ہے اور مباشرت کی کوئی حد نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اگر چند چیزوں کے بعد استثناء یا کوئی بھی قید بیان ہو تو معمولی فصاحت و بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق ان سب سے ہو، جبکہ قرآن شریف دُوسرے ہر پہلو کی طرح فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ترین مقام پر ہے۔ اگر گزشتہ اُمور میں سے چند یا کوئی ایک استثناء یا قید سے خارج ہوں تو صحیح بیانی کا تقاضا ہے کہ اسے اس طرح بیان کیا جائے کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ پس اگر ''بَاشِرُوْھُنَّ''، ''حَتّٰی یَتَبَیَّنَ'' کی حد سے خارج ہوتا تو ضروری تھا کہ اسے ''کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ'' کے بعد بیان کیا جاتا اور اگر اس سے پہلے بیان کیا جاتا تو ضروری تھا کہ اس طرح بیان ہوتا جس سے یہ واضح ہوتا کہ یہ کھانے اور پینے کی طرح طلوعِ فجر تک جائز نہیں ہے۔

مسئلہ 333: کھانے پینے والی اشیاء اس آیت کی نص کی رُو سے روزہ کو باطل کر دیتی ہیں۔ بنا بر ایں اگر کنکری یا اس جیسی کوئی چیز نگل لی جائے تو اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا، اس لئے کہ کوئی چیز کھائی نہیں گئی۔ اگر سوئی میں دھاگا ڈالنے کی غرض سے تھوک یا کسی اور چیز سے گیلا دھاگا منہ میں رکھ لیا جائے تو اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔

اس اصول کی رُو سے اور بدرجہ اولیٰ کسی قسم کا دھواں یا غبار حلق میں داخل ہونے سے روزہ

باطل نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ کھانا پینا نہیں ہے۔ دھوئیں اور غبار سے روزہ کے باطل ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ معتبر حدیث میں اسے جائز بھی قرار دیا گیا ہے۔

مسئلہ: 334 کھانے اور پینے کی اشیاء جس طرح بھی جسم میں داخل کی جائیں، روزہ کو باطل کر دیتی ہیں، جیسا کہ طاقت کے ٹیکے اور ڈرِپ وغیرہ، اس لئے کہ ان کے ذریعے پانی، خوراک اور دوا بدن میں داخل ہوتی ہے۔ بنابرایں وہ ٹیکے جو درد کی تسکین یا جسم کے کسی حصہ کو بے ہوش کرنے کیلئے لگائے جاتے ہیں، ان سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔

مسئلہ: 335 اگر علم ہو کہ دانتوں کے درمیان پھنسے ہوئے خوراک کے ذرّے بتدریج معدہ میں چلے جائیں گے تو روزہ باطل ہے۔

مسئلہ: 336 اگر سینے کی بلغم حلق یا منہ میں آ کر دوبارہ سینے میں لوٹ جائے یا معدہ میں داخل ہو جائے تو اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا، اس لئے کہ کھانے کا اطلاق صرف بیرونی کھائی جانے والی اشیاء پر ہوتا ہے۔

مسئلہ: 337 اگر خدا اور رسولؐ خدا کی طرف عمداً جھوٹ منسوب کیا جائے تو اس سے روزہ باطل ہونے سے پہلے ایمان باطل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ چاہے خدا اور رسولؐ خدا کی تکذیب کی جائے یا ان کی طرف جھوٹ منسوب کیا جائے، دونوں صورتوں میں خدا پر افتراء ہے جو متعدد قرآنی آیات کی روشنی میں کفر ہے۔

مسئلہ: 338 پانی میں غوطہ لگانے کے متعلق دو قسم کی روایات ہیں: ایک وہ جو اسے روزہ کو باطل کرنے والا قرار دیتی ہیں اور ان کے مقابل روایات کی ایک تعداد اسے صرف حرام قرار دیتی ہے یا اس بات پر صریح ہیں کہ اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔ اگر یہ دونوں قسم کی روایات ایک دُوسرے کی ہم وزن بھی ہوتیں تو دونوں تساقط کا شکار ہو کر بے اثر ہو جاتیں اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ارتماس (پانی میں غوطہ لگانا) سے روزہ کے باطل ہونے پر کوئی دلیل باقی نہ رہتی۔

مسئلہ: 339 اسی طرح مائع چیز سے حقنہ کرنا اگرچہ حرام ہے لیکن اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔ قے کرنا جو کھانے اور پینے کے مقابل ہے، مسلم طور پر روزہ کو باطل نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کھانا پینا اور قے کرنا جو ایک دُوسرے کے متقابل ہیں، دونوں روزہ کو باطل کرتے ہوں۔ جس طرح کھانا اور نہ کھانا، پینا اور نہ پینا، جماع اور ترکِ جماع، کذب برخدا و رسولؐ اور اس کا ترک کرنا، سب ایک دُوسرے کے مقابل ہیں اور ممکن نہیں ہے کہ یہ سب روزہ کو باطل کرتے ہوں، قے کرنا، جو کھانے پینے کا متضاد ہے، اس سے روزہ کے باطل ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

یہ تضاد اس بات کی بیّن اور واضح دلیل ہے کہ قے کرنا روزہ کو باطل نہیں کرتا۔

بنابرایں صرف تین یا چار چیزیں روزہ کو باطل کرتی ہیں جن میں سے چوتھی چیز یعنی خدا اور رسولِؐ خدا پر جھوٹ باندھنا، پہلے ایمان کو باطل کرتا ہے جو روزہ کے صحیح ہونیکی بنیادی شرط ہے۔ ان کے علاوہ جن چیزوں کو مبطلاتِ روزہ میں شمار کیا گیا ہے، نہ صرف اُن پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ آیت اور روایات کی روشنی میں مبطلاتِ روزہ یہی تین چیزیں ہیں۔

مبطلاتِ روزہ میں سے کسی چیز کو استعمال کئے بغیر روزہ کو ترک کر دینے کا ارادہ کرنے سے روزہ باطل نہیں ہوتا، اس لئے کہ ایسا ارادہ کرنا ہرگز مبطلاتِ روزہ میں شمار نہیں ہوتا۔ قرآن وسنت میں اس کا کوئی نام ونشان بھی موجود نہیں ہے اور ایسی حدیث کو نقل کرنا، جس کا صحیح ہونا مشکوک ہو، اگرچہ حرام ہے لیکن یہ خدا پر افتراء کے زمرے میں نہیں آتا اور اس سے روزہ کے باطل ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

مسئلہ: 340 اگر کوئی شخص کسی اُفق پر روزہ افطار کرنے کے بعد ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرتے ہوئے ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں ابھی تک افطار کا وقت نہیں ہوا ہے تو یہاں اُس پر روزہ کی حالت میں رہنا ظاہراً واجب نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اپنے فرض کے مطابق گزشتہ اُفق پر اپنا روزہ افطار کر چکا ہے اور دُوسرے اُفق پر روزہ کو جاری رکھنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور نہ ہی روزہ کو اس

طرح جاری رکھنا ممکن ہے۔

مسئلہ: 341 اگر گزشتہ اُفق پر روزہ افطار نہ کیا ہو اور پھر ایسی صورتِ حال رُونما ہو جائے تو ظاہراً دُوسرے اُفق پر افطار کے وقت تک روزہ کی حالت پر رہنا واجب ہے، اس لئے کہ ایسی صورتِ حال میں ''**ثم اتموا الصیام الی اللیل**'' (پھر رات تک روزہ کو تمام کرو) کا پہلا مصداق گزرنے کے بعد دُوسرا مصداق پیدا ہو جاتا ہے۔ دُوسرے موارد کی طرح یہ بھی اس آیت کے اطلاق میں داخل ہے۔

جن حالات میں روزہ کی قضا واجب ہے

مسئلہ: 342 وہ تمام موارد جہاں کوئی عذر روزہ رکھنے سے مانع ہو، عذر برطرف ہونے کے بعد روزہ کی قضا واجب ہے، سوائے ایسی حالت کے جہاں روزہ کے طاقت فرسا ہونے کی وجہ سے روزہ واجب نہ ہو۔ یہاں پر معیار اصلی طاقت فرسائی ہے۔ پس وہ طاقت فرسائی جو کبھی کبھی ہوتی ہے، اگر اُس کی وجہ سے روزہ نہ رکھا ہو تو بعد میں طاقت بحال ہونے پر روزہ کی قضا واجب ہے۔ مثال کے طور پر اگر بچے کو دُودھ پلانے کی وجہ سے یا گزشتہ بیماری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی کمزوری کی وجہ سے روزہ طاقت فرسا ہو تو بعد میں طاقت بحال ہونے پر روزہ کی قضا واجب ہے۔

لیکن کفارہ اس صورت میں واجب ہوتا ہے جب بغیر کسی عذر کے روزہ کو ترک کیا جائے کہ یا تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے یا ساٹھ دن کے روزے رکھے جن میں سے پہلے اکتیس دن لگاتار اور مسلسل روزہ رکھنا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص فعلِ حرام سے روزہ کو باطل کرے تو یہ دونوں کفارے اُس پر واجب ہیں اور احتمالِ قوی یہ ہے کہ ایک زرخرید غلام کی قیمت بھی فقراء اور مساکین میں تقسیم کرنا یا کسی مقروض یا کسی اور مشکل میں گرفتار مؤمن کو قرض یا مشکل سے نجات دلانا بھی واجب ہو، اس لئے کہ یہ مسلمان غلام کو آزاد کرنے کا متبادل ہے۔

اگر کسی کی بیماری آئندہ رمضان تک برقرار رہے تو اس سے روزہ کی قضا ساقط ہے اور اگر

بیماری کی حالت میں رمضان کا مہینہ تمام ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء پر اس کے روزوں کی قضا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اس سے ساقط تھے۔

ثبوتِ ہلال کے طریقے

مسئلہ: 343 ہلال کو دیکھنا یا ہلال کو دیکھنے والوں کی بات کا اطمینان بخش ہونا یا عادل حاکم شرع کا حکم یا شعبان کے تیس دن پورے ہو جانا، یہ سب مہینے کی پہلی تاریخ کو ثابت کرتے ہیں۔ ہلال کو چاہے دُور بین وغیرہ سے دیکھا جائے یا اس کے بغیر، دونوں صورتوں میں چاند ثابت ہو جاتا ہے، اس لئے کہ حدیث:

"صُمْ لِلرُّوْيَةِ وَافْطِرْ لِلرُّوْيَةِ".

"چاند کو دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو"۔

دیکھنے کو کسی خاص ذریعہ یا وقت میں محدود نہیں کر رہی ہے بلکہ اگر انسان خود یا کوئی اور کسی بھی ذریعے سے چاند کو دیکھ لے تو یہ کافی ہے۔

بنابرایں ٹیلی سکوپ، جو چاند کو دیکھنے کا بہترین ذریعہ ہے، اوّلِ ماہ کو ثابت کرنے کا راستہ سب پر کھول دیتی ہے اور کسی بھی اُفق پر ہر قسم کے اختلافات کا سدِ باب بھی کر دیتی ہے۔

مسئلہ: 344 روزہ کا آغاز فجر صادق سے ہو جاتا ہے اور اس کی انتہا رات کو ہوتی ہے۔

"ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلَ".

"روزہ کو رات تک تمام کرو"۔

سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ اس طرح سورج کے غروب ہوتے ہی روزہ کو افطار کرنا خلافِ قرآن ثابت ہو جاتا ہے، اس لئے کہ کرۂ آفتاب کے غروب ہوتے ہی رات نہیں ہو جاتی بلکہ رات کا آغاز اس سے چند لمحوں کے بعد ہوتا ہے۔ اگر ہمارے پاس اس بات پر کوئی قرآنی نص موجود نہیں جو یہ کہتی ہو کہ مغرب کی نماز کے وقت کا آغاز غروبِ آفتاب نہیں بلکہ مغرب ہے تو یہاں روزہ کے متعلق تو

آیت صراحت کے ساتھ ’الی اللیل ‘یعنی ’’رات تک‘‘ کہہ رہی ہے اور ’الی الغروب ‘یعنی ’’غروبِ آفتاب تک‘‘ نہیں کہا، اس لئے کہ بعض آیات (ق:39، طہ:130) میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ نمازِ عصر کے وقت کی انتہا غروب کا وقت ہے لیکن روزہ کی انتہا کا وقت غروب نہیں بلکہ ’’لیل‘‘ ہے۔

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ کرۂ آفتاب کے غروب ہونے پر دن تمام نہیں ہوتا بلکہ دن ہی ہوتا ہے اور رات کا آغاز اُس وقت ہوتا ہے جب رات کی ہلکی سی تاریکی آسمان پر پہنچ جائے۔

مسئلہ: 345 وہ علاقے جہاں رات اور دن معمول کے مطابق نہیں ہیں بلکہ چند ماہ کی رات اور چند ماہ کا دن ہوتا ہے، اُن علاقوں میں روزہ کا حکم یہ ہے کہ رات یا دن کو مساوی حصوں میں یا نزدیک ترین اُفق کے مطابق تقسیم کرلیا جائے اور اس تقسیم کے مطابق روزے رکھے جائیں جیسا کہ نماز کیلئے بھی اسی طرح وقت کو تقسیم کیا جائے گا۔ (مزید تفصیل کیلئے مسئلہ 249 ملاحظہ فرمائیں)۔

خمس

مسئلہ: 346 خمس و زکوٰۃ اور دُوسرے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلامی ٹیکس اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی ضروریات کی تکمیل کیلئے مقرر کیئے گئے ہیں۔ درحقیقت یہ ٹیکس مسلمانوں کی جان، مال، آبرو، عقیدہ اور دُوسرے ناموس کی حفاظت اور ترقی کیلئے دیئے اور خرچ کیئے جانے چاہئیں۔

اگر ان ٹیکسوں کا فائدہ ٹیکس دہندگان کو نہ بھی پہنچے تو بھی ان کا ادا کرنا واجب اور لازم ہے، اس لئے کہ یہ تمام اموال اور ان کے مالکان درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اس لئے کہ جسم، جسمانی قوت، فکری استعداد، علمی صلاحیت اور دُوسری زمینی و آسمانی نعمتیں سب کی سب الٰہی عطیہ ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی کاشت کار اپنی زمین میں بیج بوتا ہے یا درخت لگاتا ہے تو اُس کا یہ کام پانی، ہوا، زمین اور دُوسرے زمینی ذخائر کے سامنے بہت ہی ناچیز ہے، اس لئے کہ ان سب کے علاوہ کاشت کار کا کام

بھی اللہ کی دی ہوئی طاقت اور استعداد کی وجہ سے انجام پاتا ہے۔

کاشت کار کی کوشش اللہ کے الطاف وعنایات کے مقابلہ میں اس قدر کم ہے کہ اس کی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ اُس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان طبیعی عوامل کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے مختص ہیں۔

اب اگر اللہ تعالیٰ آپ سے یہ چاہے کہ اپنی آمدنی کا اڑھائی فیصد، پانچ فیصد، دس فیصد یا بیس فیصد حصہ اُس کی طرف سے مقرر کردہ چیزوں پر خرچ کریں کہ اس کا فائدہ بھی آپ کو ہی ملے گا تو کیا اس صورت میں یہ صحیح ہے کہ آپ اپنی آمدنی کو اپنی محنت اور مشقت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اللہ کے حقوق کو ادا نہ کریں؟ حالانکہ اگر آپ کی آمدنی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بلاواسطہ طور پر کوئی حصہ نہ ہوتا تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کے اُن اوامر کی اتباع واجب تھی، اس لئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اور اُسی کی رحمتوں کے سائے تلے پروان چڑھے ہیں اور آپ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اُسی کی دی ہوئی ہیں۔ درحقیقت ”**العبدو ما فی یدہ کان لمولاہ**“ (بندہ اور جو کچھ اُس کے ہاتھ میں ہے، اُس کے مولا کا ہے)۔

مسئلہ: 347 اگر خمس جنگی غنائم کے ساتھ مختص نہ ہو تو شریعت میں مقررہ اجتماعی اور انفرادی ضروریات کی تکمیل کیلئے، یہ زکوٰۃ کے بعد آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ اڑھائی فیصد، پانچ فیصد یا دس فیصد ہے جس کی اوسط چھ فیصد بنتی ہے جبکہ خمس بیس فیصد ہے۔

”**وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ**“ (41:8)

”اور جان لو کہ تمہیں جو بھی غنیمت ملے“

کی روشنی میں تمام فوائد پر خمس واجب ہے اور صحیحہ علی بن مہزیار میں بھی اسی آیت کی رُو سے غنائم اور فوائد کے یہی عام معنی بیان کئے گئے ہیں۔ وہ موارد جنہیں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ خمس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے محتاجِ دلیل ہیں اور دلیل موجود نہیں ہے۔

چونکہ غنیمت عام طور پر ایسے مال کو کہا جاتا ہے جو زحمت کے بغیر ہاتھ لگے، لہٰذا مالِ میراث، ہبہ اور ہدیہ جیسی اشیاء، جنہیں مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے، ہرگز مستثنیٰ نہیں ہیں بلکہ یقینی طور پر ان کا خمس دینا واجب ہے۔ ان کے استثناء پر کوئی صحیح اور قابل قبول دلیل موجود نہیں ہے اور یہ استثناء آیہ شریفہ کے خلاف بھی ہے۔[1]

---

[1] یہ آیت 2 ہجری میں جنگِ بدر کے مال غنیمت کی تقسیم کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس کے بعد رسولؐ اللہ تقریباً نو سال زندہ رہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس مدت میں آنحضرت نے اسلامی معاشرے کے افراد سے ان کی آمدنی یا بچت سے خمس وصول کیا ہو۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے اپنے دورِ حکومت میں زکات کے بارے میں تفصیلی احکام اور ہدایات صادر فرمائیں لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ انہوں نے لوگوں کی آمدنی یا بچت سے خمس وصول کیا ہو۔ بنابراں، خمس صرف مالِ غنیمت پر عائد ہوتا ہے خواہ میدانِ جنگ سے حاصل ہونے والی غنیمت ہو یا کسی اور ذریعے سے بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہونے والا مال ہو جیسا کہ دفن شدہ خزانہ، معادن اور دریاؤں سے حاصل ہونے والے موتی وغیرہ۔ پرائز بانڈ پر ملنے والی انعامی رقم بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔

ذرا تصور کیجئے کہ ایک مزدور روزانہ اجرت کی بنیاد پر مزدوری کرتا ہے۔ اسے روزانہ کے ایک سو روپے ملتے ہیں جن میں سے وہ نوے روپے اپنی ضروریات پر خرچ کرتا ہے اور دس روپے کسی آڑے وقت کے لئے بچا کر رکھ دیتا ہے۔ سال کے آخر پر اس کے پاس 365× 10=3650 روپے جمع ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی کونسی لغت میں اس رقم کو مالِ غنیمت کہا جاسکتا ہے؟ اس بے چارے کی اس حقیر سی بچت کو مال غنیمت قرار دے کر اس سے خمس وصول کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کی تصدیق اس آیت سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کی عملی سیرت سے نہیں ہوتی۔ خمس کے ذیل میں اس مثال پر بھی توجہ فرمائیں: فرض کریں ایک شخص بیس سال کی عمر میں کوئی ملازمت یا کاروبار شروع کرتا ہے۔ تیس سال تک وہ

خمس کہاں صرف کیا جائے؟

مسئلہ: 348 آیتِ خمس کی رُو سے خمس کے چھ مصرف معلوم ہوتے ہیں:

"لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ". (41:8)

اس لحاظ سے مالِ خمس کے چھ حصے کئے جائیں گے جن میں سے تین حصے مالِ امام ہیں اور باقی تین حصے اگر سادات سے مختص ہوں تو پدری اور مادری سادات میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں خمس لے سکتے ہیں۔ پدری سادات سے مراد وہ سادات ہیں جن کا باپ سیّد ہو اور مادری سادات سے مراد وہ سادات ہیں جن کی ماں سیّدانی ہو اور وہ ماں کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب ہوں۔

یہ بات ہرگز محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تمام اولاد اپنی پہلی والدہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے ذریعے رسولؐ اللہ تک پہنچتی ہے۔ اگر سیّد ہونے کیلئے باپ کی طرف سے رسولؐ اللہ سے منسوب ہونا ضروری ہو تو پھر حضرتِ زہرا سلام اللہ علیہا کے علاوہ کوئی سیّد نہیں رہے گا، حتیٰ کہ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے بعد گیارہ آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین بھی

محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتا ہے اور بہت کچھ کما لیتا ہے۔ لیکن اس ساری مدت میں کوئی زکوٰۃ یا خمس ادا نہیں کرتا۔ تیس سال کے بعد کسی مولوی کی باتوں میں آکر خمس ادا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے (زکوٰۃ ادا کرنے کی تو کوئی مولوی بات ہی نہیں کرتا)۔ اب جبکہ یہ شخص خمس ادا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے گھر میں موجود سوئی سے لے کر کار اور مکان کی قیمت تک کا حساب لگائے اور اپنے بنک اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم بھی اس میں جمع کرے اور سب کا پانچواں حصہ بطورِ خمس نکالے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی بھر کی محنت و مشقت اور خون پسینے کی کمائی کو کس بنیاد پر مالِ غنیمت شمار کر کے اس کا خمس ادا کرنے پر زور دیا جا رہا ہے؟ (ہمدانی)

شرفِ سیادت سے محروم ہو جائیں گے۔

یہ بات ہمیشہ آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین اور اُن کے مخالفین لعنت اللہ علیہم کے درمیان زیرِ بحث رہی ہے کہ کیا ماں کی طرف سے رسولؐ اللہ سے منسوب ہونے سے اولادِ رسولؐ ہونا ثابت ہے یا نہیں؟ آئمہ سلام اللہ علیہم اجمعین قرآنی آیات کی رُو سے یہ ثابت کرتے تھے کہ ماں کے ذریعے رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہونے سے بھی اولادِ رسولؐ ہونا صادق آتا ہے۔

علاوہ ازیں مادری سادات کو اولادِ پیغمبرؐ سے مستثنٰی کرنے والوں کے پاس زمانۂ جاہلیت کا ایک شعر اور ایک روایتِ جاہلی کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے۔ وہ جاہلی شعر یہ ہے:

بنونا بنو ابنائنا و بناتنا

بنوهن ابناء الرجال الاغارب

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے بیٹے تو وہ ہیں جو ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہیں اور ہماری بیٹیوں کے بیٹے تو اجنبی مردوں کے بیٹے ہیں۔

حالانکہ اسلام نے جاہلیت کی دُوسری رسوم کی مانند اس جاہلی فکر کو بھی غلط قرار دے کر اس پر خطِ بطلان کھینچ دیا اور ماں اور باپ دونوں کی طرف انتساب کو یکساں قرار دیا، جیسا کہ آیہ شریفہ میں ہے کہ:

''يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ''.(7:86)

''جس نطفہ سے انسان کی تخلیق عمل میں آتی ہے، وہ باپ کی صلب اور ماں کی ترائب سے خارج ہوتا ہے''۔

یوں اس خیال کو باطل ثابت کر دیا کہ بیٹا باپ کے نطفہ سے اور بیٹی ماں کے نطفہ سے وجود میں آتی ہے۔

روایتِ جاہلی جو معنی کے لحاظ سے اس شعر جاہلی سے ہم آہنگ ہے، یہ ہے:

”مَنْ كَانَتْ اُمُّهٗ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ وَاَبُوْهُ مِنْ سَائِرِ قُرَيْشٍ فَاِنَّ الصَّدَقَاتِ تَحِلُّ لَهٗ وَلَيْسَ لَهٗ مِنَ الْخُمُسِ شَیْءٌ لِاَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ اُدْعُوْاهُمْ لِاٰبَائِهِمْ“.

”جس شخص کی ماں بنی ہاشم سے اور باپ دُوسرے قریش سے ہو تو اُس کیلئے صدقات حلال ہیں اور خمس میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہیں ان کے باپ کی طرف نسبت دو“۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیہ شریفہ ”اُدْعُوْاهُمْ لِاٰبَائِهِمْ“ منہ بولے بیٹوں کے متعلق ہے اور بیٹی کی اولاد سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین میں سے کوئی بھی اولادِ رسولؐ خدا نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سب رسولؐ اللہ کی بیٹی حضرتِ زہرا صلوات اللہ علیہا کے ذریعے رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہیں۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ فقہاء کی بھاری اکثریت اس بات پر مصر ہے کہ اس شعر جاہلی اور روایتِ جاہلی کی اتباع کرتے ہوئے ذرّیتِ پیغمبرؐ ہونے کیلئے باپ کے ذریعے منسوب ہونے کو ضروری شرط قرار دیا جائے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اگر سیّد ہونے کیلئے باپ کی طرف سے رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہونا ضروری ہو تو حضرتِ زہرا سلام اللہ علیہا کے علاوہ کوئی بھی سیّد نہیں ہوگا، حتیٰ کہ آئمہ معصومین علیہم السلام، جو حضرتِ زہرا سلام اللہ علیہا کے فرزند ہیں، اپنے باپ کی طرف سے جنابِ رسولِؐ خدا کی طرف سے منسوب نہیں ہیں، وہ بھی سیادت کے اعزاز سے محروم ہو جائیں گے۔

بہرصورت ہماری فقہ کا سیاہ ترین باب یہی ہے کہ شرفِ سیادت صرف اُن لوگوں کو دیا جائے جو باپ کی طرف سے رسولؐ اللہ سے منسوب ہوں اور اگر بالفرض یہ قبول بھی کرلیا جائے کہ انتسابِ پدری ہی موجبِ سیادت ہے تو کیا ہاشم کی طرف منسوب ہونا ہی سیادت کا معیار ہے یا کہ

پیغمبر کی طرف منسوب ہونا یا یہ کہ جنابِ رسولِؐ خدا کی طرف منسوب ہونا اس لئے معیارِ سیادت ہے کہ وہ ہاشم کی نسل سے ہیں اور جو اُن سے منسوب ہوگا، ہاشم سے بھی منسوب ہوگا۔

خمس کی آیت میں ذی القربیٰ سے مراد رسولؐ اللہ کے قرابت دار ہیں، ہاشم کے نہیں۔ بعدازاں **والیتامٰی والمساکین وابن السبیل** اگر سادات سے مختص ہوں تو بھی ذی القربیٰ کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے رسولؐ اللہ کے قرابت دار ہوں گے۔

نتیجہ بحث یہ کہ قرآن وسنت کی رُو سے ذرّیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا صرف باپ کی طرف سے منسوب ہونے میں منحصر نہیں ہے، اس لئے کہ اس انحصار کی دلیل ایک جاہلی شعر اور ایک جاہلی روایت ہے اور ان کی روشنی میں دیا ہوا فتویٰ بھی جاہلی فتویٰ ہے، اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے!

مسئلہ: 349 خمس کے چھ موارد ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے دُوسرا حصہ سادات کیلئے مخصوص نہیں ہے جبکہ پہلا حصہ دین کی دعوت اور تقویت پر صرف کیا جانا چاہئے۔

مسئلہ: 350 خمس کے پہلے تین حصے جن کا مجموعہ سہم امام کہلاتا ہے، خدا، رسولؐ اور آئمہ سلام اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ مختص ہیں۔ انہیں مکلفین میں اُصولِ دین اور فروعِ دین کی تقویت کیلئے صرف کیا جائے گا، اس لئے کہ **لِلّٰہ** کے مصرف تعلیماتِ الوھیت اور **للرسول** تعلیماتِ رسالت اور **لذی القربٰی**، رسولؐ اللہ کے بعد تعلیماتِ امامت ہیں۔ ان سب کا مجموعہ وہ تعلیماتِ اسلامی ہیں جو دین میں اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تعلیماتِ اسلامی کے مبلّغین کیلئے فقیر اور محتاج ہونا شرط نہیں ہے بلکہ اس کی شرط صرف یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ ان ضروری دینی اُمور سے آگاہی کی حاجت رکھتا ہو۔

مسئلہ: 351 خمس کے باقی تین حصے یتیموں، مسکینوں اور ابن السبیل سے مختص ہیں۔ ابن السبیل سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی راہ میں معاشی مشکلات سے دوچار ہوکر معمول کے مطابق مال اور کام سے محروم ہوچکے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تین حصے اُن لوگوں سے مختص ہیں جو یتیم ہونے کی وجہ سے

یا زندگی ساز کاموں سے منقطع ہونے کی وجہ سے یا بے نیاز کرنے والے کاموں کی نارسائی اور کوتاہی کی وجہ سے محتاج ہوں۔یعنی وہ لوگ جو سستی، کاہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے نہیں بلکہ بھرپور معاشی سرگرمیوں کے باوجود اپنی حاجات کو پورا نہیں کر سکتے۔

مسئلہ:352 اگر ایسی اسلامی حکومت قائم ہو جائے جس کی باگ ڈور ایسے رہبر کے ہاتھ میں ہو جو مسلمانوں کا ولی امر ہو اور اسلامی اصولوں کے مطابق اسلامی مملکت کی سربراہی کرتا ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی طرح تمام خمس بھی بیت المال مسلمین کے طور پر اس کے سپرد کر دینا ضروری ہے ورنہ شریعت میں مقررہ مصارف میں اسے خرچ کیا جا سکتا ہے اور یہ آپ کے مرجع تقلید کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

ہاں! اگر مسلمانوں کے عمومی مفادات اور حوزۂ اسلام کی نگہبانی کا تقاضا یہ ہو کہ خمس مرجع تقلید کو دیا جائے تو یہ اور بات ہے۔ یہ بھی صرف اس صورت میں ہوگا جب حوزہ کا انتظام کسی خاص شخص کے ساتھ وابستہ ہو ورنہ خمس کو حوزہ کے تمام سرپرستوں میں ان کی صلاحیت کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

اس بات پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ خمس کو مرجع تقلید کے سپرد کیا جائے، خمس دینے والے کے مرجع تقلید کے سپرد کرنا تو در کنار رہا، مکلّف ہر عادل مجتہد یا ایسے عادل شخص کو سہم امام دے سکتا ہے جس کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ وہ اسے مقررہ شرعی مصارف پر خرچ کرے گا اور مکلّف خود بھی ان مصارف پر صرف کر سکتا ہے۔

مسئلہ:353 قاعدہ ''اَلْخُمُسُ بَعْدَ الْمَؤُنَةِ'' (خمس اخراجات کے بعد ہے) ظاہراً تجارتی اخراجات وغیرہ کے بارے میں ہے۔ خمس دہندہ کے سال بھر کا خرچ ان میں داخل نہیں ہے۔ ''غنمتم'' کی رُو سے جس فائدہ پر خمس لگ رہا ہے، وہ خالص منافع ہے جس میں وہ اصل سرمایہ داخل نہیں ہے جس کے ذریعے منافع حاصل ہوتا ہے۔ بنابرایں اصل سرمایہ کے علاوہ جتنا بھی خالص نفع

باقی بچے، اُس کا خمس دینا واجب ہے مگر یہ کہ ایسا کرنے سے خمس دہندہ کے سال بھر کے اخراجات کیلئے کافی پیسہ نہ بچتا ہو۔ ایسی صورت میں اپنی ضروریات کا حساب کرنے کے بعد خمس ادا کرنا چاہئے۔ بنابرایں واجب یا احتیاطِ واجب یہ ہے کہ مالِ تجارت کا خمس بھی دیگر موارد کی طرح سال بھر کا خرچ مستثنیٰ کئے بغیر خالص منفعت سے ادا کیا جائے۔

علاوہ ازیں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ سال بھر کے اخراجات کا کسی نص میں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا خمس کو سال بھر کے اخراجات کے بعد باقی ماندہ منافع کے ساتھ مختص نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس کے متعلق کوئی نص موجود بھی ہوتی تو اتنی سادگی اور سہولت کے ساتھ اس کے ذریعے "**غنمتم من شئ**" کی تخصیص کرنا ممکن نہ ہوتا۔ چونکہ "**ماغنمتم**" سے مراد خالص نفع ہے، لہٰذا "**الخمس بعدالمئونه**" کو اس کی تفسیر کے طور پر قبول کریں گے۔

اگر سال بھر کے اخراجات کو بھی مستثنیٰ مان لیا جائے تو اس صورت میں مندرجہ ذیل شرائط کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے:

مسئلہ: 354 ضروری ہے کہ سال بھر کے اخراجات کو ہر قسم کے اسراف وتبذیر کے بغیر معمول کے اخراجات کو مستثنیٰ کیا جائے، اس لئے کہ یہی درحقیقت اخراجات ہیں اور ان کے علاوہ جو بھی بلند پروازی کی جائے، وہ اسراف وتبذیر وغیرہ کے زمرہ میں آئے گی۔

مسئلہ: 355 اگر کوئی شخص سال کیلئے مستثنیٰ شدہ اخراجات کو قناعت کے ساتھ خرچ کرے اور سال کے بعد اس میں سے کچھ بچ جائے تو اس ساری بچت کا خمس ادا کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اخراجات میں زیادہ روی کرے، اگرچہ وہ اسراف وتبذیر نہ ہو اور یوں اُسے کوئی بچت حاصل نہ ہو تو اس صورت میں بھی ان غیر ضروری اخراجات کا خمس ادا کرنا ضروری ہے، مثلاً بیوی کو غیر ضروری طور پر بھاری رقم ہدیہ کے طور پر دینا یا سیر وسیاحت کی غرض سے غیر ضروری سفر وغیرہ۔

مسئلہ: 356 جس شخص کا خرچ کسی اور شخص کے ذمہ ہے اور اُسے اپنا مال خرچ کرنے کی

ضرورت نہ ہوتو اس پر واجب ہے کہ اپنی تمام آمدنی کا خمس ادا کرے۔

مسئلہ: 357 اگر کسی شخص کو کسی بھی ذریعے اور کسی بھی عنوان سے کوئی مال ملے اور اُسے معلوم ہو کہ اس کا خمس نہیں دیا گیا ہے تو اس کا خمس ادا کرنا واجب ہے اور اس کے بعد جو کچھ اُس نے خمس کے طور پر ادا کیا ہے، اُس کے برابر مال اس شخص سے وصول کرے جس نے یہ مال دیا تھا مگر یہ کہ جو مال اُس نے لیا ہے، وہ اس کا لازمی شرعی حق نہ ہو جیسا کہ ہبہ اور ہدیہ وغیرہ۔ لیکن اگر وہ مال تجارت یا اجارہ وغیرہ کے عنوان کے تحت ہو اور اس کا خمس نہ دیا گیا ہو تو اس صورت میں اس سے اس مال کا مطالبہ کرسکتا ہے جو اس نے بطور خمس دیا ہے۔

مسئلہ: 358 جس مال کا خمس ادا نہیں کیا گیا، اس سے کوئی معاملہ اور کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! اگر معاملہ عین مال سے نہ ہو بلکہ معمول کے مطابق اسے اپنے ذمہ لیا جائے اور پھر اس مال سے ادا کرے جس کا خمس نہیں دیا گیا ہے تو اس صورت میں معاملہ صحیح ہے اور خمس کی مقدار کے برابر معاملہ میں شریک اور مدِ مقابل کا مقروض ہوگا۔

مسئلہ: 359 خمس، خمس ادا کرنے والے کے پاس ایک امانت ہے جسے حتی الامکان جلد از جلد ادا کر دینا چاہیئے۔ اسے صرف اسی صورت میں مؤخر کیا جا سکتا ہے کہ جب معلوم نہ ہو کہ خمس اس کے مال پر واجب ہوگا یا نہیں۔ پس اگر معلوم ہو تو اس کا خمس فوراً ادا کرنا چاہیئے اور اگر اس کی مقدار معلوم نہ ہو تو کم از کم یقینی مقدار کو فوراً ادا کرے۔ جن لوگوں کی آمدنی معین ہے، اُنہیں آمدنی حاصل ہوتے ہی خمس ادا کر دینا چاہیئے۔

مسئلہ: 360 چونکہ غنمتم سے مراد موجودہ غنیمت اور فائدہ ہے، لہٰذا اگر تجارت کی غرض سے خریدے ہوئے مال کی قیمت بڑھ جائے اور قیمت میں مزید اضافہ کے امکان کے پیش نظر یا کسی اور عقلائی وجہ سے مال کو فروخت کرنے میں تاخیر کر دی جائے اور قیمت بڑھنے کی بجائے کم ہو جائے تو اس مقدار کا خمس واجب نہیں ہے جو بڑھ گئی تھی لیکن اگر فروخت میں یہ تاخیر کسی معقول وجہ سے نہ ہو بلکہ

یہ ایک عمدی ضرر شمار ہوتا ہو تو اس صورت میں ظاہراً اس مقدار کا خمس واجب ہے جو بڑھ گئی تھی۔

مسئلہ: 361 تجارت کیلئے ابتدائی سرمایہ یا زراعت کیلئے زمین یا وہ اوزار جو کام کیلئے ضروری ہیں، اخراجات میں شمار ہوتے ہیں اور ان کا خمس واجب نہیں ہے۔ لیکن وہ سرمایہ جو بعد میں کاروبار کو زائد وسعت دینے کیلئے لگایا جائے، اخراجات میں شمار نہیں ہوگا اور اس کا خمس واجب ہوگا۔

مسئلہ: 362 لڑکی کا معمول کے مطابق جہیز ضروری اخراجات میں سے ہے چاہے بیک وقت اکٹھا خریدا جائے یا بتدریج خریدا جائے اور جو تھوڑا تھوڑا پیسہ جہیز خریدنے کیلئے جمع کیا جاتا رہے، اُس پر سال یا کئی سال گزر جائیں تو اس پر خمس واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 363 اگر اپنے رہائشی مکان کو بہتر اور شان کے مطابق مکان خریدنے کیلئے فروخت کر دیا جائے اور سال گزرنے تک مکان نہ خریدا جاسکے تو اس کے پیسہ پر خمس نہیں ہے، اس لئے کہ یہ آمدنی میں شمار نہیں ہوتا۔ اگر اسے آمدنی کہا جاتا ہو، تب بھی رہائشی مکان کے اخراجات ہونے کی وجہ سے اس پر خمس واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 364 اگر کسی چیز کو ضروری سمجھ کر خرید لیا جائے اور کچھ عرصہ کے بعد اس کی ضرورت نہ رہے تو اس کا خمس دینا واجب ہے۔ مثال کے طور پر طالب علم اگر علمی زندگی کو ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کر لے تو اس پر کتابوں کا خمس ادا کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 365 تجارت، زراعت اور دُوسرے کاموں کے علاوہ جو بھی فائدہ اور منفعت انسان کو ملے، اس کے صرف وہی اخراجات خمس سے مستثنیٰ ہیں جو اس منفعت کو حاصل کرنے پر صرف ہوئے ہوں اور سال بھر کے اخراجات مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔

بنابرایں معدن جس کا نصاب 15 مثقال ہوتا ہے، اگر تین مثقال سونا کان سے 15 مثقال سونا نکالنے پر خرچ ہوا ہو تو باقی بارہ مثقال کا خمس دینا واجب ہے، چاہے اس کے سالانہ اخراجات سے زیادہ ہو یا نہ ہو۔ اگر 15 مثقال سے کم سونا ہو تو اس پر صرف اس صورت میں خمس

واجب ہوگا جب دُوسری آمدنی کو ملا کر سال بھر کے اخراجات کے بعد کچھ بچ رہے۔ گنج یعنی خزانہ کا حکم بھی وہی ہے جو معدن کا ہے۔ ان دونوں میں شرط یہ ہے کہ انسان کی اپنی ملکیت میں ہوں اور اس بات کا علم نہ ہو کہ اس سے پہلے ان کے کوئی مالکان تھے یا نہیں۔

مسئلہ: 366 غواصی (غوطہ خوری) کے ذریعے سمندر اور دریا سے حاصل کی گئی اشیاء میں اُس وقت خمس واجب ہوتا ہے جب ان کی قیمت 18 نخو دسونا ہو۔ اگر اس سے کم ہو تو اسی صورت میں اس پر خمس واجب ہوتا ہے کہ سال کے بعد اس کی مجموعی آمدنی سے زائد ہو۔

مسئلہ: 367 غنیمتِ جنگی میں کوئی خاص نصاب نہیں ہے اور جو کچھ حاصل ہو، سب کا خمس ادا کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 368 اگر مالِ حرام اور مالِ حلال آپس میں مخلوط ہو جائیں تو اس صورت میں اگر حرام کی مقدار معلوم ہو یا اس کے مالکان کو جانتا ہو یا وہ حصہ جو حرام ہے، معلوم ہو تو اس صورت میں یہ مال موارِدِ خمس میں سے نہیں ہے۔ صرف اُس صورت میں اس مال کا خمس واجب ہوگا جہاں معلوم نہ ہو کہ حرام کی مقدار پانچویں حصہ سے کمتر ہے یا بیشتر اور اس کا مالک بھی معلوم نہ ہو تو اس صورت میں اس مال کا خمس ادا کرنے سے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

پس اگر حرام کی مقدار معلوم ہو اور واضح ہو یا اس کے مالکان معلوم ہوں تو اس قسم کے موارد میں، جہاں اس مال کو اس کے مالک کے سپرد کیا جاسکتا ہے، خمس کے وجوب کی مجال باقی نہیں رہتی۔ صرف وہ مالِ حلال جس میں مالِ حرام مخلوط ہو گیا ہو اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ حرام خمس سے کم ہے یا زیادہ اور اس کا مالک بھی معلوم نہ ہو اور مالِ حرام بھی اس کے اپنے مالِ حلال میں اس طرح ملا ہوا ہو کہ اس کی تشخیص ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کا خمس ادا کر کے انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 369 وہ مالِ حلال جس میں حرام مخلوط ہو گیا ہو، اس کے علاوہ باقی چھ موارد میں خمس کا حکم آیت ''وَاعۡلَمُوۡا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ '' سے معلوم ہو جاتا ہے اور ساتواں مورد یعنی حلال یا حرام کا حکم

روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

بنابرایں خمس کے تمام مباحث میں اصلی محور یہی آیہ شریفہ **وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ** ہے جو تمام منافع اور فوائد کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے کہ ہر حلال ذریعے سے جو مال تمہارے ہاتھ لگے، اُس کا 1/5 حصہ بطور خمس واجب اور یا 4/5 حصے تمہاری اپنی ضروریات کے لئے ہیں۔

مسئلہ: 370 اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ "**ماغنمتم**" کو حاصل کرنے پر جو اخراجات صرف ہوئے ہیں، انہی کو مستثنیٰ کیا جائے، نہ کہ سال بھر کے اخراجات کو، اس لئے کہ "**ما غنمتم**" کا طلاق پورے خالص منافع ہوتا ہے، نہ کہ صرف سال بھر کے اخراجات کے بعد بچ جانے والے منافع و فوائد پر۔

پس "**الخمس بعدالمئونة**" یعنی "خمس اخراجات کے بعد ہے"، جس طرح دُوسرے چھ موارد میں سال بھر کے اخراجات کو شامل نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح مالِ تجارت میں بھی سال بھر کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں سال بھر کے اخراجات اس حاصل شدہ مال کے اخراجات نہیں ہیں بلکہ اس کے اخراجات تو وہی ہیں جو اس کو حاصل کرنے کی غرض سے صرف کئے گئے۔

بنابرایں واجب یا کم از کم احتیاط واجب ہے کہ خمس کو تمام منافع سے دیا جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ خمس ادا کرتے وقت سال بھر کے احتمالی اخراجات کو بھی مدِ نظر رکھا جائے تا کہ ایسا نہ ہو کہ خمس دینے والا کل کو خمس کا محتاج ہو جائے۔

اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ تمام آمدنی کا خمس ادا کر کے خمس دینے والا خود محتاج اور تنگ دست نہیں ہو جائے گا، بہتر ہے کہ ایسی ترتیب اختیار کی جائے جس سے یہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ مثال کے طور پر کسی کی آمدنی ماہانہ یا سالانہ ہو یا کوئی اور مقررہ مدت تو اس مدت کے تمام ہونے پر حساب کرے کہ کیا آمدنی میں سے کچھ بچا ہے یا نہیں! اگر بچا ہو تو تمام آمدنی کا خمس اس میں سے ادا کرے۔

چونکہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خمس دراصل زکوٰۃ کا نیا نصاب ہواور زکوٰۃ تمام خالص منفعت میں سال کے اخراجات کو مستثنیٰ کئے بغیر واجب ہوتی ہے، اس سے بھی اس نظریہ کی تقویت ہوتی ہے کہ خمس سال بھر کے اخراجات کو مستثنیٰ کئے بغیر تمام خالص منافع میں واجب ہے۔

اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ ''**ماغنمتم**'' سے مراد صرف جنگی غنیمت نہیں ہے، جب ہم ''**ماغنمتم**'' پر ایک اور تحقیقی نظر ڈالتے ہیں تو بآسانی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام کے تمام ''**ماغنمتم**'' (جو غنیمت تمہیں حاصل ہو) کا خمس ادا کرنا واجب ہے، نہ یہ کہ سال بھر کے اخراجات کے بعد جو کچھ اس میں سے بچ جائے، اُس کا خمس واجب ہوگا اور ''**الخمس بعدالمئونہ**'' (خمس اخراجات کے بعد ہے) جو خمس کے ساتوں موارد پر یکساں طور پر جاری ہوتا ہے، ہرگز اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ مالِ تجارت میں سال کے تمام اخراجات بھی اس میں داخل ہوجائیں اور طالب علموں میں مشہور اصطلاح کے مطابق یہ تخصیص اکثر کا مصداق ہے جو ایک بے ہودہ اور بھونڈی سی بات ہے۔

حدیث ''**الخمس بعدالمئونہ**'' کی رُو سے غنیمت اور فوائد حاصل کرنے کیلئے صرف کئے گئے اخراجات کو اس لئے مستثنیٰ کرتے ہیں کہ غنیمت سے مراد خالص منفعت ہے اور اس پر صرف کئے گئے اخراجات ہرگز اس میں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ بات آیت سے سمجھ میں نہ آتی، تب بھی اس روایت کو قبول کرنا اس قدر مشکل ہوتا، جتنا سال بھر کے اخراجات کے متعلق اسے قبول کرنا مشکل ہے۔

اس مثال پر غور کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ اگر کسی شخص کی خالص سالانہ آمدنی بارہ لاکھ روپے ہو تو اس کا پانچواں حصہ یعنی خمس دو لاکھ چالیس ہزار روپے ہوگا۔ اب اگر اس کے سال بھر کے اخراجات کے بعد یہی رقم اس کی بچت ہو تو اس کا خمس صرف اڑہتالیس ہزار روپے ہوگا جو گزشتہ حساب کے مطابق بننے والے خمس کا پانچواں حصہ ہے۔

اب یہ بات کس طرح قبول کی جاسکتی ہے کہ ''**ماغنمتم**'' کا خمس جو بچت کے خمس کا پانچ

گناہے،اسے تو نظرانداز کر دیا جائے اوراس کے پانچویں حصہ کو''ماغنمتم'' کا خمس قرار دیا جائے!!

خمس لینے والوں کی شرائط

مسئلہ: 371 سہم امام علیہ السلام میں بنیادی اور اصلی شرط مبلغ کی نہیں، تبلیغ کی ضرورت ہے۔اچھی اسلامی تبلیغات کیلئے جس قدر مال کی ضرورت ہو، جس طرح زکوٰۃ میں سے فی سبیل اللہ کے حصہ میں سے اس کیلئے خرچ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح خمس کے سہم امامؑ سے بھی اس مقصد کیلئے خرچ کیا جاسکتا ہے۔

بنابرایں صرف اس لئے کہ چونکہ فلاں شخص دینی علوم کا طالب علم ہے، اسے سہمِ امام کا حقدار قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کیلئے ضروری ہے کہ حال یا مستقبل میں اسلام کی مؤثر تبلیغ کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہو اور نہ ہی کسی شخص کی تبلیغ و ترویج پر سہم امام خرچ کرنا جائز ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص ایسی اہمیت کا حامل ہو کہ اُس کی تبلیغ اور ترویج اسلام کی تبلیغ میں مؤثر حیثیت رکھتی ہو تو اس صورت میں اس کیلئے سہم امام میں سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 372 خمس کا دُوسرا حصہ جو سہم سادات کہلاتا ہے، اگر سادات سے مختص ہو تو اس میں پدری سادات اور مادری سادات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آیہ شریفہ کی روشنی میں یہ حصہ''**والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل**''یعنی یتیموں، مسکینوں اور ابن السبیل میں تقسیم کیا جائے گا اور ظاہراً یتیم کو خمس دینے کیلئے اس کا مسکین ہونا شرط نہیں ہے، اگرچہ مالدار یتیم کو بھی خمس نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہاں مراد متوسط حالت کے یتیم ہیں جنہیں خمس میں سے ایک حصہ دے کر جہاں ان کی نفسیاتی حالت بہتر بنائی جاسکتی ہے، وہاں ان کی مادی ضروریات کو بھی پورا کیا جاتا ہے۔

جہاں تک مالدار یتیم کی بات ہے تو حقیقت یہ ہے کہ مالدار یتیم کی حالت غیر یتیم فقیر کی حالت سے بہتر ہوتی ہے۔ ان دو کے بعد ابن السبیل کی باری آتی ہے جس سے عام طور پر وہ مسافر مراد لیا جاتا ہے جو سفر کے دوران محتاج ہو گیا ہو۔ لیکن درحقیقت اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ

میں سرگرمِ عمل ہونے کی وجہ سے اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کی فرصت نہیں رکھتے، چاہے سفر میں ہوں یا وطن میں، اس لئے کہ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کرنے کی بجائے معمول کے مطابق معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے تو نہ صرف یہ کہ خود محتاج نہ ہوتے بلکہ عین ممکن ہے کہ دُوسروں کی مدد بھی کر سکتے۔

بنابرایں علومِ اسلامی کے وہ طالب علم جو واقعی اسلام سے صحیح واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں، ابن السبیل کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے علاوہ ہر وہ شخص جو اللہ کی راہ میں قدم رکھنے کی وجہ سے اپنی معاشی حالت کی راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا، ابن السبیل کے زمرہ میں آتا ہے۔

بنابرایں اگر کوئی شخص صرف یتیم، مسکین یا ابن السبیل ہو تو وہ صرف اپنا حصہ دریافت کرے گا۔ اگر کسی شخص میں ان تین صفات میں سے کوئی دو یا تینوں صفات پائی جاتی ہوں تو اس کا حصہ بھی اسی اعتبار سے زیادہ ہو گا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص یتیم اور مسکین ہونے کے علاوہ ابن السبیل بھی ہو تو اس کو دُوسروں کی نسبت زیادہ حصہ دیا جائے گا۔

یہ بات جو غلط طور پر مشہور ہو چکی ہے کہ غیر محتاج سیّد بھی محتاج سیّد کی طرح خمس لے سکتا ہے، بالکل بے بنیاد ہے، اس لئے کہ اگر محتاج سیّد بھی خمس پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی صلاحیت اور امکان کے باوجود کام نہ کرے اور بیکاری اور کاہلی کی راہ اختیار کرے تو اسے بھی خمس نہیں دیا جا سکتا۔

بنیادی طور پر بیت المالِ مسلمین صرف اُن لوگوں کی کفالیت اور مدد کیلئے ہے جو کام کرنے کی صلاحیت یا امکان نہ رکھتے ہوں یا ان کی بھرپور کوشش کے باوجود ان کی آمدنی ان کی ضروریات کو پورا نہ کر سکتی ہو کیونکہ اسلام کاہل اور کاہلی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

☆☆☆

زکوٰۃ

مسئلہ: 373 زکوٰۃ کے معنی ہیں پاک کرنا۔ اسلامی اقتصادی ابواب میں اس سے مراد وہ مال ہے جسے دینے والا اور اس کی رُوحانی حالت پاک ہوجاتے ہیں جبکہ لینے والا فقر وافلاس سے پاک ہوجاتا ہے اور معاشرہ بھی معاشی طبقہ بندیوں کی لعنت سے پاک ہوجاتا ہے۔ بہرحال زکوٰۃ کے فوائد بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔

یہ زکوٰۃ جسے سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت 60 کی رُو سے آٹھ چیزوں پر، جو درحقیقت اسلامی حکومت کے اخراجات ہیں، خرچ کرنا واجب ہے۔ ان میں دو فقراء اور مساکین ہیں۔ یہ زکوٰۃ اس قدر زیادہ ہونی چاہئے جس سے ان آٹھ ضروری موارد کی تمام ضروریات پوری ہوسکیں۔ اگر زکوٰۃ، جیسا کہ مشہور ہے، صرف 9 اشیاء میں واجب ہو تو اس سے ان آٹھ موارد کی ضروریات تو درکنار، صرف فقراء کی ضروریات کا ایک فیصد بھی بمشکل پورا ہوگا۔

قرآن شریف کی تیس کے قریب آیات زکوٰۃ کو تمام اموال پر واجب کررہی ہیں۔ اسی طرح رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ سے مروی سو کے قریب روایات کی رُو سے زکوٰۃ صرف نو چیزوں پر نہیں بلکہ تمام اموال پر واجب ہے۔

جو روایت یہ کہتی ہے کہ رسولؐ اللہ نے نو چیزوں کے علاوہ باقی اشیاء پر زکوٰۃ معاف کردی، ’وعفی رسول اللہ عماسوی ذلک‘‘، اس روایت کے راوی قابل اعتماد نہ ہونے کے علاوہ یہ اس لحاظ سے بھی قابل قبول نہیں ہے کہ رسولؐ اللہ کا کام احکامِ خدا کو اس کے بندوں تک پہنچانا ہے اور وہ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

مسئلہ: 374 نو (9) مشہور اشیاء کی زکوٰۃ کا نصاب معروف ہے اور اس کی وضاحت کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔ دُوسری اشیاء کی زکوٰۃ کے نصاب کا میزان ان کی قیمت کے متناسب ہے، مثلاً اگر انسان کے پاس اتنا مال ہو جس کی قیمت 15 مثقال سونے کی قیمت کے برابر ہو تو اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ زرعی پیداوار اور حیوانات کے بارے میں زرعی پیداوار کی زکوٰۃ کا نصاب وہی ہے جو گندم اور جو کی زکوٰۃ کا ہے جبکہ حلال گوشت حیوانات کی زکوٰۃ کا نصاب اُونٹ، گائے اور بھیڑ بکری کے نصاب میں سے اس چیز کے نصاب کے مطابق ہوگا جس سے یہ حیوان مشابہت رکھتا ہو۔

خمس کی طرح زکوٰۃ میں بھی سال بھر کے اخراجات کو مستثنیٰ نہیں کرنا چاہئے بلکہ سال بھر کے اخراجات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اصل مال پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ نو مشہور چیزوں کی زکوٰۃ میں جن شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے، اُن میں سے کوئی شرط واقعیت نہیں رکھتی بلکہ صرف نصاب کی حد تک ہونا ہی اس کی شرط ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں ہے۔ اگر زکوٰۃ کو صرف انہی نو چیزوں میں ان حیرت انگیز قیود اور شرائط کے ساتھ واجب سمجھا جائے تو ہر فقیر کے حصہ میں ماہانہ تقریباً دو یا تین پیسے آئیں گے اور زکوٰۃ کے دُوسرے حصہ داروں کے حصے میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں آئے گی۔

زکوٰۃ نماز کے ہم پایہ ہے اور عقائدِ اصلی کے بعد ایمان کی اصلی شرط ہے۔ زکوٰۃ کا ذکر قرآن شریف کی تیس آیات میں اسی لفظ زکوٰۃ کے ساتھ ہوا ہے جبکہ خمس کے متعلق صرف ایک ہی آیت ہے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے آٹھ اہم ترین خلاؤں کو پر کرنے کیلئے مقرر کی گئی ہے، لہٰذا یہ کیونکر اس قدر کم ہو سکتی ہے کہ فقراء کی ایک دن کی ضرورت بھی پوری نہ کر سکتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور دانائی سے کس قدر بعید ہے کہ زکوٰۃ، جو مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کو سنوارنے کیلئے مقرر کی گئی ہے، ایسی ناہمواری اور افسوس ناک صورتِ حال میں گرفتار کر دی جائے جو حیرت اور تمسخر کا باعث ہو۔

☆☆☆

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف

مسئلہ: 375 فقراء۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ گویا ناداری اور افلاس نے ان کی کمر توڑ رکھی ہے اور یہ اپنی اقتصادی حالت کو سنوارنے کیلئے کوئی حرکت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

مسئلہ: 376 مساکین۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حالت فقراء سے بہتر ہے، اس لئے کہ وہ کمر شکستہ اور یہ خاک نشین ہیں۔

مسئلہ: 377 محکمہ زکوٰۃ کے ملازمین، جنہیں قرآن میں عاملین علیہا کہا گیا ہے۔

مسئلہ: 378 وہ لوگ جنہیں کچھ مال دے کر ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کیا جا سکتا ہو۔ انہیں قرآن شریف میں **مؤلفة القلوب** کہا گیا ہے۔

مسئلہ: 379 بند گردنوں کو آزاد کرنا۔ گزشتہ زمانہ میں اس سے مراد زرخرید غلام اور کنیزیں تھیں۔ لیکن اب جبکہ غلام اور کنیزیں موجود نہیں ہیں، اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو مشکلات میں گرفتار ہوں اور زکوٰۃ کا ایک حصہ صرف کر کے انہیں نجات دلائی جا سکتی ہے۔ قرآن شریف میں انہیں ''**الرقاب**'' کہا گیا ہے۔

مسئلہ: 380 وہ مقروض جو گناہ یا کوتاہی یا اسراف و تبذیر کے بغیر نادانستہ طور پر حالات کے ہاتھوں مقروض ہو گئے ہوں اور زندگی گزارنا اُن کیلئے مشکل ہو گیا ہو، اُنہیں قرآن شریف میں ''**غارمین**'' کا نام دیا گیا ہے۔

مسئلہ: 381 اللہ کی راہ میں، جسے قرآن شریف میں فی سبیل اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس میں ایمان کے تمام عمومی اور ہمہ گیر پہلو داخل ہیں۔

مسئلہ: 382 **ابن السبیل**۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح وقف کر چکے ہوں کہ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کی فرصت یا صلاحیت سے محروم ہو چکے ہوں۔ اس کی تفصیل خمس کے احکام میں بیان ہو چکی ہے۔

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ یہ آٹھ مصارف اسلام اور مسلمانوں کی تمام اجتماعی اور انفرادی ضروریات کا احاطہ کرتے ہوئے اسلامی حکومت کی اقتصادی حالت کو ہموار کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ زکوٰۃ کے مستحقین کی فہرست میں جہاں فقراء اور مساکین کا ذکر آتا ہے، اس سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو کسی جسمانی یا فکری یا کسی اور نارسائی کی وجہ سے اپنی معاشی حالت کو کم از کم ضرورت کی حد تک بہتر نہیں بنا سکتے۔ صرف انہی کو ضروریات کے مطابق حصہ دیا جائے گا۔ جو لوگ سستی اور کاہلی یا آرام طلبی کی وجہ سے جان بوجھ کر محنت نہیں کرتے، وہ فقراء اور مساکین کی صف میں شامل نہیں کیے جاسکتے۔

چونکہ سب کی ضروریات یکساں نہیں ہیں، لہٰذا زکوٰۃ کا مال ان آٹھ گروہوں میں مساوی تقسیم نہیں ہوگا بلکہ ہر مورد پر اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے گا۔

مسئلہ: 383 زکوٰۃ لینا غیر سادات کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ صرف رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ پر زکوٰۃ حرام ہے۔ پس جس طرح خمس کے آخری تین حصے غیر سادات کو دیئے جاسکتے ہیں، اسی طرح زکوٰۃ بھی سادات کو دی جاسکتی ہے اور یہ روایت کہ **ھی او ساخ ما فی ایدی الناس**، یعنی "زکوٰۃ لوگوں کے مال کا میل کچیل ہے، لہٰذا سادات پر حرام ہے، یہ روایت بذاتِ خود جعلی روایات بنانے والوں کے ہاتھ کا میل کچیل ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ بھی اسی مال میں سے دی جاتی ہے جس میں سے خمس دیا جاتا ہے۔ پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خمس تو سب پاک و پاکیزہ ہے اور زکوٰۃ ناپاک اور میل کچیل؟

علاوہ ازیں یہ کس قدر ظالمانہ تقسیم ہے کہ گندہ اور ناپاک مال غیر سادات کو اور صاف ستھرا اور پاکیزہ مال سادات کو دیا جائے، حالانکہ بہت سے غیر سادات ایسے ہیں جو بہت سے سادات سے بہتر اور پاکیزہ سیرت واخلاق کے مالک ہیں۔

اگر بالفرض ُھی او ساخ ما فی ایدی الناس ' کےکوئی صحیح معنی موجود بھی ہوں تو نصوص کی رُو سے صرف رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ پر زکوٰۃ حرام ہے نہ کہ تمام سادات پر۔

بنابراایں نہ خمس سادات کیلئے مختص ہے اور نہ زکوٰۃ غیر سادات کیلئے بلکہ خمس اور زکوٰۃ اُن سب کو دیا جاسکتا ہے جن کا آیاتِ خمس وزکوٰۃ میں ذکر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ والا صفات اس سے بلند و بالا ہے کہ تمام اموال کا خمس تو اپنی اولاد کو دے دیں اور وہ بھی اُس اولاد کو جو باپ کے ذریعے ان سے منسوب ہو جبکہ زکوٰۃ کو تمام غیر سادات کیلئے مختص کر دیں۔ اگر معمولی سے فکر اور حساب سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تقسیم کی رُو سے تمام اموال کا خمس جو 20 فیصد ہے، سادات کے ساتھ مختص ہے جو پوری اُمت میں بمشکل 10 فیصد ہوں گے اور نو اشیاء کا بطور اوسط 6 فیصد باقی 90 فیصد کیلئے جو غیر سادات ہیں۔

کیا خمس وزکوٰۃ کا قانون بنانے والا اس قدر جاہل تھا کہ ریاضی کے ابتدائی ترین اصول کو بھی نہیں جانتا تھا یا اس قدر ظالم تھا کہ اپنی اولاد کیلئے تو اتنا مہربان کہ ہر ایک کو روزانہ ہزاروں روپے عطا کرے اور غیر سادات کیلئے اس قدر نامہربان کہ ان کا حصہ اس قدر کم مقرر کرے کہ ان میں سے ہر ایک کو ماہانہ ایک روپیہ بھی نہ ملے۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ نزولِ آیتِ خمس کے وقت جنابِ رسولِؐ خدا کی اولاد صرف حضرتِ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں۔ ان کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام اور چند انگشت شمار بنی ہاشم کیلئے تو سارا سہم سادات جو تمام مسلمانوں کے تمام اموال کا 10 فیصد ہے، مقرر کر دیا جائے اور نو اشیاء کا 6 فیصد اُمت کے 90 فیصد فقراء کیلئے! ایسا اندھا اور بے حساب ظلم تو ظالمانہ ترین سرمایہ دارانہ اقتصادی قوانین میں بھی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا جبکہ اسلام کا اقتصادی نظام تو عدالت اور رحمت کی بلند ترین چوٹیوں کو چھو رہا ہے۔

بنابرایں یا توخمس صرف جنگی غنائم کے ساتھ مختص ہے یا زکوٰۃ کا آخری نصاب ہے جو گزشتہ نصابوں کو منسوخ کررہا ہے یا یہ کہ خمس وزکوٰۃ، جو بطورِ مجموعی مسلمانوں کی تمام خالص آمدنی کا 26 فیصد ہے، تمام فقراء اور مساکین اور حاجت مندوں میں عادلانہ طور پر تقسیم ہونا چاہئے۔

جو شخص خود زکوٰۃ کا مستحق ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، سوائے محکمہ زکوٰۃ کے ملازمین کے، اس لئے کہ انہیں زکوٰۃ فقیر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے کام کی اُجرت کے طور پر دی جاتی ہے۔

زکوٰۃِ فطرہ

مسئلہ: 384 ہر مسلمان مکلّف جو سالانہ، ماہانہ یا روزانہ کا خرچ رکھتا ہے، اُس پر واجب ہے کہ اپنا اور اُن لوگوں کا فطرہ ادا کرے جن کی کفالت اُس کے ذمہ ہے، خواہ اُس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے ہوں یا نہیں۔ روزے نہ رکھنے کی صورت میں چاہے کسی عذر کی وجہ سے نہ رکھے ہوں یا بغیر عذر کے۔

مسئلہ: 385 حدیث ''ضممت الی عیالک'' (جسے تو نے اپنے خاندان میں ضم کرلیا ہے) کی رُو سے صرف اس شخص کا فطرہ آپ پر واجب ہے جس کا نفقہ آپ پر واجب ہو۔ پس ایک یا ایک سے زیادہ راتیں رہنے والا مہمان چونکہ آپ کا واجب النفقہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا فطرہ آپ پر واجب نہیں ہے۔ خاص طور پر جبکہ وہ محتاج بھی نہ ہو یا یہ کہ بغیر دعوت کے آپ کا مہمان بنا ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص عید کی شب آپ کا واجب النفقہ ہوجائے تو اگرچہ اب تک اُس نے کچھ نہ کھایا ہو، اُس کا فطرہ آپ پر واجب ہوگا مگر یہ کہ وہ خود ادا کرے۔

مسئلہ: 386 اگر کوئی شخص شبِ عید کے علاوہ دُوسری راتوں میں آپ کا مہمان ہو تو اس کا فطرہ اس صورت میں آپ پر واجب ہوگا جب وہ آپ کے ہاں سے کھانا کھانے والا شمار ہو۔ بنابرایں اگر عید کی رات سے دو تین رات پہلے آپ کا مہمان ہو اور عید کی شام آپ کے پاس نہ رہا ہو تو اس کا

فطرہ آپ پر واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 387 کسی کے فطرہ کا آپ پر واجب ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ شوال کا چاند طلوع ہونے سے قبل آپ کا مہمان ہو۔ اگر طلوعِ ہلال کے بعد آپ کا مہمان ہو تو اس کا فطرہ آپ پر واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 388 وہ مہمان جو آپ کی مرضی کے بغیر آپ کے پاس آیا ہے، اس کا فطرہ ادا کرنا آپ پر واجب نہیں ہے، اس لئے کہ نہ تو وہ آپ سے کھانا کھانے والا کہلاتا ہے اور نہ مہمان۔ ہاں! اگر عرفِ عام میں وہ آپ کا مہمان شمار ہوتا ہو تو اس صورت میں اس کا فطرہ آپ پر واجب ہے۔

مسئلہ: 389 جس کا فطرہ دینا آپ پر واجب ہے، اگر اپنا فطرہ خود ادا کر دے تو اس کا فطرہ آپ سے ساقط ہو جائے گا۔ اگر وہ خود نہ دے تو اس کا فطرہ آپ کے ذمہ ہے۔ اگر آپ نہ دیں اور وہ خود بھی فقیر نہ ہو تو وہ اپنا فطرہ خود ادا کرے، اس لئے کہ آپ کا ادا کرنا اُس کی طرف سے ہے نہ کہ اپنی طرف سے۔

مسئلہ: 390 فطرہ کی مقدار تین کلوگرام وہ شے ہے جو انسان اور اُس کے اہل وعیال کی عام خوراک ہے۔ اگر یہ عام خوراک چاول ہوں تو تین کلوگرام چاول، گوشت ہو تو گوشت۔ بہر حال جو چیز عام طور پر خوراک ہو، وہی فطرہ ہوگی اور اگر عام طور پر گوشت، چاول اور روٹی کا مخلوط کسی کی خوراک ہو تو گوشت، روٹی اور چاول کے مخلوط کی تین کلوگرام مقدار فطرہ کے طور پر ادا کرنا واجب ہے۔

اگر کسی شخص کی عام خوراک کوئی ایک شے نہ ہو بلکہ چند چیزیں یکساں طور پر استعمال ہوتی ہوں تو اگر ممکن ہو تو ان سب کو فطرہ میں شامل کیا جائے ورنہ اہل شہر کی معمول کی خوراک میں سے فطرہ دے۔ اس میں بنیادی اصول یہی ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی معمول کی خوراک سے فطرہ ادا کیا جائے تا کہ مساکین بھی اسی حساب سے بہرہ مند ہوں۔

مسئلہ: 391 ہر فرد کو کم از کم ایک فرد کا فطرہ ادا کرنا چاہئے۔ فطرہ کے مصارف بھی وہی ہیں جو

عام زکوٰۃ کے ہیں۔اگر فطرہ دینے والے کے رشتہ داروں میں کوئی آبرومند مسکین ہوتو اُسے دُوسروں پر فوقیت اور تقدم حاصل ہے۔

مسئلہ: 392 زکوٰۃِ فطرہ اور عام زکوٰۃ لینے والے کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ اُسے زکوٰۃ دی جارہی ہے۔اگر اُسے یہ بتانے میں اُس کی توہین ہوتو بتانا جائز بھی نہیں ہے اور بظاہر ہدیہ کی صورت میں زکوٰۃ کی نیت کے ساتھ ادا کرنا کافی ہے۔

حج

حج اسلام کے فرعی احکام کے پانچ اہم ترین ستونوں میں سے ایک ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کی ایک سورۃ کو سورۂ حج کا نام دیا گیا ہے اور مختلف مناسبت سے کئی بار قرآن شریف میں اس کا ذکر آیا ہے۔ان میں سے نو بار لفظ حَج اور ایک بار لفظ حِج استعمال ہوا ہے۔

حَج کے معنی زیارت کا قصد کرنا اور حج کے معنی زیارتِ مقصودہ ہیں یعنی وہ زیارت جس کا قصد اور ارادہ کیا گیا ہو۔

کعبہ مکرمہ جو حج کی اصلی بنیاد ہے،قرآن شریف میں اس کا ذکر سولہ مرتبہ آیا ہے جن میں سے تین جگہ اسے بیت اللہ (اللہ کا گھر) قرار دیا گیا ہے اور تین جگہ لوگوں کا گھر کہا گیا ہے۔باقی دس مقامات پر صرف ''البیت''،یعنی گھر سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے مراد خدا اور لوگوں کا گھر ہے۔

یہ خدا کا گھر اس لئے ہے کہ خدا کی زیارت کی علامت ہے اور لوگوں کا گھر اس لحاظ سے ہے کہ وہ یہاں اللہ کی زیارت کیلئے آتے ہیں۔دُوسرے الفاظ میں یہ خدا کا گھر ہے،لوگوں کی مصلحت کیلئے اور لوگوں کا گھر ہے خدا کی عبادت کیلئے۔

حج اگرچہ ایک الٰہی فریضہ ہے لیکن یہ تمام اجتماعی اور انفرادی الٰہی فرائض کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہے کہ حج سارا اسلام ہے جس میں تمام اصولِ دین اور فروعِ دین پائے جاتے ہیں۔اگر حاجی کو علم ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے تو اسے اعمال وحرکت وبرکت سے لبریز اسلام کی

مکمل تصویر حج کے آئینے میں نظر آئے گی۔

جیسا کہ حج کے متعلق اپنی الگ اور مفصل کتاب ''اسرار، مناسک اور ادلہ حج'' میں ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے، مناسکِ حج ہمیں تمام تعمیری اور زندگی ساز درس دیتے ہیں۔ صرف احرام سے ہی ہم تیس سے زیادہ درس سیکھتے ہیں جن میں سے چار درس اثباتی اور تعمیری ہیں اور بیس درس سلبی۔ یہ سب اخلاق و کردار کی پاکیزگی سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ طواف، سعی، تقصیر اور حج و عمرہ کے دیگر مناسک سب کے سب بہت مفید اور تعمیری درس ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حج اور عمرہ میں صرف نیت، عمل اور توقف ہے اور اس میں سوائے **لبیک اللّٰھم لبیک** کہنے اور نمازِ طواف کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے:

''اے حاجی! تو ہمیشہ الفاظ کو تو ادا کرتا رہا ہے مگر تیری زندگی میں عمل کا چنداں نام ونشان نہیں تھا۔ لیکن اب حج کے میدان میں اسلام کی عملی مشق، نیت، عمل اور خودسازی کر۔ ایسا عمل جو علامت ہے، راز ہے، اشارہ ہے جو مسلمان کو زندگی کا سلیقہ اور جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے''۔

حج بھی تمام عبادات کی طرح ایک معرفتی و باطنی اور دُوسرا عملی وظاہری پہلو رکھتا ہے۔ معرفتی پہلو کا تعلق فقہِ اکبر سے اور عملی پہلو کا تعلق فقہِ اصغر سے ہے۔ ان دونوں سے مفصل آگاہی حاصل کرنے کیلئے ہماری کتاب ''اسرار و مناسک اور ادلہ حج'' کی طرف رجوع کیا جائے۔

مسئلہ: 393 حج یا عمرہ کے واجب ہونے کی شرط صرف یہ ہے کہ انسان عسر وحرج کے بغیر اپنا فرض ادا کرسکتا ہو، کہ نہ تو اس کی تیاری کیلئے کسی قسم کا عسر وحرج پیش آئے اور نہ ہی اس کی ادائیگی کے دوران یا اس کے بعد، اس لئے کہ ہر انسان کی استطاعت اس کی توانائی کے مطابق ہوتی ہے یعنی جب عسر وحرج کی صورت پیدا ہو جائے تو استطاعت باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا اگر کوئی شخص صرف عمرۂ مفردہ کی استطاعت رکھتا ہو تو صرف عمرۂ مفردہ ہی اُس پر واجب ہے اور جب حج کی استطاعت پیدا ہو جائے تو

اگراُس کا فریضہ حج تمتع ہوتو حج وعمرہ کو باہم ادا کرے اور اگراُس کا فریضہ حجِ افراد یا حجِ قرآن ہو، جن کا عمرہ حج سے الگ انجام پاتا ہے تو چونکہ عمرہ پہلے کر چکا ہے، لہٰذا صرف حج ہی اس صورت میں واجب ہوگا۔

مسئلہ: 394 اگر انسان فریضہ حج کو ادا کرنے کی وجہ سے کوئی اور فریضہ ادا نہ کرسکتا ہو یا کسی فعلِ حرام کا ارتکاب کرنے پر مجبور ہوتو ایسی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ حج اور دُوسرے فریضہ یا حرام میں سے کس کی اہمیت زیادہ ہے۔ پس اگر حج کی اہمیت زیادہ ہوتو حج واجب ہوگا اور اگر یہ دونوں اہمیت میں مساوی ہوں تو پھر انسان کو اختیار ہے کہ جسے چاہے، انجام دے اور جسے چاہے، ترک کردے۔ اگر حج کی اہمیت کم ہوتو اس صورت میں حج نہ صرف یہ کہ واجب یا جائز نہیں بلکہ حرام ہوگا۔

مسئلہ: 395 اگر کوئی ایسا محترم ذریعہ جو مؤمن کے احترام کے منافی نہ ہو، حج یا عمرہ کو ادا کرنے کا امکان فراہم کردے تو ایسی صورت میں انسان مستطیع ہے۔ اس پر حج یا عمرہ واجب ہے اور اسے ترک کرنا حرام ہے۔ مثال کے طور پر اگر حجاج کیلئے مناسکِ حج کے معلم، باورچی یا مترجم وغیرہ کی ضرورت ہو اور کوئی شخص عسر وحرج کے بغیر یہ کام کرسکتا ہو اور یہ اُس کے احترام کے منافی بھی نہ ہوتو اس پر حج واجب ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص حج کی ادائیگی کے لئے ہر قسم کے امکانات رکھتا ہو لیکن مثال کے طور پر پاسپورٹ حاصل کرنے یا کسی اور مقدمہ سفر کو انجام دینے کے لئے مجبور ہو کہ اپنے احترام کے منافی کوئی کام انجام دے یا خود کو ذلیل کرے تو اس صورت میں نہ صرف اس پر حج واجب نہیں بلکہ بعض اوقات حرام بھی ہوسکتا ہے۔

بہر حال استطاعتِ حج میں تمام عقلی، شرعی، عرفی اور مالی توانائیاں داخل ہیں جن کی تفصیل کیلئے ''اسرار، مناسک اور ادلہ حج'' کی طرف رجوع کیا جائے۔

مسئلہ: 396 جو شخص واجب الحج ہے، وہ اپنی استطاعت کے سال میں کسی دُوسرے کیلئے اُجرت پر حج نہیں کرسکتا۔ اگر ایسا کرے تو اُس کا اجارہ باطل ہے اور اُجرت کے پیسے واپس کرنا واجب

ہے۔اس کے اپنے حج کی صحت بھی قابل غور ہے، اگرچہ اس لحاظ سے اس کے صحیح ہونے کی صورت پیدا ہوسکتی ہے کہ موجودہ حج اس کا اپنا فریضہ ہے اور کسی اور کی نیت سے اس کی ادائیگی اس کے فرض کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ اُس کا اپنا حج شمار ہوگا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ اگر ماہِ رمضان میں کوئی شخص کسی اور کیلئے روزہ رکھے تو وہ روزہ رکھنے والے کا اپنا روزہ شمار ہوگا۔

مسئلہ: 397 اگر کوئی شخص قرض لے کر، جسے بعد میں بآسانی ادا کرسکتا ہو، حج یا عمرہ ادا کرسکے اور یہ اُس کے احترام کے منافی بھی نہ ہو تو یہ شخص مستطیع اور واجب الحج یا واجب العمرہ ہے، اس لئے کہ استطاعت، توانائی ہی کو کہتے ہیں جو اُس کو حاصل ہے۔

مسئلہ: 398 اگر کوئی شخص آپ کو حج یا عمرہ کے اخراجات دینے کی پیشکش کرے جو آپ کے احترام کے منافی اور موجبِ عسر وحرج نہ ہو تو اس پیشکش کو قبول کرنا واجب ہے۔



اسلام کے اقتصادی احکام

تجارت

تجارت رزقِ حلال کمانے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ".

"اے اہلِ ایمان! اپنے اموال کو ناحق اور باطل طریقے پر نہ کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری باہم رضامندی کے ساتھ کوئی تجارت ہو"۔(29:4)

اس آیت میں ہر قسم کی باطل خوری سے تجارت کا استثناء اس لئے عمل میں آیا ہے کہ یہ حلال کمانے کا بہترین نمونہ ہے۔ اگر چہ اجارہ، زراعت اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے حلال کام ہیں۔

اس آیت میں تجارت کو باطل خوری سے استثناء کرنا استثنائے منقطع کے زمرہ میں آتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کی باطل خوری اور مفت خوری بلا استثناء حرام اور ہر قسم کی غیر مفت خوری مکمل طور پر حلال ہے جس کا اعلیٰ ترین نمونہ تجارت ہے۔

تجارت خرید و فروخت میں منحصر نہیں ہے جیسا کہ سورۂ نور میں "بیع" کو تجارت کے مقابل قرار دیا گیا ہے:

"رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ".(37:24)

"ایسے مرد جنہیں تجارت اور بیع، اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے"۔

اگر چہ تجارت اور بیع کے درمیان یہ ہم آہنگی بیع کو بہترین تجارت قرار دے ہی ہے، جیسا

کہ خود تجارت بہترین معاشی فعالیت ہے۔

چونکہ تجارت کو بیع کے مقابل و برابر قرار دیا گیا ہے اور تجارت کے لغوی معنی منفعت حاصل کرنے کیلئے سرمایہ کو کام میں لگانا ہیں، بنابرایں بیع مطلق اور بیع شرط کے علاوہ اجارہ، زراعت، مضاربہ، مساقات اور اس طرح کی تمام دُوسری معاشی سرگرمیاں سب کی سب تجارت کے زمرہ میں آتی ہیں۔اس لحاظ سے ہر قسم کا مالی لین دین اور تمام علمی، فکری اور جسمانی کام سب کے سب تجارت ہیں۔

یہ بات واضح اور مسلّم ہے کہ اسلام محنت اور عمل کا دین ہے۔لہٰذا زندگی کے ہر شعبے کی طرح اقتصادی اور معاشی شعبے میں بھی تمام علمی، فکری، عقلی اور جسمانی توانائیوں اور زمین اور دُوسرے طبیعی ذخائر میں پنہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے حلال طور پر بہرہ مند ہونا چاہئے۔جیسا کہ آیہ شریفہ:

”یٰٓاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡهِ“. (6:84)

”اے انسان! تجھے بہت محنت اور مشقت کے بعد ہی اپنے رب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوسکتا ہے“۔

اس آیت کی رُو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرعِ مقدسِ اسلام کی اساس محنت اور دائمی کوشش پر ہے۔جو شخص کام کرنے کی توانائی وصلاحیت رکھتا ہو اور پھر بیکار رہے تو یہی اس کیلئے سب سے برا کام ہے اور سب سے بڑا عیب ہے جو دُوسرے فکری و عملی مفاسد کا بھی سرچشمہ اور منبع ہے۔مختصر یہ کہ مسلمان کو زندگی کے تمام شعبوں میں تمام جسمانی اور رُوحانی توانائیوں کے ساتھ مہاجر اور مجاہد ہونا چاہئے۔

جس طرح اسلام کی نظر میں بیکاری مذموم ہے، اسی طرح بیگاری بھی مذموم ہے کہ آپ کسی کی قوت اور طاقت کے زیر اثر کسی کیلئے کام کریں اور اپنی اُجرت طلب نہ کریں، اس لئے کہ بیکاری مفت خوری ہے اور بیگاری دُوسروں کو مفت کھلانا یعنی مفت خورانی ہے اور یہ دونوں مذموم وحرام ہیں۔

ان کے درمیان تیسرا راستہ ہی صحیح اور قابل تعریف ہے جو ''تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ''یعنی (باہمی رضامندی سے تجارت) ہے کہ کام اس طرح کیا جائے جس کا فائدہ کام کرنے والے کے علاوہ دُوسروں کو بھی ہو، البتہ قیمت کے ساتھ۔

جو لوگ کام کرنے کی توانائی نہیں رکھتے یا کسی زیادہ اہم کام میں مشغول ہوں یا اپنی تمام کوشش کے باوجود کافی آمدنی نہ رکھتے ہوں، یہ بیت المال سے عادلانہ استفادہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ البتہ صرف عمامہ سر پر رکھ لینے یا کشکول اور بوریا ہاتھ میں لے لینے سے یا سیّد ہونے کی وجہ سے خمس وزکوٰۃ کی رقوم کا استحقاق پیدا نہیں ہو جاتا۔

کہتے ہیں کسی سیّد سے پوچھا گیا کہ تم کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ میں سیّدی کرتا ہوں۔ کسی شیخ سے یہی سوال کیا گیا تو اُس نے کہا کہ میرا پیشہ شیخی ہے۔ اسلام اس طرح کی ہر قسم کی مفت خوری کا مخالف ہے۔ چونکہ تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی طرح متحد اور ایک دُوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہونا چاہیئے، لہٰذا انہیں اپنے اموال کا ایک حصہ اپنے اُن بھائیوں پر خرچ کرنے کیلئے دینا چاہیئے جو یا تو بالکل کام کرنے کی توانائی نہیں رکھتے یا پھر پوری کوشش کے بعد بھی ان کی آمدنی ان کی ضروریات کیلئے کافی نہیں ہوتی۔

خرید وفروخت

آیہ کریمہ ''اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ ''(اللہ نے بیچنے کو حلال قرار دیا ہے، 275:2) ایک عام قاعدہ اور قانون کی حیثیت سے ہر قسم کی بیع یعنی فروخت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ عمومیت جسے اصطلاح میں اطلاق کہا جاتا ہے، صرف ایک قاعدہ اور قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ہر گز یہ معنی نہیں ہیں کہ بلا استثناء ہر قسم کی خرید وفروخت جائز اور مباح ہو، اس لئے کہ یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر قوم اور ہر معاشرے میں خرید وفروخت کی کچھ شرائط ہوتی ہیں جن کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلام، جو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح اور مکمل رہنمائی کرتا ہے اور عدل وانصاف کو ہر جگہ

اور ہر حالت میں اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں تحقیق اور جستجو کرکے ''اَحَلَّ اللّٰـهُ الْبَیْعَ '' کی شرائط کو معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہیں۔

اگر کسی مقام پر خرید و فروخت کے متعلق کسی احتمالی شرط پر کوئی دلیل موجود نہ ہو تو صرف اسی صورت میں اس قاعدہ کی پیروی کی جائے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے ہر قسم کی خرید و فروخت کو جائز اور مباح جاننے لگیں۔

اس کے بعد آیہ شریفہ ''لَاتَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ'' (اپنے اموال کو ناحق اور باطل طور پر نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو) کی رُو سے ہر قسم کی مفت خوری کو حرام اور مذموم قرار دیا گیا ہے۔ البتہ باہمی رضامندی سے انجام پانے والی تجارت کو مفت خوری سے دُور، حلال خوری کے بہترین نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ صرف تجارت ہی مفت خوری سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ تمام عاقلانہ و عادلانہ معاملات جو اشارتاً 'تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ' کے زمرہ میں اور صراحتاً ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (اپنے وعدوں کو وفا کرو) کے زمرے میں آتے ہیں، یہ سب شرعی لحاظ سے صحیح ہیں اور ''وحرم الربا'' (سود کو حرام قرار دیا گیا ہے) جو ''اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ '' کے بعد مذکور ہوا ہے، کی رُو سے ربا یعنی اپنے حق سے زیادہ لینے کو حرام کر دیا گیا ہے جو درحقیقت مفت خوری کی بدترین قسم ہے۔

آیہ شریفہ ''وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى'' (اور یہ کہ انسان کیلئے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، 39:53) کی رُو سے صرف وہی کمائی جائز اور حلال ہے جو محنت اور کوشش سے حاصل کی گئی ہو۔

بنا بر ایں اسلامی اقتصادی نظام کی اساس اور بنیاد یہ ہے کہ ہر قسم کی مفت خوری مکمل طور پر حرام اور ممنوع اور صرف محنت اور کوشش کی کمائی حلال ہے اور وقت، شخصیت اور مقام وغیرہ مال کمانے

کے جائز اور حلال ذرائع نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے حیلے اور بہانے جنہیں بعض اوقات حیلہ شرعی کا نام بھی دیا جاتا ہے، یہ سب خلافِ شرع اور ناجائز ہیں۔ان شرعی حیلوں کو ربا کی بحث میں زیرِ بحث لایا جائے گا۔

خریدنے اور بیچنے والے کی شرائط

مسئلہ: 399 خریدار اور بائع دونوں کیلئے ضروری ہے کہ کم عقل، جسے اصطلاح میں سفیہ کہا جاتا ہے، نہ ہوں۔اس سے مراد وہ شخص ہے جو کم عقلی اور نادانی کی وجہ سے اپنے مال کو بے ہودہ اور بلاسوچے سمجھے خرچ کرتا ہو۔جیسا کہ آیہ شریفہ میں ہے:

''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا''. (5:4)

''اپنے مال سفہاء کے سپرد نہ کرو''۔اس آیہ کریمہ کی رُو سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ صرف سفیہ نہ ہونا کافی ہے، البتہ یتیموں کے متعلق آیہ شریفہ یہ ہے:

''وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ''. (6:4)

''یتیموں کی آزمائش کرو، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائیں، پس اگر تم انہیں سمجھدار پاؤ تو ان کے اموال انہیں دے دو''۔

پس بلوغ کے بعد رُشد کا شرط ہونا تمام مکلفین کیلئے نہیں بلکہ صرف یتیم کیلئے ضروری ہے۔ بنابرایں مال میں تصرف کی اصل شرط عقل ہے، نہ کہ رُشد یا تکلیف۔

سفاہت کا شرعی پہلو یہ ہے کہ انسان مال کو اسراف وتبذیر وحرام میں صرف کرے۔اس کا عرفی پہلو یہ ہے کہ لین دین کے عاقلانہ اور سودمند طریقوں سے ناواقف ہو یا جانتے ہوئے ان پر عمل نہ کرتا ہو جس کی وجہ سے نقصان اُٹھاتا ہو۔

مسئلہ: 400 دونوں کیلئے ضروری ہے کہ اپنے کام میں مختار ہوں، اس لئے کہ آیہ شریفہ میں باہم رضامندی ''عن تراض منکم'' کوضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ جبر واکراہ کے تحت انجام پانے والا معاملہ باہمی رضامندی سے خالی ہوتا ہے۔

مسئلہ: 401 جس چیز کا تبادلہ کررہے ہوں، اُس کے مالک ہوں یا اُس کے مالک کی طرف سے اجازت رکھتے ہوں یا مالک کے سرپرست اور ولی ہوں۔ اس کی مصلحت اور مفاد کے پیش نظر یہ کام کیا جارہا ہو اور ''لَا بَیْعَ اِلَّافِیْ مِلْکٍ '' کے معنی یہی ہیں کہ صرف اُسی چیز کی خرید وفروخت جائز ہے جو انسان کے اختیار میں ہو، بایں معنی کہ اس کا مالک ہو یا شرعاً اس میں تصرف کا حق رکھتا ہو۔ بعض اوقات انسان مالک ہوتا ہے لیکن تصرف کا اختیار نہیں رکھتا جیسے سفیہ اور مجور وغیرہ۔

مسئلہ: 402 دونوں خرید وفروخت کا قصد رکھتے ہوں ورنہ تجارت نہیں ہوگی۔ مجموعی طور پر تجارت اور دُوسرے معاملات کی شرائط ''تجارۃ عن تراض'' اور'' لاتؤتوا السفھاء اموالکم '' سے واضح ہوجاتی ہیں۔ یہ شرائط عقل، ملکیت، رضامندی، اختیار اور ارادہ ہیں اور ان کے علاوہ کچھ نہیں۔

مسئلہ: 403 کسی بھی معاملہ (لین دین) کو انجام دینے کیلئے کسی خاص لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر طرفین کا مقصد واضح اور معلوم ہو تو یہی کافی ہے۔ بنابرایں خرید وفروخت میں، جیسا کہ مرسوم ہے، صرف طرفین کا مقصد واضح ہونا کافی ہے۔ اس معاملہ کا کوئی مخصوص صیغہ اس معاملہ کی صحت کیلئے ضروری نہیں ہے۔

مسئلہ: 404 اگر دُوسرے فریق کی مرضی یا اطلاع کے بغیر کوئی معاملہ انجام پائے تو اگر وہ راضی ہوجائے تو اس کی رضامندی کے وقت سے معاملہ صحیح ہوگا ورنہ معاملہ صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ '' تجارۃ عن تراض'' کی رُو سے معاملہ اسی وقت صحیح ہوگا جب رضامندی حاصل ہو اور اس کی ضامندی کے وقت سے ہی '' تراض منکم'' کی شرط پوری ہوگی۔ لہٰذا معاملہ بھی اُسی وقت سے صحیح

ہوگا۔ ہاں! اگر وہ یہ کہہ دے کہ معاملہ کے انجام پانے کے وقت سے اس پر راضی ہے تو اس صورت میں معاملہ آغاز سے ہی صحیح ہوگا۔

مالِ معاملہ کی شرائط

مسئلہ: 405 مالِ معاملہ کی جنس اور مقدار کا معین اور معلوم ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اگر مال کی جنس اور مقدار مجہول ہو تو اس صورت میں دھوکہ دینے یا دھوکہ کھانے کے امکان کے پیش نظر یہ معاملہ سفیہانہ اور باطل ہوگا۔

مسئلہ: 406 فریقین مالِ معاملہ کو دُوسرے فریق کے سپرد کرنے یا اسے وصول کرنے کی صلاحیت اور امکان رکھتے ہوں ورنہ یہ معاملہ سفاہت سے بھی بدتر بلکہ دیوانگی ہے۔

مسئلہ: 407 مالِ معاملہ میں کسی اور شخص کا حق نہ ہو، مثال کے طور پر اگر کوئی چیز کسی کے پاس گروی رکھی ہو تو اس کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! اگر صاحبِ حق کی طرف سے اجازت ہو تو معاملہ صحیح ہے۔

خرید و فروخت کی اقسام

خرید و فروخت میں یا تو قیمت اور جنس (مال) دونوں نقد ہوتے ہیں یا دونوں اُدھار یا ایک نقد اور ایک اُدھار۔ پہلی صورت میں جس میں قیمت اور جنس دونوں نقد ہوں، معاملہ صحیح ہے۔ دُوسری صورت میں بھی، جس میں دونوں اُدھار ہوں، معاملہ صحیح ہے، بشرطیکہ تمام شرعی شرائط موجود ہوں۔ تیسری صورت میں، جس میں ایک نقد اور ایک اُدھار ہے، اگر قیمت نقد اور جنس اُدھار ہے تو اسے معاملہ سلف کہتے ہیں۔ اگر جنس نقد اور قیمت اُدھار ہو تو یہ وہی چیز ہے جسے حرفِ عام میں اُدھار کہا جاتا ہے۔ اسے نسیہ بھی کہتے ہیں۔

☆☆☆

اُدھار کے احکام

اُدھار میں قیمت ادا کرنے کا وقت معین ہونا واجب ہے، جیسا کہ آیہ شریفہ میں ہے:

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓااِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ. (282:2)

''جب تم کسی معین مدت تک اُدھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو''۔

اس آیہ شریفہ میں دَین کو معین وقت کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، چاہے وہ قرض کی صورت میں ہو یا اُدھار کی شکل میں۔

مسئلہ: 408 اگر معاملہ میں اُدھار کی قید نہ لگائی جائے تو یہ معاملہ نقد ہے مگر یہ کہ فروشندہ اُدھار کے ارادہ سے بیچ رہا ہو اور خریدار کو بھی اس کا علم ہو۔

مسئلہ: 409 مقررہ مدت پوری ہوتے ہی اُدھار دینے والا اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اگر مقروض ادا کرسکتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ ادا کرے اور اگر ادا نہ کرسکتا ہو تو واجب ہے کہ اسے اتنی مہلت دی جائے کہ وہ ادا کرسکے۔ جیسا کہ آیہ شریفہ میں ہے:

''وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ''.

''اور اگر کوئی سختی میں ہو تو اس کیلئے آسانی تک مہلت ہے''۔(280:2)

اگر جنس موجود ہو تو معاملہ کو منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 410 اگر مدت پوری ہونے پر پیسہ ادا کرسکتا ہو اور ادا نہ کرے تو اس صورت میں اگر جنس موجود ہو تو معاملہ کو منسوخ کر کے جنس کو واپس لیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 411 اگر بیچنے والا خریدار سے کہے کہ اگر نقد خرید و تو اس جنس کی قیمت سو روپے ہے لیکن اگر اُدھار خرید و تو جس قدر اُدھار کی مدت زیادہ ہوگی، اُسی قدر قیمت بھی زیادہ ہوگی، تو یہ معاملہ

حرام ہے، اس لئے کہ وہ اضافی قیمت جو مدت کے مقابل قرار دی گئی ہے، ربا ہے۔ لیکن اگر ایک معین مبلغ کے ساتھ اُدھار کیا جائے اور یہ معین نہ کیا جائے کہ نقد کی صورت میں قیمت کتنی ہے اور اُدھار کی صورت میں کتنی تو اس صورت میں اگرچہ اُدھار کی قیمت نقد کی قیمت سے زیادہ ہو، ظاہراً معاملہ صحیح ہے۔ لیکن مناسب اور بہتر یہی ہے کہ مدت کے مقابل کوئی قیمت معین نہ کی جائے اور اُدھار اور نقد کی قیمت میں کوئی فرق نہ رکھا جائے مگر یہ کہ یہ زائد رقم کسی ایسے فائدے کے عوض ہو جو نقد کی صورت میں ہوتا ہو۔

مسئلہ: 412 اگر قرض دینے والا مقررہ مدت سے پہلے اپنے حق کا مطالبہ کرے اور اپنے حق میں سے کچھ کم کر دے تو اگر وہ اپنی رضا مندی اور اختیار سے ایسا کرے تو صحیح ہے لیکن اگر قرارداد اور معاہدہ کی رُو سے ہو تو ربا اور حرام ہے۔ اسی طرح اگر مقروض باقی ماندہ مدت کے بدلہ میں اس سے رقم کا مطالبہ کرے تو یہ بھی ربا اور حرام ہے۔

سلف

اُدھار یا نسیہ کی طرح سلف میں بھی مدت کا مقرر ہونا لازمی ہے اور معاملہ کی ساری رقم کو مجلس معاملہ میں ادا کرنا واجب ہے۔ اگر رقم کا کچھ حصہ ادا کر دے اور باقی حصہ معلوم یا غیر معلوم مستقبل پر چھوڑ دے تو جس قدر رقم ادا کی گئی ہے، اُتنا معاملہ صحیح ہے اور فروشندہ چاہے تو سارا معاملہ منسوخ کر سکتا ہے۔

بیع معاملاتِ لازم میں سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اُن چند خاص حالات کے جن میں اسے توڑا جا سکتا ہے، کسی اور صورت میں اسے باطل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ موارد جن میں معاملہ کو توڑا جا سکتا ہے، مندرجہ ذیل ہیں:

مسئلہ: 413 جب تک فریقین مجلس معاملہ میں موجود ہوں، دونوں کو معاملہ کے فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اس لئے کہ مجلس کا استمرار اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی تک باہمی رضا مندی حاصل

نہیں ہوئی ہے۔ اگر مجلس کا استمرار کسی اور وجہ سے ہو تو پھر کسی کو یہ اختیار، جسے خیارِ مجلس کہتے ہیں، حاصل نہیں ہے اور معاملہ مضبوط ہو چکا ہے اور اگر مجلس معاملہ کے دوران فریقین یہ کہہ دیں کہ معاملہ طے پا چکا ہے اور فسخ کا اختیار ساقط ہے تو اس صورت میں بھی معاملہ برقرار رہے۔

اگر مجلس معاملہ ٹیلیفون، بالمشافہ، ٹیلی ویژن یا ٹیلی گراف وغیرہ کے ذریعے ہو تو جب تک رابطہ قائم اور برقرار رہے، اُسے مجلس معاملہ شمار کیا جائے گا اور جب دونوں کے اختیار سے رابطہ منقطع ہو جائے تو مجلس معاملہ بھی تمام ہو جائے گی۔

مختصر یہ کہ آیت ''**تجارۃ عن تراض**'' اور اہلِ بیتؑ کی روایات سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ فریقین کا مجلس معاملہ کو رضامندی کے ساتھ ترک کرنا ضروری ہے اور جلسہ معاملہ میں ضروری نہیں کہ وہ ایک دُوسرے کو جسمانی طور پر دیکھ سکتے ہوں بلکہ مراد تجارتی رابطہ ہے۔

بنابرایں اگر مجلس معاملہ فریقین کی رضامندی یا اختیار کے بغیر یا جیسے بھی کسی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ہی برخاست ہو جائے تو اس سے معاملہ برقرار نہیں ہوتا۔ جب تک معاملہ پر فریقین کی رضامندی حاصل نہیں ہو جاتی، معاملہ غیر مستحکم اور قابل فسخ ہے۔

مسئلہ: 414 اگر معاملہ فریقین میں سے ایک کے نقصان میں ہو تو جب بھی اسے اس کا علم ہو، وہ معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس اختیار کو خیارِ غبن کہتے ہیں۔ اگر وہ اپنے نقصان کے برابر قیمت یا جنس کو قبول کرنے پر راضی ہو جائے تو معاملہ صحیح ہے لیکن اگر معاملہ کے نقصان دہ ہونے کا علم حاصل ہو جانے کے بعد کسی سبب یا عذر کے بغیر دُوسرے فریق کی طرف رجوع نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس معاملہ پر راضی ہے۔ بنابرایں معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار بھی نہیں رکھتا۔ لیکن اگر کسی معقول سبب کی وجہ سے رجوع کرنے سے معذور ہو تو معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار برقرار رہے گا، یہاں تک کہ اس کی رضامندی معلوم ہو جائے۔ اگر نقصان یا غبن بہت زیادہ ہو تو اس پر راضی ہونے سے معاملہ صحیح نہیں ہو جائے گا، اس لئے کہ یہ سفاہت ہے۔ ہاں! اگر رضامندی میں کوئی عاقلانہ پہلو

موجود ہو تو پھر معاملہ صحیح ہے۔

مسئلہ: 415 اگر فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں معاملہ میں کوئی شرط مقرر کریں جو پوری نہ ہو تو جس کی شرط پوری نہ ہو، وہ معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس اختیار کو خیارِ شرط کہتے ہیں۔ اگر شرط کے پورا ہونے کا امکان ہو تو اسے پورا کرنے کا مطالبہ بھی اگر چاہے تو کر سکتا ہے۔

مسئلہ: 416 اگر فریقین میں سے کوئی ایک معاملہ کی حقیقت کو ظاہر نہ کرے اور اسے مہنگا کر کے بیچنے کیلئے جھوٹ اور غلط بیانی کے ذریعے اس کی ایسی خصوصیات بیان کرے جو اس میں موجود نہیں ہیں تو اس دھوکہ دہی کی وجہ سے دُوسرے فریق کو معاملہ فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس اختیار کو خیارِ تدلیس کہتے ہیں۔

مسئلہ: 417 وہ معاملہ جس میں جنس کو صحیح و سالم ہونا چاہئے، اگر کوئی فریق ایسی جنس دُوسرے فریق کو دے جس میں نقص اور عیب موجود ہو تو اسے معاملہ کے فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس اختیار کو خیارِ عیب کہتے ہیں۔

مسئلہ: 418 اگر جنسِ معاملہ کا کچھ حصہ قابل معاملہ نہ ہو تو دُوسرا فریق دُوسرے حصے کے معاملہ کو بھی فسخ کر سکتا ہے۔ اسے خیارِ تبعض کہتے ہیں۔

مسئلہ: 419 معاملہ کا کوئی فریق اگر دیکھے کہ معاملہ کیلئے جو جنس معین کی گئی تھی، اب وہ نہیں دی جا رہی تو اسے معاملہ کے فسخ کرنے کا اختیار ہے، چاہے وہ جنس سرے سے کوئی اور جنس ہو یا اس کی صفات معین شدہ صفات سے مختلف ہوں۔ اس اختیار کو خیارِ رویت کہا جاتا ہے۔

مسئلہ: 420 اگر معاملہ نقد ہونے کے باوجود کوئی فریق ادائیگی میں تین دن سے زیادہ تاخیر کرے تو دُوسرے فریق کو فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ اگر کسی چیز کے مجلس معاملہ میں یا تین روز سے قبل ادائیگی کی تصریح کی گئی ہو اور اس پر عمل نہ ہو تو اس صورت میں بھی معاملہ فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس اختیار کو خیارِ تاخیر کہتے ہیں۔

تین دن کی مہلت صرف اس معاملہ میں ہے جو اگرچہ نقد ہو لیکن اس کی ادائیگی کا وقت مقرر نہ ہو اور بازار کے عرف میں تین دن تک ادائیگی کو نقد ہی شمار کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: 421 جو شخص جانور خریدتا ہے، اُسے تین دن تک معاملہ کے فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے جسے خیارِ حیوان کہتے ہیں۔ چونکہ یہ اختیار جانور کے خریدار کی مراعات کیلئے ہے، لہٰذا وہی یہ اختیار رکھتا ہے۔ جانور بیچنے والے کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی بیمار جانور کو کمتر قیمت پر خریدے اور اس کے تین روز کے اندر اندر اس کے مر جانے کا احتمال بھی موجود ہو لیکن چونکہ اس جانور کو گوشت کیلئے خریدا گیا ہے اور اس کے مرنے کے احتمال کی صورت میں اسے ذبح کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں خریدار کو خیارِ حیوان حاصل نہیں بلکہ خیارِ حیوان صرف اُس صورت میں ہے جب حیوان کے حال سے آگاہ نہ ہو اور اسے پالنے کیلئے خریدنا چاہتا ہو۔

مسئلہ: 422 اگر کوئی فریق مقررہ وقت پر قیمت یا جنس کو ادا نہ کر سکے تو دُوسرے فریق کو معاملہ فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اسے اختیارِ تعذر کہتے ہیں۔

یہ تمام اختیارات جن کی تعداد دس ہے، ان کی بنیاد آیہ کریمہ "**تجارةً عن تراض منکم**" ہے۔ اس لئے ان تمام صورتوں میں یا تو باہمی رضامندی بالکل موجود ہی نہیں ہے یا اس کے حاصل ہونے تک وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسئلہ: 423 اگر کوئی شخص سوچے سمجھے بغیر ان تمام اختیارات کو ساقط کر دے تو ایسا معاملہ سفیہانہ اور باطل ہے اور نہ ہی اس طرح ساقط کرنے سے یہ اختیارات ساقط ہوتے ہیں مگر یہ کہ دُوسرا فریق اسقاطِ اختیارات کی شرط پر ہی معاملہ کرنے پر راضی ہو۔ اس صورت میں معاملہ دو لحاظ سے باطل ہے جن میں سے ایک اسقاطِ اختیارات کی غیر شرعی شرط اور دُوسرا اس شرط کو قبول کرنے والے کی سفاہت ہے۔

مسئلہ: 424 اگر کسی شخص کو معاملہ کے وقت اس کے نقصان دہ ہونے یا مال کے معیوب

ہونے کا علم ہو یا معاملہ کے بعد اس کا علم ہو اور کسی عذر کے بغیر بیچنے والے کی طرف رجوع نہ کرے تو ان دونوں صورتوں میں اسے معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

مسئلہ: 425 اگر معاملہ کے بعد جنس میں کوئی ایسا عیب رُونما ہو جائے جس کا معاملہ سے پہلے کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تو اس صورت میں اسے خیارِ عیب حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ عیب کسی ایسی حالت کا طبیعی اور خود کار نتیجہ ہو جو معاملہ کے وقت اس میں موجود تھی تو اس صورت میں خریدار خیارِ عیب کی رُو سے معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ حالت جو بعد میں رُونما ہونے والے عیب کا سبب ہو، بذاتِ خود عیب ہے۔

مسئلہ: 426 اگر فسخ کے حق کی اطلاع سے پہلے، چاہے کسی بھی وجہ سے ہو، خریدی گئی چیز کو اس طرح استعمال کرے جس سے اس کی قیمت میں فرق پیدا ہو جائے تو اس صورت میں معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا بلکہ جس نقص کی وجہ سے فسخ کا حق دراصل پیدا ہوا تھا، اُس کی قیمت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر اس چیز میں پایا جانے والا نقص ایسا ہو جس کی وجہ سے وہ بالکل استعمال کے قابل نہ ہو تو اس صورت میں اس کے ایک یا چند بار استعمال کرنے کی وجہ سے قیمت میں جو فرق پڑا ہے، اُسے ادا کر کے معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے۔

مسئلہ: 427 کار، ہوائی جہاز یا کشتی جیسی چیز، جس کا عیب ظاہر ہونے میں چند دن لگ جاتے ہیں، ان میں انہی چند دنوں کی مدت تک فسخ کا اختیار رکھتا ہے۔ اگر ظاہر ہونے والا عیب معاملہ سے پہلے موجود کسی حالت کا نتیجہ ہو یا زیادہ کام کرنے کا نتیجہ ہو تو ان صورتوں میں بھی اختیارِ فسخ موجود ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام عیب جو معاملہ کے وقت موجود ہوں لیکن ظاہر نہ ہوں یا معاملہ کے بعد پیدا ہوں لیکن ان کا سبب معاملہ کے وقت موجود ہو تو ان تمام صورتوں میں فسخ کا حق برقرار ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آٹو میٹک گھڑی جسے دس سال تک صحیح طور پر کام کرنا چاہیئے، چند روز، ماہ یا اس کی معین شدہ آخری مدت سے قبل خراب ہو جائے تو خیارِ عیب موجود ہے اور معاملہ کو فسخ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عمارت، جو ابھی تو اچھی طرح قائم ہے لیکن اسے مزید جتنا عرصہ قائم رہنا چاہیئے، اس سے قبل منہدم ہو جائے تو اس صورت میں خیارِ عیب کی رُو سے معاملہ کو فسخ کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اس میں نقص تو معاملہ کے وقت ہی موجود تھا لیکن ظاہر اب ہوا ہے۔

مسئلہ: 428 اگر بیچنے والا خریدار کو اپنی قیمت خرید واقعی قیمت خرید سے زیادہ بتائے اور خریدار اُسے صحیح سمجھ کر اس پر کچھ منافع دے کر اس سے وہ چیز خرید لے تو یہ معاملہ حرام ہے۔ بیچنے والے پر لازم ہے کہ جو زیادہ رقم اُس نے وصول کی ہے، وہ خریدار کو واپس کر دے اور اگر خریدار کو اس کا علم ہو جائے تو اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ معاملہ کو فسخ کر دے یا اس کی زائد قیمت واپس لے لے۔

مسئلہ: 429 اگر کوئی شخص کوئی چیز کسی دُوسرے شخص کے سپرد کر دے اور اُسے کہے کہ اسے اتنی قیمت میں بیچ دو اور اگر اس سے زیادہ قیمت میں بیچ دو تو زائد قیمت تمہاری ملکیت ہو گی۔ اس صورت میں یہ معاملہ وکالت اور جعالہ کا مرکب ہے، اس لئے کہ مال کے مالک نے اسے مال کو بیچنے کی وکالت دی ہے اور چونکہ اس کے ساتھ یہ معاہدہ بھی کیا ہے کہ اگر مقررہ قیمت سے زیادہ پر بیچے تو وہ خود اس کا مالک ہے، اس لحاظ سے جعالہ ہے۔ یہ معاملہ جو وکالت اور جعالہ کا مرکب ہے، صحیح ہے۔

عوضین : (جن دو چیزوں کا لین دین کیا جائے) کی شرائط

مسئلہ: 430 جس چیز کی خرید و فروخت کی جا رہی ہے، اس میں حلال اور قابل استعمال منفعت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر اس کے تمام یا اکثر فوائد و منافع حرام ہوں یا اس سے فائدہ اُٹھانے کا معمول کے مطابق امکان نہ ہو تو یہ معاملہ سفیہانہ اور باطل ہے۔

مسئلہ: 431 اگر بیچنے والا یہ جانتا ہو کہ خریدار اس حلال چیز کو خرید کر اسے حرام استعمال میں لائے گا تو یہ معاملہ باطل ہے اور اگر بیچنے والا بھی حرام میں استعمال ہونے کے قصد سے بیچے تو اور بھی بدتر۔ مثال کے طور پر کسی ایسے شخص کے ہاتھ انگور بیچنا جو اس سے شراب بناتا ہو، اس لئے کہ یہ گناہ میں تعاون ہے جبکہ آیہ شریفہ میں ہے:

''وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''.(2:5)

''گناہ اور زیادتی کے کام میں کسی سے تعاون نہ کرو''۔

جن روایات میں اس قسم کے معاملہ کو جائز قرار دیا گیا ہے، وہ اس آیت اور ان تمام آیات کے خلاف ہیں جو اثم کو حرام قرار دے رہی ہیں جیسے:

''اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِش مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ''.(33:7)

''میرے رب نے ظاہر اور پوشیدہ فواحش اور اثم کو حرام قرار دیا ہے''۔

اثم سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو واجبات کی ادائیگی میں سست کر دے یا ان سے مانع ہو۔ پس جس شخص کو نہی از منکر کرنا آپ پر واجب ہے کہ وہ شراب سازی نہ کرے، اسے شراب سازی کے وسائل، جن میں ایک انگور بھی ہے، کیونکر فراہم کر سکتے ہیں، اس لئے کہ یہ عمل گناہ میں اس سے تعاون کے علاوہ ترکِ نہی از منکر بھی ہے بلکہ یہ تو انجامِ منکر کیلئے وسیلہ فراہم کرنا ہے۔

مسئلہ:432 وہ تمام چیزیں جن کا استعمال حرام ہے یا وہ حرام کاموں کے انجام دینے کا وسیلہ ہیں، ان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ اگر نجس چیز سے حلال فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو جیسے کھاد بنانا وغیرہ تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ اس کے برعکس حلال اور پاکیزہ اشیاء اگر حرام کام میں استعمال کی جائیں تو ان کی خرید وفروخت حرام ہے۔

مسئلہ:433 اگر کسی چیز کا استعمال عام طور پر حرام ہو اور اس کا حلال استعمال بہت ناچیز اور نادر ہو تو ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا صحیح ہے جس کے بارے میں علم ہو کہ وہ اُسے حلال طریقے سے استعمال کرے گا، مثلاً اگر کسی شخص کے بارے میں علم ہو کہ وہ شراب کو سرکہ میں تبدیل کر دے گا تو اس کے ہاتھ شراب فروخت کرنا صحیح ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ایسی خرید وفروخت حرام ہے جو فعل حرام میں معاون یا موجبِ ترکِ واجب ہو۔

مسئلہ: 434 بچیوں کے کھیلنے کی گڑیا اور آرائش یا کسی اور حلال استعمال کیلئے مجسمہ بنانا اوران کی خرید وفروخت جائز ہے، جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مزدور جنات اور کاریگر اُن کیلئے بناتے تھے:

''یَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَایَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِیۡبَ وَتَمَاثِیۡلَ''.

''وہ (حضرت سلیمانؑ) جومحرابیں اور تماثیل چاہتے تھے، وہ اُن کیلئے بناتے تھے''۔(13:34)

تماثیل جس کی واحد تمثال ہے، جاندار چیزوں کے مجسمے اس کا عمدہ ترین نمونہ ہیں۔

پس جو چیز نص قرآن کی رُو سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مطلوبہ چیز تھی اور قرآن شریف نے اس کو منسوخ بھی نہیں کیا ہے، شریعتِ قرآن میں جائز ہے۔ روایات قرآن شریف کو فسخ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ ہاں! اگر مجسمہ اس لئے بنایا جائے کہ اس کی پوجا کی جائے تو اس صورت میں اس کا بنانا اور اس کی خرید وفروخت حرام ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر سے کہا تھا:

''اِذۡقَالَ لِاَبِیۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَاهٰذِهِ التَّمَاثِیۡلُ الَّتِیۡۤ اَنۡتُمۡ لَهَا عٰكِفُوۡنَ''.(20:21)

''یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کے سامنے تم لوگ جھکے ہوئے ہواوران کی پوجا کے دلدادہ ہو؟''

اسلام انسان یا حیوان کا چہرہ بنانے کا مخالف نہیں ہے کہ ان کو بنانے اور ان کی خرید وفروخت کو حرام قرار دے بلکہ اسلام غیر خدا کی پرستش کا مخالف ہے، خواہ وہ مجسمہ یا تصویر کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔

اگر بعض اسلامی روایات میں مجسمہ سازی اور اس کی خرید وفروخت کی حرمت کا ذکر پایا جاتا ہے تو وہ صرف اسی لحاظ سے ہے کہ کہیں لوگ ان کی پرستش شروع نہ کردیں، اس لئے کہ یہ روایات اس

دَور میں صادر ہوئی ہیں جب لوگ نئے نئے بت پرستی کو ترک کر کے اسلام لائے تھے اور شرک کے تصورات کو ختم اور دُور کرنے کیلئے روایات میں انہیں ممنوع قرار دیا گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ مجسمہ سازی اور اس کی خرید و فروخت سرے سے ہی حرام ہو۔

مختصر یہ کہ مجسمہ کے تین پہلو ہیں: پہلا پہلو ان کی عبادت اور پرستش کا ہے جو قطعاً حرام ہے۔ دُوسرا پہلو گزشتہ لوگوں کی یادگار اور احترام ہے جو درحقیقت مردہ پرستی اور حرام کے نزدیک ہے۔ آخری پہلو جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہشات میں سے ایک خواہش تھی، حلال ہے۔

یہ ظاہراً حیوانات کے مجسمے تھے جو مصوری کی خوبصورتی میں اضافہ کیلئے تھے۔ اگر انسان کا مجسمہ بھی پہلے دو پہلوؤں سے پاک ہو تو وہ بھی حرام نہیں ہے۔

بیع شرط

اگر بیع کی مدت معین نہ ہو تو اُسے بیع قطعی کہتے ہیں اور اگر کسی مال کو محدود مدت تک کیلئے بیچا جائے تو اُسے بیع شرط کہتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص اپنا مکان دو سال کیلئے آپ کو بیع قطعی سے کم قیمت پر بیچ دے کہ آپ صرف دو سال تک اس مکان کے مالک ہوں گے اور دو سال کی مدت گزرنے پر وہ آپ کی رقم نہ لوٹائے تو آپ اس کے قطعی مالک ہو جائیں گے۔

اس قسم کے معاملہ کے صحیح ہونے کی اصلی شرط یہ ہے کہ معینہ مدت کے لئے اس کی قیمت عادلانہ ہو اور ایسے حیلہ کی صورت نہ رکھتی ہو جنہیں حیلہ شرعی کہا جاتا ہے، مثلاً ایسا مکان جس کی قیمت دس لاکھ روپے ہو، ایک سال کے لئے ایک لاکھ روپے میں فروخت کرنا صحیح نہیں ہے۔

بیع مشروط کی اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ بیچنے والا اس چیز کے استعمال کی حدود کو معین کر دے، مثال کے طور پر یہ شرط لگا دے کہ اس چیز کو فلاں شخص کے ہاتھ نہ بیچے یا فلاں استعمال میں نہ

لائے۔جن کتابوں کو چھاپنے کا حق محدود ہے، اُن کی بیع اسی قسم میں سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مؤلف یا ناشر کی اجازت کے بغیر کوئی اس کتاب کو چھاپنے کی اجازت نہیں رکھتا۔

بنابرایں فروشندہ کتاب کو اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ خریدار اسے نہیں چھاپے گا، اس لئے کہ یہ مؤلفین اور ناشرین کا حق ہے اور شاید مؤلف کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کے مطالب میں کمی بیشی وغیرہ کرنا چاہتا ہو، خصوصاً اگر کتاب کا تعلق عقائد یا فتویٰ جیسی اہم چیزوں سے ہو، نیز مؤلف اور ناشر نے کتاب کی تالیف اور اشاعت میں جو زحمت اُٹھائی اور مال خرچ کیا، اس کی وجہ سے یہ اُن کا حق ہے۔لہٰذا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کتاب کو چھاپ کر ان کا حق ضائع کر دے اور مفت میں ان کی زحمتوں کا پھل کھائے۔

کتاب کی قیمت کو اس طرح مقرر کرنا جس سے ان کو بازار میں نقصان ہو، دو لحاظ سے دُوسروں کے حقوق کے خلاف تجاوز ہے جو اسلام کے عادلانہ اصولوں کے ساتھ ہرگز ہم آہنگ نہیں ہے۔لیکن اگر کوئی کتاب مسلمانوں کیلئے مفید اور ضروری ہو اور مؤلف اور ناشر اسے اپنے ساتھ مختص رکھ کر ناجائز منافع خوری کرنا چاہتے ہوں کہ اس طرح کتاب کی قیمت بھی زیادہ ہو جائے اور عوام کی دسترس میں بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں مجتہد جامع الشرائط کی اجازت سے اس کتاب کو ذخیرہ اندوزی کی حالت سے باہر لایا جاسکتا ہے اور ایسی صورت میں مؤلف کیلئے نظر ثانی کا حق باقی رہ جائے گا اور اسے اس کے عمل کا مناسب اور عادلانہ معاوضہ بھی ادا کیا جائے گا۔

شرکت کے احکام

اگر دو یا دو سے زیادہ افراد کسی مال کے مجموعہ میں اس طرح شریک ہوں کہ ہر ایک کے مال کی قیمت تو معلوم ہو لیکن اس کا مخصوص حصہ معلوم نہ ہو بلکہ پورے مجموعہ میں پھیلا ہوا ہو تو اس صورت میں اگر وہ سب مل کر یکساں طور پر اس مشترک سرمایہ سے کام کریں تو ان میں سے ہر ایک اپنے حصہ کے تناسب سے اس کے نفع یا نقصان میں شریک ہوگا۔جس طرح خرید و فروخت کیلئے کسی خاص لفظ

اور صیغہ کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح شرکت میں بھی کسی خاص لفظ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شرکاء کا یہ جاننا کافی ہے کہ ان کا قصد شرکت ہے، اس کے بارے میں کچھ مسائل ہیں:

مسئلہ: 435 سرمایہ، نفع اور نقصان کے حصوں کے متعلق ہر قسم کا غیر عادلانہ معاہدہ باطل ہے مگر یہ کہ بعض شرکاء کو زیادہ کام کرنے یا رہنمائی کرنے کی وجہ سے نفع میں سے زیادہ اور نقصان میں سے کم حصہ دیا جائے۔

مسئلہ: 436 جس طرح کام اور سرمایہ کے مجموعہ میں شرکت ایک شرعی اور عقلائی عقد ہے اور **اوفوا بالعقود** (اپنے معاہدوں کو پورا کرو) کے زمرہ میں آتا ہے، کام میں شرکت کا بھی یہی حکم ہے، بشرطیکہ مفت خواری کی صورت اختیار نہ کرے، مثال کے طور پر اگر چند اشخاص کا کام ایک دُوسرے سے مشابہ ہو یا ایسا کام جو آمدنی میں ہم آہنگ ہو اور یہ سب ایسے کام کی آمدنی میں اپنے کام کے تناسب سے شرکت کریں تو اگر کام کا فیصد حصہ برابر یا تقریباً برابر ہو تو ظاہراً معاملہ صحیح ہے۔ چونکہ اس بارے میں کوئی نص موجود نہیں ہے اور ادعا شدہ اجماع بھی کوئی حیثیت و وقعت نہیں رکھتے، لہٰذا ایسی شرکت کی حرمت کا فتویٰ کوئی قابل قبول شرعی بنیاد نہیں رکھتا۔

مسئلہ: 437 دونوں قسم کی شرکت میں شرکاء پر شرکت کی تمام شرائط کی پابندی کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی ان پر عمل کرنے سے سرتابی کرے تو وہ شرکت سے نکال دیئے جانے کا مستوجب ٹھہرے گا، مگر یہ کہ دُوسرے تمام شرکاء اسے معذور سمجھیں یا عفو و درگزر سے کام لیں۔

مسئلہ: 438 ذاتی خرید و فروخت کی طرح شرکت بھی عقدِ لازم ہے اور اسے توڑا نہیں جاسکتا مگر یہ کہ اس کی مدت پوری ہو چکی ہو یا تمام شرکاء اس کو ختم کرنے پر متفق ہو جائیں یا اس کے جاری رہنے کی صورت میں مقررہ شرعی فرائض کو انجام دینا ممکن نہ ہو۔

مسئلہ: 439 شرکاء میں سے کوئی بھی مشترکہ سرمایہ سے ذاتی کاروبار نہیں کرسکتا۔ اسی طرح شرکت کے مکان میں بھی اپنے ذاتی سرمایہ سے ذاتی کاروبار نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر دُوسرے تمام شرکاء

کی اجازت ہو تو پھر دونوں صورتیں، مکان یا سرمایہ سے ذاتی کاروبار جائز ہیں۔

مسئلہ: 440 اگر بعض شرکاء کسی کے حق میں یہ طے کر دیں کہ اسے نفع میں زیادہ اور نقصان میں کم حصہ دیا جائے تو اگر یہ کمی بیشی اس کی زائد کوشش یا اس کی فکری اور عملی برتری کے مقابل نہ ہو تو مفت خواری اور باطل ہے۔

مضاربہ کے احکام

مسئلہ: 441 مضاربہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے مال اور دُوسرا شخص اپنی محنت سے مشترکہ کاروبار کریں اور نفع و نقصان میں دونوں شریک ہوں۔ عقدِ مضاربہ دُوسرے تمام عقود اور معاہدوں کی طرح **اوفوا بالعقود** کے زمرے میں آتا ہے اور معاہدہ کی عام شرائط موجود ہونے کی صورت میں درست ہے۔

مسئلہ: 442 مضاربہ میں کام کرنے والا شخص دُوسرے شخص سے جو مال لیتا ہے، اس کا مالک نہیں ہے بلکہ مال کے مالک کی طرف سے اس مال کے ذریعے تجارت کرنے کی وکالت رکھتا ہے۔ لہٰذا مضاربہ کی مدت کا معین ہونا ضروری ہے اور اسی طرح نفع و نقصان میں دونوں کے حصوں کا معین ہونا بھی لازمی ہے۔ چونکہ مال ماضی میں انجام دیئے گئے عمل کا نتیجہ ہے اور اب ضرورت سے زائد ہونے کی وجہ سے غیر ضروری ہے اور عمل کے بغیر اس میں اضافہ ممکن نہ ہونے کی وجہ سے مردہ ہے، جبکہ اس مال پر انجام دیا جانے والا موجودہ عمل زندہ، ضروری اور حاضر ہے، اس لئے کام کرنے والے کا حصہ نفع میں زیادہ اور نقصان میں کمتر ہوگا۔

اگرچہ مضاربہ میں قاعدہ یہ ہے کہ نفع اور نقصان کی تقسیم صاحبِ مال اور صاحبِ محنت کے درمیان مقرر کی ہوئی فیصد کے مطابق ہو لیکن اس کے باوجود اگر مضاربہ کے ضمن میں دونوں کے درمیان سمجھوتہ طے پا جائے جس کی رُو سے صاحبِ مال صرف نفع میں شریک ہو اور نقصان میں حصہ دار نہ ہو تو یہ صحیح ہے، بشرطیکہ اس میں مفت خوری اور دُوسرے فریق کو دھوکہ دہی کا پہلو نہ پایا جاتا ہو،

چاہے یہ سمجھوتہ عقدِ مضاربہ کے ساتھ کیا گیا ہو یا اس کے بعد۔ لیکن اگر مضاربہ میں اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہ ہو اور اس کے باوجود صاحبِ مال نفع میں اپنے لئے زیادہ اور نقصان میں اپنے لئے کمتر حصہ مقرر کر لے یا صاحبِ عمل اس قسم کی کوئی شرط معین کرے تو دونوں صورتوں میں یہ مفت خوری و باطل اور حرام ہے۔

دُوسرے معاملات کی طرح مصالحت اور سمجھوتے میں بھی ہر قسم کی دھوکہ دہی، ظلم وستم، شرعی حیلے اور مفت خواری مذموم ہیں اور قابل قبول نہیں ہیں، اس لئے کہ اسلام کام اور کوشش کا دین ہے اور ان تمام دھوکہ بازیوں اور شاطرانہ چالوں سے بری ہے جو بعض لوگ اسلام کے نام پر کرتے ہیں۔

جعالہ

جعالہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے انجام دینے پر مناسب معاوضہ دینے کا وعدہ کرے اور کوئی دُوسرا شخص اُسے قبول کر لے، مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جو میرا سامان فلاں جگہ تک لے جائے گا، اُسے دس روپے دوں گا اور کوئی شخص اُسے قبول کر لے اور اس کا سامان مقررہ جگہ تک لے جائے۔ جعالہ میں جو شخص کام انجام دیتا ہے، اُسے عامل اور جس کیلئے کام انجام دیا جاتا ہے، اُسے جاعل کہتے ہیں۔

مسئلہ: 443 جعالہ بھی دُوسرے تمام عاقلانہ معاہدوں کی طرح **اوفوا بالعقود** کے زمرہ میں آتا ہے اور معاہدہ کی تمام شرائط اس میں بھی معتبر ہیں۔

آیہ کریمہ ''وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ'' (اور جو بادشاہ کا پیمانہ لے آئے گا، اُسے ایک اُونٹ گندم دی جائے گی)، (72:12) کی رُو سے یہ ایک مستقل عقد ہے جو نہ تو بیع ہے اور نہ ہی اجارہ اور نہ ہی کوئی اور عقد۔

''**اوفوا بالعقود**'' کے عموم اور ''**ولمن جاء به حمل بعير**'' کے خصوص کی رُو سے اگر یہ معاملہ صحیح طور پر انجام پائے تو اس کی پابندی ضروری ہے۔ معاہدہ کرنے والے پر واجب ہے کہ اس

کا مطلوبہ عمل انجام پانے کے بعد اپنے معاہدہ پر عمل کرے۔ جو عمل اس نے معین کیا ہے، اس کا حلال اور فائدہ مند ہونا ضروری ہے، چاہے اس کا فائدہ خود اس کی ذات کو ہو یا کسی اور کو۔

جعالہ میں مقرر کیا ہوا معاوضہ معین ہونا ضروری ہے ورنہ جاعل پر واجب ہے کہ عامل کو معمول کے مطابق اس کی محنت کا عادلانہ معاوضہ ادا کرے۔ اگر وہ معاوضہ معین نہ کرے لیکن یہ معلوم ہو کہ کتنا معاوضہ دے گا اور عامل بھی اسے جانتا ہو تو یہ معاملہ صحیح ہے، چاہے یہ معاوضہ معمول کے مطابق ملنے والی اُجرت سے زیادہ ہو یا اس سے کم ہو یا اس کے برابر، بشرطیکہ معاملہ سفیہانہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کہے کہ جو میرے مال کو غرق ہونے سے بچائے گا، اُسے کچھ دوں گا اور یہ ''کچھ'' بہت کم اور ناچیز ہو یا بہت ناچیز معاوضہ معین کرے تو ان صورتوں میں اس قرارداد اور معاہدہ کو قبول کرنا احمقانہ اور سفیہانہ عمل ہے۔ ہاں! اگر جاعل کی مالی حالت کمزور ہے اور عامل ثواب سمجھ کر اس کو قبول کر لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مسئلہ: 444 اگر عامل کام کا کچھ حصہ مکمل کر چکا ہو تو جاعل صرف اس صورت میں جعالہ کو منسوخ کر سکتا ہے جب عامل کو اُس کے عمل کے مطابق معاوضہ ادا کرے۔ اگر عامل کام کو اُدھورا چھوڑنا چاہے تو صرف اس صورت میں ایسا کر سکتا ہے جبکہ وہ جاعل کیلئے نقصان دہ نہ ہو، مثلاً عامل ڈاکٹر ہو اور آپریشن کو اُدھورا چھوڑنا چاہے جس سے آپریشن ایک خطرناک اور مضر شکل اختیار کر سکتا ہو تو ایسی صورت میں اس پر کام کو مکمل کرنا واجب ہے اور مقررہ معاوضہ سے زیادہ کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کام کے دوران اُسے معلوم ہو جائے کہ اس کا مقرر کردہ معاوضہ معمول کے مطابق عادلانہ معاوضہ سے کم ہے تو اس صورت میں بھی اس پر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا واجب ہے، اگرچہ عادلانہ معاوضہ کا مطالبہ کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔

مسئلہ: 445 اگر کام کو اُدھورا چھوڑنا جاعل کیلئے نقصان دہ نہ ہو اور نافع بھی نہ ہو بلکہ اُسے دوبارہ شروع کرنے کی ضرورت ہو تو اگر عامل کسی شرعی عذر کے بغیر کام کو اُدھورا چھوڑنا چاہے تو وہ

جاعل سے کسی قسم کے حق کا مطالبہ نہیں کرسکتا، اس لئے کہ اصل میں جعالہ کام کی تکمیل کیلئے تھا۔ اگر یہ کام قابلِ تقسیم ہو، تب بھی اسے کسی معاوضہ کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ مفروضہ صورت میں جو کام اُس نے انجام دیا ہے، وہ اس قدر کم ہے کہ اسے دوبارہ ازسرِنو شروع کرنا پڑا ہے۔

مزارعہ

مسئلہ: 446 مزارعہ یا مزارعت سے مراد ایسی شرکت ہے جس میں زمین کسی کی ہو اور اس میں کھیتی باڑی کوئی اور کرتا ہو اور کاشتکار اور زمیندار نفع و نقصان میں شریک ہوں، بشرطیکہ زمیندار اسلامی نقطہ نظر سے زمین میں اولویت رکھتا ہو کہ اُس نے زمین کو آباد اور زراعت کیلئے آمادہ کیا ہو اور پھر اس میں زراعت و کھیتی باڑی کیلئے اسے کاشتکار کے حوالے کردے تو اس صورت میں ہی عقدِ مزارعہ بامعنی ہوگا۔

لیکن اگر زمیندار زمین میں اولویت نہ رکھتا ہو کہ نہ تو اُسے آباد کیا ہو اور نہ ہی کاشتکاری کیلئے آمادہ کیا ہو بلکہ اپنی قوت اور اثر ورسوخ کے ذریعے زمین حاصل کر کے اپنے نام کروالی ہو اور اب اس سے مزارعہ کے ذریعے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہو تو ایسا کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اگر وہ زمین میں اولویت کا حق رکھتا ہو تو بھی پیداوار کا زیادہ حصہ کاشتکار کا ہے، نہ کہ زمیندار کا، اس لئے کہ اگر مضاربہ میں مال یا پیسے کے مالک کا حصہ کام کرنے والے کے حصہ سے کمتر ہے، حالانکہ مال کے مالک نے اس کو حاصل کرنے کیلئے کام کیا ہے اور اس کا مال اس کے کام کا نتیجہ ہے تو مزارعت میں زمیندار کا حصہ مضاربہ میں مال یا پیسے کے مالک کے حصہ سے بھی بہت کم ہے، اس لئے کہ زمین اس کے اپنے عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جس قدر اُس نے زمین پر کام کیا ہے یا سرمایہ لگایا ہے، اسی کی نسبت سے کاشتکار کی محنت سے حاصل ہونے والی زرعی پیداوار میں حصہ دار ہوگا، اس لئے کہ بنیادی طور پر زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے، اس لئے کہ:

’’وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِ نۡسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی‘‘.(40:53)

’’صرف وہی چیز انسان کی ہے جسے اُس نے کوشش کر کے حاصل کیا ہو‘‘۔

زمین کسی کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جس قدر کوئی انسان زمین پر کام کرے یا اس پر سرمایہ لگائے، اُتنا ہی اس زمین پر حق رکھتا ہے۔ اگر اس زمین سے مزارعہ کرے تو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار میں اس کا حصہ کاشت کار کے حصہ کی نسبت بہت کم ہوگا۔

مضاربہ کی طرح مزارعت میں بھی پیداوار کی تقسیم کی بنیاد طے شدہ فیصد ہونی چاہئے، نہ کہ کوئی معین مقدار جو بعض اوقات عادلانہ حق سے بہت کم یا بہت زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

دُوسرے معاملات کی مانند مزارعہ میں بھی مدت کا معین ہونا لازمی ہے ورنہ اس میں نقصان اور دھوکہ کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

مسئلہ: 447 اگر زراعت کی جڑیں اگلے سال تک یا مزارعہ کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی باقی رہیں اور سبز ہو کر پھل دیں تو اس صورت میں اگر وہ معاہدۂ مزارعہ میں آتی ہوں تو مدتِ مزارعہ کی طرح ان کی تقسیم عمل میں آنی چاہئے۔ لیکن اگر لفظی طور پر تو معاہدہ میں داخل نہ ہوں لیکن معاشرے میں لوگوں کی نظر میں یہ بھی معاہدہ کے زمرہ میں آتی ہوں تو اس صورت میں بھی انہیں پہلے کی طرح زمیندار اور کاشت کار میں مقررہ فیصد کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اگلے برس اور بعد کے برسوں میں پیدا ہونے والی اشیاء صرف زمیندار کا حق ہوں گی اور اگر یہ مفت خواری شمار ہوتی ہو تو پھر کاشت کار بھی اس پیداوار میں شریک ہوگا۔ اگر معاہدہ میں کاشت کار سے اس قسم کا حق سلب کر لیا جائے تو اگر یہ کام عادلانہ نہ ہو تو درست نہیں ہے۔ مفت خواری ہر صورت اور ہر حالت میں اسلام کی نظر میں ممنوع و مذموم ہے اور:

’’وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ‘‘.(188:2)

ہرگز قابلِ استثناء نہیں ہے۔

پس چونکہ زمین، پہاڑ، دریا، جنگل اور معاون اور ہر وہ چیز جو انسان کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے، کسی شخص یا گروہ کی ملکیت نہیں ہیں اور صرف تحجیر، احیاء اور تعمیر کی صورت میں معمول کی ضرورت کے مطابق اس میں صرف اولویت کا حق پیدا ہوتا ہے، ملکیت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص اپنی زیر استعمال زمین کو ترک کر دے یا اس کی ضرورت نہ رکھتا ہو یا اس سے زرعی فوائد حاصل کرنے کا امکان نہ رکھتا ہو تو وہ اس قسم کے حالات میں اس زمین کو فروخت کرنے یا کرائے پر دینے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس زمین میں اُس نے جو کام کیا ہے یا جو اموال اُس نے اس پر صرف کئے ہیں، اُنہی کا معاوضہ لے سکتا ہے۔ جو شخص اس زمین کی ضرورت رکھتا ہو، وہ پہلے شخص کی زحمتوں اور کوششوں کا معاوضہ دے کر اس زمین سے استفادہ کرسکتا ہے۔

یوں دُوسرے مفت خوروں کی طرح زمین خوروں کو بھی غیر عادلانہ بلکہ ظالمانہ دولت کے انبار سے محروم ہونا پڑے گا۔ صرف جائز محنت اور کوشش ہی کسی انسان کو اس کے جائز حق سے ہمکنار کرسکتی ہے۔

بہرصورت اس بے ہودہ معاشی طبقہ بندی کو وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی کو عملی جامہ پہنا کر ہی نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ ہر شخص اپنی فکری، زبانی، قلمی، علمی اور جسمانی محنت و کوشش سے جائز اور حلال کی آمدنی حاصل کرسکتا ہے۔ اسی آیت پر عمل کرتے ہوئے ہر قسم کی ظالمانہ یا ریاکارانہ حق بجانب مفت خوری کا انسداد کر کے، بے حد و حساب طبقاتی فاصلہ کو کام اور کوشش کی بنیاد پر عادلانہ فاصلہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ کام کرنے والوں کے کام کی قیمت اور اُن کی استعداد اور زراعت یا دُوسرے تمام کاموں کا نتیجہ یکساں نہیں ہے، لہٰذا ان کی آمدنی بھی یکساں نہیں ہوگی۔

وہ فقراء اور مساکین جن کی عادلانہ آمدنی ان کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی نہیں ہے، شرعِ مقدسِ الٰہی نے ان کی مدد کیلئے خمس، زکوٰۃ، صدقات اور کفارات کو ان میں عادلانہ طور پر

تقسیم کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔ اگر یہ تمام اسلامی ٹیکس جو ایک معین فیصد کے حساب سے ادا کیئے جاتے ہیں، ان تمام اجتماعی اور انفرادی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی نہ ہوں تو یہاں اس آیت کی رُو سے اضافی ٹیکس کی باری آئے گی۔

"یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ. قُلِ الْعَفْوَ"(2:219)۔

"اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو"۔

معمول کے مطابق اسلامی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے جائز ضروری اخراجات سے جو کچھ بچ رہے، اُسے انفاق کرنا ہوگا۔ اس بارے میں تفصیلات کے خواہش مند حضرات ہماری کتاب "مفت خواران" اور تفسیر الفرقان کی طرف رجوع کریں۔ اس تفصیل کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

آیۂ سعی "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی " کی رُو سے صرف کام اور کوشش سے ہی کسی چیز کا اصلی استحقاق وجود میں آتا ہے اور خمس و زکوٰۃ وغیرہ کی شکل میں جو ادائیگیاں عمل میں آتی ہیں، اُن کی وجہ وہ استحقاق ہے جو ایک مسلمان کی کوششوں کے نارسا ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو اس کی زندگی میں خلل کا موجب ہوسکتا ہے۔

آیہ شریفہ:

"هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا". (2:29)

"وہی تو ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے، وہ سب تم سب کیلئے پیدا کیا ہے"۔

سب کچھ یعنی "مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا"، "تم سب کیلئے" 'لکم جمیعا'۔ اس آیہ شریفہ کی رُو سے زمین اور تمام زمینی ذخائر سب کیلئے ہیں اور کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بن سکتے۔ ذاتی ملکیت صرف وہی اشیاء بن سکتی ہیں جو انسان کی اپنی کوشش اور کام کا نتیجہ ہوں۔

اگر حدیثِ صحیح میں رسولؐ اللہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ 'مَنْ اَحْیَ الْاَرْضَ فَهِیَ لَهٗ'

یعنی ''جس نے کسی زمین کو زندہ کیا، وہ اُسی کیلئے ہے'' تو اس حدیث میں ''اُسی کیلئے ہونا'' ملکیت کے معنی نہیں رکھتا، اس لئے کہ کرایہ کا مکان کرایہ دار کیلئے اور عاریۃً لی ہوئی چیز عاریہ لینے والے کیلئے ہے۔ اگر ''لـہ'' یعنی ''اُس کیلئے'' کے اطلاق کی وجہ سے اس سے ملکیت کے معنی مراد لئے جائیں تو یہ حدیث ''لَیْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' کے سامنے بالکل بے حیثیت ہو جائے گی، اس لئے کہ اصل میں زمین کسی کی کوشش اور محنت کا ثمر نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے بلکہ جو محنت زمین پر کی گئی ہے، اُس کا نتیجہ اور جو مال اس پر صرف کیا گیا ہے، وہی انسان کا حق ہے اور کچھ نہیں۔

پس آیہ شریفہ ''هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا'' کی رُو سے زمین تمام انسانوں میں مشترک ہے اور اسے کسی کی ذاتی ملکیت قرار دینا اس الٰہی دستور کے خلاف ہے۔

چونکہ زمین سب کیلئے ہے، لہٰذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ زمین کو اپنے ساتھ مختص کر کے دُوسروں کو ان کی ضرورت کی زمین سے محروم کر دے۔ پس اگر کوئی شخص اپنی ضرورت سے زیادہ زمین کو آباد کر لے جبکہ کوئی ایسا ضرورت مند بھی موجود ہو جو اپنی ضرورت کیلئے کافی زمین نہ رکھتا ہو تو اپنی ضرورت سے زائد زمین آباد کرنے والے کو اس زائد زمین میں اولویت کا حق حاصل نہیں ہوگا اور اسے اس زمین میں کئے گئے کام اور صرف کئے گئے مال کا معاوضہ لے کر زمین کو اس ضرورت مند کے حوالے کرنا ہوگا۔ اگر وہ ضرورت مند یہ معاوضہ ادا نہ کر سکے تو بیت المالِ مسلمین سے ادا کیا جائے گا تاکہ ہر حقدار کو اُس کا حق مل سکے۔ اگر بیت المال سے بھی نہ ہو سکے تو زمین کی آمدنی سے ایک عادلانہ حصہ ان کیلئے مخصوص ہوگا۔

مسئلہ: 448 اگر کوئی شخص کنواں یا چشمہ وغیرہ کھودے تو اُسے صرف اپنی ضرورت کے مطابق اس پانی میں اولویت کا حق حاصل ہوگا۔ اس کی ضرورت سے زائد پانی اس کے ساتھ مختص نہیں ہوگا۔ اگر کوئی ضرورت مند اس زائد پانی کو استعمال کرنا چاہے تو وہ اس سے اس پانی کی قیمت لینے کا

حق نہیں رکھتا، اس لئے کہ یہ پانی اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سب کیلئے ہے۔ کنواں یا چشمہ کھودنے والے کو اپنی محنت کا معاوضہ لینے کا حق حاصل ہے جو اُس نے پانی کو زمین سے نکالنے کیلئے کی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی ضرورت سے زیادہ مچھلی کا شکار کرے تو وہ ضرورت سے زیادہ مچھلی کا مالک نہیں ہے بلکہ ان مچھلیوں کو دریا سے پکڑنے کی عادلانہ مزدوری لے کر انہیں مزدوری ادا کرنے والے کے سپرد کرے گا اور انہیں بیچنے کا حق نہیں رکھتا۔

مسئلہ: 449 زمین کے متعلق اولویت کا حق رکھنے کے تین مراحل ہیں:

1۔ تحجیر یعنی زمین کی حدود کو معین کرنے کیلئے دیوار بنانا۔

2۔ تعمیر یعنی استعمال کیلئے اسے آمادہ کرنا۔

3۔ احیاء۔ اس مرحلہ میں اس کو رہائشی سہولت یا زرعی استعمال میں لایا جاتا ہے۔

یہ اولویت ان تین مراحل کے لحاظ سے مختلف درجات رکھتی ہے۔ یہ درجات ایک دُوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ زمین کی ملکیت کے باعث نہیں ہیں۔

مسئلہ: 450 کام اور کوشش کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی اولویت کی رُو سے صرف کوشش کرنے والوں کی ضرورت کے مطابق زمین ان کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور اپنی ضرورت سے زیادہ زمین میں وہ دُوسروں کے ملازم اور مزدور کی حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ کہ کسی کو اس کی ضرورت نہ ہو اور کوئی اس کا طالب نہ ہو۔ اولویت پیدا کرنے والی یہ کوششیں بالکل اس طرح ہیں کہ اگر چند افراد کے اموال دریا میں غرق ہو جائیں تو ان میں سے ہر شخص کو صرف اپنا مال نکالنے کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اور کا مال بھی دریا سے نکال لے تو وہ اس کا مالک نہیں بن سکتا بلکہ اپنی کوشش اور محنت کی اُجرت لے کر اس مال کو اُس کے مالک کے حوالے کرنا اس پر واجب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس مثال کی صورت میں اگر مال کے مالک نے اسے دریا سے اپنا مال نکالنے کی اجازت نہ دی ہو تو وہ اپنی

مزدوری کا مطالبہ کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔

لیکن اگر اپنی ضرورت سے زیادہ زمین آباد کرلے، جو دُوسروں کا حق ہے تو یہاں اپنے عمل کا معاوضہ لینے کا حق رکھتا ہے۔ دُوسرے حقدار اُس کی محنت کا معاوضہ دے کر ہی اس زمین کو اس سے لے سکتے ہیں، اس لئے کہ ''وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى '' کی رُو سے صرف وہی لوگ اس زائد زمین کو لینے کے حقدار ہیں جو اسے حاصل کرنے کی جائز کوشش کریں۔

ربا

ربا کے معنی ہیں ''زیادہ''۔ فقہی اصطلاح میں یہ مفت خوری کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ظالم سرمایہ دار حرام سے حاصل کیا ہوا مال قرض دے کر اس پر ربا حاصل کر کے اپنی ناجائز دولت میں مسلسل اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ 'لَاتَاكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ' کی رُو سے ہر قسم کی مفت خوری مؤمنین پر بلا استثناء حرام ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کام اور کوشش یا استحقاق کے بغیر کسی مال کا مطالبہ کرے یا اس میں تصرف کرے۔

ربا درحقیقت ایک ایسی خطرناک چیز ہے جو نہ صرف یہ کہ اقتصادی زندگی کے تمام شعبوں میں تباہ کن اثرات رکھتی ہے بلکہ اس کی بنیادوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہے کہ کچھ کاہل اور عیاش افراد اپنی طاقت اور ناجائز دولت کے بل بوتے پر ربا خواری کریں اور فقر و فاقہ میں گرفتار افراد کو زیادہ کام اور محنت پر مجبور کریں تا کہ ان کی آمدنی سے ناجائز فائدہ اُٹھا سکیں، اس لئے کہ ان کی مسلسل ربا خواری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان سے قرض لیتے ہیں، وہ مجبور ہوتے ہیں کہ زیادہ کام کرنے کے علاوہ اپنے کام اور پیداوار کی قیمت میں اضافہ کر دیں تا کہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ اصل سرمایہ کی واپسی کے ساتھ ساتھ ربا کی ادائیگی کیلئے کافی آمدنی حاصل کر سکیں۔ یوں عوام کی اکثریت ایک مصنوعی مہنگائی میں مبتلا ہو جاتی ہے جو اِن مفت خور عیاش افراد کی ربا خواری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اس ساری صورتحال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے نوے فیصد افراد شب و روز محنت

کرنے کے باوجود اپنی بنیادی ضروریات سے بھی محروم رہیں اور دس فیصد بیکار عیاش ان کے خون پسینے کی کمائی سے ربا کی صورت میں لئے گئے پیسے میں غرق ہورہے ہوں۔

ربا کی دوصورتیں ہیں: ایک خصوصی اور اصطلاحی جو قرض اور دُوسرے معاملات میں ہوتی ہے اور دُوسری عمومی جس میں ہرقسم کی ناجائز منافع خوری آجاتی ہے۔'لَا تَاکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ ' کی رُو سے یہ دونوں صورتیں حرام اور ممنوع ہیں اور''اَلَّذِیْنَ یَاکُلُوْنَ الرِّبَا ''(جولوگ ربا کھاتے ہیں) ربا لینے کو حرام کررہی ہے۔ اس کے ضمن میں ربا دینے کی حرمت بھی آجاتی ہے۔ اگرچہ بعض استثنائی حالات میں ربا دینا جائز ہے لیکن ربا لینا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے اور مکمل طور پر حرام و ناقابل معافی ہے۔

آیہ شریفہ''وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی '' کی رُو سے انسان کا جائز حق وہی ہے جو مناسب کوشش اور عمل کے ذریعے حاصل کیا جائے، سوائے اُن واجب اور مستحب ادائیگیوں کے جنہیں مخصوص حالات میں مقرر کیا گیا ہے جبکہ ہرقسم کی مفت خوری کو حرام اور مذموم قرار دیا گیا ہے۔

کسی بھی چیز کا استحقاق کام کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ نہ تو کام کے بغیر وقت کی کوئی قیمت ہے کہ ایک معینہ مدت کیلئے کسی کو قرض دے کر اس مدت کے بدلہ میں کام کئے بغیر پیسہ لیا جائے اور نہ ہی کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی معاملہ میں یا کسی کام میں اپنی محنت سے زیادہ معاوضہ اور منافع حاصل کرے۔

ربا اور قرض

قرض دینا ان کاموں میں سے ایک ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت پسند فرمایا ہے۔ یہ بعض اوقات ہبہ و ہدیہ سے بھی افضل ہے، اس لئے کہ یہ دونوں بعض اوقات کاہلی اور آرام طلبی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لیکن قرض انسان کو کام کرنے کی رغبت دلاتا ہے۔ قرض دینے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے علاوہ ہرقسم کے مادی اور معنوی فوائد کو قرض دینے والے پر حرام کیا گیا ہے۔ اب ربا سے متعلق چند

مسائل پیش کیئے جاتے ہیں:

مسئلہ: 451 جو مال قرض دیا جائے، اس کی واپسی کی مدت معین کرنا آیہ شریفہ کی رُو سے واجب ہے۔قرض کے علاوہ دُوسرے تمام مطلوبات کا حکم بھی یہی ہے۔

مسئلہ: 452 قرض دینے والے کو قرض کی مدت سے قبل کچھ بھی وصول کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔اگر کوئی شخص کسی کو اس شرط پر قرض دے کہ وہ قرض دینے والے کے باپ یا کسی اور عزیز کیلئے فاتحہ پڑھے تو یہ بھی حرام ہے۔

مسئلہ: 453 قرض دینے والا قرض کی مدت ختم ہونے سے پہلے مقروض سے قرض ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔صرف قرض کی مدت پوری ہونے پر ہی مطالبہ کرسکتا ہے۔مدت پوری ہونے پر اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنا چاہے تو قرض دینے والے پر اسے قبول کرنا واجب ہے مگر یہ کہ مقروض اس بات پر راضی ہوجائے کہ طلبگار جب تک اپنا حق لینے میں تاخیر کرے، اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

مسئلہ: 454 قرض کی ادائیگی کے وقت اگر قرض لئے گئے مال کی قیمت کم یا زیادہ ہوچکی ہوتو کم ہونے کی صورت میں اس میں ہونے والی کمی کی تلافی کرکے واپس کرنا چاہئے اور زیادہ ہونے کی صورت میں اسی قیمت کو جواُس نے لی تھی، کسی کمی بیشی کے بغیر واپس کرنا ہوگا، اس لئے کہ جو چیز قرض دی گئی ہے، وہ تو قیمت ہے اور نوٹ اُس کا نمائندہ ہے۔لیکن اگر قرض دینے والا اسی کمتر قیمت والے مال کو قبول کرنے پر راضی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً اگر کوئی شخص آج ایک ہزار روپے ایک سال کیلئے قرض لے، جب ایک ہزار روپیہ کی قیمت پانچ گرام سونا ہو اور ایک سال بعد اس کی قیمت ایک گرام سونے کے برابر ہوتو چار گرام سونے کی کمی جو واقع ہوئی ہے، اُس کی تلافی کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ: 455 ربا اور غیر ربا میں تمام نام نہاد شرعی حیلے ممنوع ہیں، اس لئے کہ جو شریعت ہر قسم کی حیلہ بازی کو ممنوع قرار دیتی ہے، اُس کے لئے کیسے ممکن ہے کہ ربا کے باب میں جو بدترین ظالمانہ

مفت خوری ہے، شرعی حیلوں کی آڑ میں ربا خواری کی اجازت دے دے۔ ان شرعی حیلوں کی آڑ میں ربا خواری کرنے سے کیا وہ خطرات اور مفاسد دُور ہو جاتے ہیں جن کے پیش نظر ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے؟ کیا خدا عاجز ہے کہ بعض صورتوں میں ربا کو حلال کرنے کے لئے شرعی حیلوں کا سہارا لے؟

شرعی حیلوں کی آڑ میں ربا خواری کو جائز قرار دینے والی جو روایات ہم تک پہنچی ہیں، وہ ربا خوار غداروں کی مجرمانہ جعل سازی کا کرشمہ ہیں جیسا کہ زکوٰۃ کے وجوب کا نو چیزوں میں منحصر ہونا بھی اسی قسم کی جعلیات میں سے ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ ایک لاکھ روپیہ اور ماچس کی ایک ڈبیہ ایک سال کیلئے ایک لاکھ بیس ہزار روپے میں فروخت کریں تو کیا حقیقت میں آپ نے اسے فروخت کیا ہے یا قرض دیا ہے؟ اگر قرض دیا ہے تو سال کے بعد آپ وہی ایک لاکھ روپیہ اور ماچس کی ایک ڈبیہ واپس لینے کا حق رکھتے ہیں اور اگر آپ نے اسے فروخت کیا ہے تو دیکھنا ہوگا کہ عقل مند تو درکنار، کون بیوقوف ماچس کی ایک ڈبیہ بیس ہزار روپے میں خریدنے پر تیار ہوتا ہے؟ اگر بالفرضِ محال کوئی ایسا معاملہ کرنے پر تیار ہو بھی جائے تو سفاہت کی بدترین صورت ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ قطعاً باطل ہے۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسولِ خداؐ نے فرمایا:

”اِنَّ الْقَوْمَ يُفْتَنُوْنَ بِاَمْوَالِهِمْ،وَيَسْتَحِلُّوْنَ حَرَامَهُ بِالشُّبُهَاتِ الْكَاذِبَةِ وَالْاَهْوَاءِ السَّاهِيَةِ فَسْتَحِلُّوا الْخَمْرَ بِالنَّبِيْذِوَالسُّحْتَ بِالْهَدِيَّةِ وَالرِّبَابِالْبَيْعِ“.

غلط شہوات کے ذریعے حلال جاننے لگیں گے، وہ شراب کو نبیذ اور رشوت کو تحفہ اور ربا کو بیع کی شکل دے کر اسے حلال کرلیں گے“۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مندرجہ بالا مثال میں بیس ہزار روپے ایک سال کی مدت کے بدلہ میں ہیں، اگرچہ ایک آدھ روپیہ ماچس کی ڈبیہ کے بدلہ میں ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے اس قسم کے شرعی حیلوں پر کتنی شدید سرزنش فرمائی ہے:

”لِاَنَّ الْاِنْسَانَ اِذَااشْتَرَی الدَّ رْھَمَ بِالدِّ رْھَمَیْنِ کَانَ ثَمَنُ الدِّ رْھَمِ دِ رْھَمًا وَثَمَنُ الْآخِرِبَاطِلاً فَبَیْعُ الرِّبَاوَکْسٌ عَلٰی کُلِّ حَالٍ عَلَی الْمُشْتَرِیْ وَ عَلَی الْبَایِعِ“.

”اس لئے کہ انسان جب ایک درہم کو دو درہم میں خریدے تو ایک درہم کی قیمت ایک درہم ہوگی اور دُوسرے درہم کی قیمت باطل ہوگی۔ پس ربا کی خرید وفروخت ہر حال میں خریدار اور فروشندہ دونوں پر حرام ہے“۔

سورۂ مبارکہ اعراف میں بھی جہاں بنی اسرائیل پر ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار حرام ہونے کا ذکر آیا ہے، وہاں ان کے شرعی حیلے کی ان الفاظ میں مذمت کی گئی ہے:

”اِذَایَعْدُوْنَ فِی السَّبْتِ“.(163:7)

”جب وہ چھٹی کے دن خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے“۔

چونکہ مچھلیوں کو بھی معلوم تھا کہ چھٹی کے دن انہیں شکار کرنا حرام ہے، لہٰذا وہ چھٹی کے دن، جو ہفتے کا دن تھا، کثیر تعداد میں ان یہودیوں کے سامنے آ کر ان کا منہ چڑاتی تھیں جبکہ دُوسرے دنوں میں غائب ہو جاتی تھیں۔ ان یہودیوں نے یہ ہتھکنڈہ استعمال کیا کہ ہفتے کے دن جب مچھلیاں آ جاتی تھیں، تو وہ ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیتے تھے اور اس کے بعد والے دنوں میں انہیں جا کر پکڑ لیتے تھے۔ ان کی اسی حرکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں مسخ کر کے بندر بنا دیا تھا۔ جن لوگوں نے انہیں اس شرارت سے منع نہیں کیا اور اس سے بڑھ کر جنہوں نے منع کرنے والوں کو منع کرنے سے روکا، ان سب کو بھی اللہ تعالیٰ نے کسی اور عذاب میں گرفتار کر دیا۔ صرف ان کو اس عذاب سے محفوظ رکھا جنہو ں نے انہیں اس حرکت سے منع کیا تھا۔

مسئلہ: 456 اگر ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے والی چیزوں یا ایک ہی اصل سے حاصل کردہ چیزوں کے لین دین میں ان کے ناپ یا تول میں اگر ایک زیادہ ہوتو وہ ربا ہے۔اس کی وجہ دراصل قیمت کا زیادہ ہونا ہے۔وزن یا پیمانے کا زیادہ ہونا اصلی معیار نہیں ہے۔اس حکم کا ناپی اور تولی جانے والی اشیاء سے اختصاص صرف اس وجہ سے ہے کہ اسی صورت میں دو چیزوں کے تبادلہ میں ان کا مساوی یا عدم مساوی ہونا واضح ونمایاں ہوتا ہے۔

مسئلہ: 457 جن چیزوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے، وہ بعض اوقات ایک جنس سے ہوتے ہوئے قیمت میں یکساں نہیں ہوتیں یا ایک جنس سے نہیں ہوتیں لیکن ان کی قیمت یکساں ہوتی ہے۔ایسی تمام صورتوں میں ربا اور حرمت کا معیار صرف قیمت ہے، نہ کہ پیمانہ یا وزن، مثلاً اگر بیس عدد مرغی کے انڈے دے کر بیس عدد مرغابی کے انڈے لئے جائیں تو اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ ربا نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ناپ یا تول کر دی یا لی جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ معدود ہیں یعنی ان کو گن کر ان کا لین دین کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر ایک کلوگرام گھی کو ایک کلو اور چند گرام لسی سے تبدیل کیا جائے تو فقہاء یہ کہتے ہیں کہ جس نے زیادہ لسی لی ہے، وہ رباخوار ہے، حالانکہ ایک کلوگرام گھی کی قیمت ایک کلو اور چند گرام لسی کی قیمت سے کئی گنا زیادہ ہے۔یہاں یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ اس لین دین میں رباخوار اور مفت خور کون ہے؟ کون عاقل بلکہ دیوانہ اس لین دین میں گھی لینے والے کو گھاٹے میں اور لسی لینے والے کو حیلہ گر اور رباخوار کہے گا؟ پھر فقہاء اور مجتہدین کو کیا ہو گیا ہے کہ جو بات ایک دیوانہ بھی کہنے کو تیار نہیں ہے، اُسے خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں؟

قرآنی آیات کی روشنی میں ربا سے متعلق احادیث میں غور وفکر کے نتیجہ میں اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ربا صرف مفت خوری اور اپنے حق سے زیادہ لینے یا دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ: 458 ربا لینے والا کسی صورت میں بھی اس کا مالک نہیں بن سکتا۔ اگر وہ سچی توبہ کر لے تو اس کا ابتدائی سرمایہ ہی اس کی ملکیت ہوگا اور ربا کے ذریعے اس نے جو رقم اکٹھی کر رکھی ہے، وہ اس کے مالکان کو واپس کرنا واجب ہے، سوائے اس رقم کے جو وہ خرچ کر چکا ہو اور اس کا بدل بھی اس کے پاس موجود نہ ہو۔ یہ اس کی توبہ کے احترام کے پیش نظر ہے کہ سود کی وہ صرف شدہ رقم جس کا بدل موجود نہ ہو، اس سے صرفِ نظر کیا گیا ہے اور اس کا اصلی سرمایہ بھی اسی کے لئے رہنے دیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ حرام طریقے سے خصوصاً ربا کے ذریعے حاصل نہ کیا گیا ہو بلکہ اس کا وہ ابتدائی سرمایہ جو حلال کے راستے سے کمایا گیا اور پھر اس پر سود لیا گیا، وہی اس کی ملکیت ہے۔

بنابرایں سود کی وہ رقم جو ابھی اُس کے پاس ہو یا اس نے مقروض افراد سے لینی ہو، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے اصلی مالکوں کا حق ہے۔ اس کا حق صرف اس کا اپنا ابتدائی سرمایہ ہے۔ لیکن اگر وہ توبہ نہ کرے تو سود کی جو رقم خرچ کر چکا ہے اور اس کا بدل بھی اس کے پاس نہ ہو تو وہ بھی واپس کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 459 وہ تمام منافع جو منافع حاصل کرنے والے افراد کے عمل کے معاوضہ کے طور پر ادا کئے جائیں، اگر عادلانہ ہوں تو حلال ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو کوئی چیک دے کہ وہ اسے کسی دُوسرے شہر میں وصول کرے تو چونکہ اس میں کام کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، لہٰذا اس چیک کی رقم وصول کرنے والے کو زیادہ رقم لینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ قرضِ حسنہ کے وہ بینک جو ملازمین رکھتے ہیں، اگر صرف ان کے کام کی واقعی اُجرت دریافت کی جائے جو قرض کی مدت کے مقابل نہ ہو تو یہ ربا نہیں ہے اور حرام بھی نہیں ہے۔ اس کی بنیاد صرف ملازمین کے کام کی اُجرت ہوگی جس پر قرض کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، سوائے اس کے کہ مدت کے طولانی ہونے کی وجہ سے صاحبانِ حساب کے زیادہ رجوع کرنے کی وجہ سے بینک کے ملازمین کو زیادہ کام کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

مسئلہ: 460 اگر قرض لینے والا قرض لی گئی رقم سے کام اور تجارت کر کے کوئی منفعت حاصل کرے تو اگر کسی شرط کے بغیر اپنی رضا و رغبت سے اس نفع میں سے کچھ رقم قرض دینے والے کو دے تو یہ نہ صرف یہ کہ حرام نہیں ہے بلکہ مستحب بھی ہے۔ یہ صرف اُسی صورت میں حرام ہے جب اسے قرض کی لازمی شرط قرار دیا جائے۔

مسئلہ: 461 اگر بینک اپنے گاہکوں کو ان کی جمع کروائی ہوئی رقم پر ماہانہ یا سالانہ رقم دیتا ہو اور گاہک کی طرف سے اس کا مطالبہ یا شرط نہ ہو تو بینک کی طرف سے دی گئی اضافی رقم قبول کرنا جائز ہے لیکن بہتر ہے کہ جو کچھ وصول کیا جائے، وہ مضاربہ یا مصالحت کے عنوان کے تحت ہو، جیسا کہ مضاربہ کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ بہرصورت ربا اور مفت خوری کی تمام اقسام آیت ِربا اور آیت ِمفت خوری کے تحت آتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق لوگوں کی کثیر تعداد ربا لینے اور دینے میں مبتلا ہو جائے گی کہ:

"اَلرِّبَا ثَلا ثَةٌ وَسَبْعُوْنَ بَابًا". (سنن ابن ماجہ: تجارات: 58)

یعنی "ربا کے تہتر دروازے ہیں"، جن میں بعض تو رسمی اور معروف ہیں اور بعض نام نہاد شرعی حیلوں کی آڑ میں۔

نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

"لَیَاتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَایَبْقٰی اَحَدٌاَلَّااٰکَلَ الرِّبَا فَمَنْ لَمْ یَاکُلْهُ اَصَابَهٗ مِنْ غُبَارِهٖ" (الد رالمنثو ر: 1:367)

یعنی لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ ان میں سے کوئی بھی رباخواری سے محفوظ نہیں رہے گا اور اگر ربا نہ کھائے تو اس کی گرد تو ضرور اس کو پہنچے گی۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ پیسے کے لین دین اور اشیاء کے لین دین میں زیادہ دینا اور زیادہ لینا

ربا ہے جو حرام ہے۔ زیادہ سے مراد وزن، حجم یا عدد میں زیادہ ہونا نہیں بلکہ قیمت میں زیادہ ہونا مراد ہے۔ صرف اشیاء کا پیسے سے لین دین کرنے میں عادلانہ تجارتی منافع حاصل کرنا حلال ہے۔

رہن

مسئلہ: 462 رہن اُس گروی کو کہتے ہیں جو قرض دینے والا اپنے اطمینان کیلئے مقروض سے لیتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 183 اس مسئلہ کو اس طرح بیان فرما رہی ہے:

"وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ".

"اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب تمہاری دسترس میں نہ ہو تو رہن لے لو اور اگر تمہیں ایک دُوسرے پر اطمینان ہو تو جس نے امانت رہن لی ہے، وہ اپنی امانت واپس کرے اور اللہ سے ڈرے جو اُس کا رب ہے"۔

امانت کو واپس کرنے کا لازمی حکم اس صورت میں ہے جب امانت کا مالک اس کا مطالبہ کرے، اس لئے کہ امانت رکھنے کی دو صورتیں جائز اور تیسری خیانت ہے۔ دو جائز صورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ اطمینانِ خاطر کیلئے مقروض سے کوئی امانت بطور گروی لے کر رکھ لیں اور دُوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص آپ سے کہے کہ میرے مال کی اپنے پاس حفاظت کریں۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس ہو تو چاہے اُس میں تصرف کریں یا نہ کریں، اسے اپنے پاس رکھنا ہی خیانت ہے۔

بنابرایں رہن لینا صرف اُس صورت میں جائز ہے جب قرض دینے والے کیلئے حصولِ اطمینان کی کوئی اور راہ موجود نہ ہو۔ اگر رہن لینے کے بعد اطمینان کی کوئی اور صورت پیدا ہو جائے تو

رہن واپس کرنا واجب ہے،مگر یہ کہ اس کا مالک اس کے آپ کے پاس رہنے پر راضی ہو۔

مسئلہ: 463 چونکہ رہن، قرض دینے والے کے پاس مقروض کی امانت ہے، لہٰذا وہ اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا مگر یہ کہ اُس کا مالک اجازت دے، اس لئے کہ رہن پر کوئی ایسا معاملہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے وہ اپنے مالک کے تصرف سے خارج ہو جائے۔ بنابر ایں مالک رہن میں ہر قسم کا تصرف کرسکتا ہے، سوائے اس صورت کے کہ وہ رہن، رہن کی حالت پر باقی نہ رہے۔

مسئلہ: 464 اگر رہن لینے والا اس شرط پر قرض لے کہ اُسے رہن میں تصرف کرنے کا حق ہو تو یہ بلا شبہ ربا اور حرام ہے۔

مسئلہ: 465 رہن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر مقروض مقررہ مدت پوری ہونے پر اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو قرض دینے والا رہن کو کرائے پر دے کر یا کسی اور کے پاس رہن رکھ کر یا اسے فروخت کر کے یا کسی اور مناسب ذریعہ سے اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں امانت داری کے تقاضوں کی پابندی ضروری ہے۔ بہتر یہ ہے کہ رہن لیتے وقت یہ شرط کرلے کہ اگر مقررہ وقت پر اس کی رقم واپس نہ لوٹائی گئی تو وہ مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی طریقہ کو اپنا کر اپنی رقم حاصل کر سکے گا۔ لیکن اگر یہ شرط نہ کی جائے تو بھی رہن ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ قرض دینے والا بوقت ِضرورت اسے اپنی رقم کی جگہ استعمال کر سکے۔ اگر رہن کا مالک یہ شرط کرے کہ رہن کو قرض کی جگہ شمار نہ کیا جائے تو ایسے رہن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرض کا معاملہ درست نہ ہوگا، اس لئے کہ قرض دینے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کی واپسی کا اطمینان ہو اور رہن اس اطمینان کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

مسئلہ: 466 چونکہ رہن کا اصل مقصد حصولِ اطمینان ہے، لہٰذا آیہ شریفہ کی رُو سے ''فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ'' رہن قرض دینے والے کے قبضہ میں ہونا چاہئے۔ البتہ وہ اسے استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ صرف حصولِ اطمینان کیلئے اسے پاس رکھے گا، اس لئے کہ اگر وہ اسے اپنے پاس نہ رکھے تو یہ

رہن نہیں ہوگا اور اس پر رہن کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر مقروض اسے رہن کو استعمال کرنے کی اجازت دے دے تو اسے استعمال کرنا جائز اور حلال ہے۔

مسئلہ: 467 مقروض کو اپنا قرض ادا کرنے سے قبل رہن کو فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے کا حق نہیں ہے، مگر یہ کہ قرض دینے والے کا حق محفوظ رہے اور وہ اس پر راضی بھی ہو۔

مسئلہ: 468 چونکہ رہن امانت ہے، لہٰذا اگر قرض دینے والے کے پاس اس کی کوتاہی کے بغیر ناقص یا ضائع ہو جائے تو بعید نہیں ہے کہ وہ اس کا ذمہ دار نہ ہو اور اس کا حق بدستور مقروض کی گردن پر باقی رہے، اس لئے کہ ''مَاعَلَی الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ'' یعنی ''نیکوکاروں پر کوئی سبیل (الزام) نہیں ہے'' (91:9)، ہر قسم کی امانت کو شامل ہے، اگرچہ رہن کی امانت قرض دینے والے کے مفاد میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود مقروض کیلئے بھی نافع ہے کہ ایک تو اُس نے قرض حاصل کیا اور دُوسرے یہ کہ اُس کا مال بھی قرض دینے والے کے پاس محفوظ ہے۔

امانت

مسئلہ: 469 اگر کوئی شخص اپنا مال آپ کے پاس بطور امانت رکھے اور آپ بھی اسے قبول کرلیں تو آپ پر واجب ہے کہ اس کی حفاظت کی اسی طرح کوشش کریں جیسے اپنے مال کی حفاظت کیلئے کرتے ہیں اور بروقت اسے اس کے مالک کے سپرد کردیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا''.

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکان کو واپس کرو''۔ (58:4)

''تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ''. (27:8)

''اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو''۔

چونکہ امانت کو قبول کرنا اور اس کی حفاظت کیلئے کوشش کرنا امانت کے مالک پر احسان ہے، لہٰذا ''ما علی المحسنین من سبیل'' کی رُو سے امانت کے تلف یا ناقص ہو جانے کی صورت

میں مالک کو امانت دار سے اس کے بدل کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، بشرطیکہ امانت کے ضائع یا ناقص ہونے میں امانت دار کی کوتاہی نہ ہو۔

مسئلہ: 470 جو شخص امانت کی حفاظت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اُسے امانت کو قبول نہیں کرنا چاہیئے، مگر یہ کہ اپنی نااہلی سے امانت کے مالک کو آگاہ کر دے، اگر اس کے باوجود مالک اس کے پاس امانت رکھنے پر مصر ہو تو اس صورت میں اس کی امانت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر مالک کا یہ اقدام سفیہانہ ہو تو نہ اس کا امانت رکھنا شرعاً درست ہے اور نہ ہی قبول کرنے والے کا قبول کرنا صحیح ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اچھی طرح امانت کی حفاظت کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہونے کے باوجود امانت کے مالک اور دُوسرے افراد سے بہتر حفاظت کر سکتا ہو تو اس صورت میں امانت کو قبول کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب بھی ہے، اس لئے کہ مسلمان کے مال کی حفاظت درصورتِ امکان واجب ہے۔

امانت دار کو امانت کی حفاظت کیلئے حتی الامکان کوشش کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی، خیانت یا کم از کم خلافِ امانت داری ہے۔ اگر امانت دار کی کوتاہی کی وجہ سے امانت ناقص یا ضائع ہو جائے تو وہ ضامن ہے۔ البتہ ''حتی الامکان کوشش کرنے'' کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ خود کو عسر وحرج میں ڈال دے، بلکہ مراد یہ ہے کہ عسر وحرج میں پڑے بغیر امانت کی حفاظت کی کوشش کرے۔ لیکن اگر اس کی حفاظت کی وجہ سے اس کی اپنی جان یا آبرو کو خطرہ ہو یا کوئی اور بڑا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس صورت میں امانت کی حفاظت واجب نہیں رہے گی، اس لئے کہ ایسی صورت میں اس پر اپنی جان کی حفاظت واجب ہو جاتی ہے۔ اگر امانت کی حفاظت کرنے سے اس کا اپنا مال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی امانت کی حفاظت اس پر واجب نہیں ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر امانت داری ایک بلا معاوضہ کام ہے جو امانت گزار پر احسان ہے، لہٰذا مفت میں اپنی جان و مال و عزت و آبرو کو داؤ پر لگانا درست نہیں ہے۔

مسئلہ: 471 امانت گزار جب بھی اپنی امانت کا مطالبہ کرے تو حتی الامکان جلد از جلد ادا کرنا واجب ہے۔ اگر امانت گزار اس کا مطالبہ نہ کرے لیکن امانت دار کسی وجہ سے اس کی حفاظت نہ کر سکتا ہو تو امانت گزار کو چاہئے کہ وہ اپنی امانت واپس لے لے ورنہ تلف ہو جانے کی صورت میں امانت دار ضامن نہ ہوگا۔

مسئلہ: 472 اگر امانت کا مالک مر جائے تو امانت اس کے ورثاء کے سپرد کی جائے گی اور اگر وہ دیوانہ یا سفیہ ہو جائے تو اس کے ولی کے سپرد کی جائے گی۔

مسئلہ: 473 اگر امانت دار امانت کی حفاظت کی اُجرت مقرر کرے تو ایسی صورت میں اگرچہ یہ معاملہ خالص امانت داری کی نوعیت کھو دے گا مگر اس کے باوجود ہر صورت میں امانت دار ضامن نہیں ہے، بشرطیکہ وہ امانت داری کی صلاحیت رکھتا ہو اور کوتاہی یا خیانت کا مرتکب نہ ہو۔

اجارہ (کوئی چیز کرائے پر دینا)

جو مال کام اور کوشش کے نتیجہ میں حاصل کیا جاتا ہے، اُسے زمین، مکان، سواری اور اس طرح کی دُوسری اشیاء خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اشیاء کو، جو درحقیقت کام کا نتیجہ ہیں، کیا انہیں کرایہ پر دینا روا ہے؟ اور یہ کہ پیسے کو کرائے پر دینے اور اس سے خریدی ہوئی چیز کو کرائے پر دینے میں کیا فرق ہے؟

جواب یہ ہے کہ پیسے اور دُوسرے اموال میں یہ فرق ہے کہ پیسے کو کام پر نہ لگایا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن دُوسرے اموال کام اور کوشش کے بغیر بھی منفعت رکھتے ہیں، گھر میں رہائش اختیار کی جاسکتی ہے، سواری پر سفر کیا جاسکتا ہے اور اس طرح دُوسری اشیاء بھی ایسی ہی خالص منفعت رکھتی ہیں جو کوشش اور محنت کے بغیر مستاجر (کرایہ پر لینے والا) کو حاصل ہوتی۔ پس یہ منافع ان اموال کے مالکان کے علاوہ دُوسرے لوگوں کو، جو اِن کے مالک نہیں ہیں، کیوں مفت دے دیئے جائیں؟ اس کے برعکس کیا مستاجر کی طرف سے اس خالص منفعت کے مقابل دریافت کیا جانے والا

کرایہ مفت خواری ہے؟ دُوسرے الفاظ میں دُوسروں کے مال سے کوشش اور زحمت کے بغیر فائدہ اُٹھانا تو مفت خواری نہیں ہے لیکن اگر مال کا مالک اس سے فائدہ حاصل کرے تو یہ مفت خواری ہے؟

یہ تو مال کو کرایہ پر دینے کی بات تھی۔ رہی پیسے کو کرایہ پر دینے کی بات، تو یہ بالکل مفت خواری ہے، اس لئے کہ پیسے سے کام کئے بغیر اس کا کوئی نفع نہیں ہے۔ اگر اسے کام میں لگایا جائے تو اس سے حاصل ہونے والے فوائد اسی شخص کے ہوں گے جس نے کام کیا ہے، مالک کے نہیں۔ مگر یہ کہ یہ معاملہ مضاربہ کی صورت میں انجام پائے کہ کام کرنے والا اور پیسے کا مالک دونوں نفع و نقصان میں شریک ہوں۔

اب اجارہ سے متعلق چند مسائل پیش کئے جاتے ہیں۔

مسئلہ: 474 وہ تمام شرائط جو دیگر تمام معاملات میں معاملہ کے فریقین اور معاملہ کے مادہ کے متعلق معتبر ہیں، اجارہ میں بھی معتبر ہیں۔ البتہ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو اجارہ سے مختص ہیں۔

مسئلہ: 475 کسی چیز کو حرام کے طور پر استعمال کیلئے اجارہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ اگر موجر (کرایہ پر دینے والا) کو علم ہو کہ مستاجر اس چیز کو حرام استعمال کیلئے اجارہ پر لے رہا ہے تو اسے کرائے پر دینا حرام ہے، اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں گناہ پر تعاون پایا جاتا ہے اور آیہ شریفہ

"**وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ**" (2:5) کے مطابق،

گناہ اور عدوان پر تعاون کرنا حرام ہے۔

مسئلہ: 476 اگر مکان یا دُکان یا کسی اور چیز کو اس شرط پر کرایہ پر دیا جائے کہ صرف مستاجر اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے تو مستاجر کسی اور کو اس چیز سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا، چاہے اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو، اگرچہ خود بھی ان کے ساتھ اس استفادہ میں شریک ہو۔

مسئلہ: 477 اگر اجارہ میں اس قسم کی کوئی شرط نہ ہو اور موجر بھی عام طور پر ایسی شرط نہ کرتا ہو کہ مستاجر کسی اور کو اجارہ پر نہ دے تو اس صورت میں اگر مستاجر کسی اور کو اجارہ پر دینا چاہے تو مالک

سے اجازت لینا ضروری ہے، اس لئے کہ اس نے اپنی چیز مستاجر کو دی ہے اور اسے کسی اور کو دینا اس کی اجازت سے ہی ممکن ہے، اس لئے بھی کہ اجارہ پر لی ہوئی چیز امانت کی حیثیت رکھتی ہے اور امانت کو اس کے مالک کی اجازت کے بغیر کسی اور کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اسی صورت میں مستاجر کسی اور کو اجارہ پر دے سکتا ہے جب اجارہ میں اسے ایسی اجازت حاصل ہو یا مستاجر کا دُوسروں کو اجارہ پر دینا معمول کے مطابق اور رائج ہو۔

مسئلہ: 478 اگر مستاجر موجر کی اجازت سے اجارہ پر لی گئی چیز کسی اور کو اجارہ پر دینا چاہے تو کرایہ میں اضافہ کرنے کا حق نہیں رکھتا مگر یہ کہ زمان و مکان کے اعتبار سے خود بخود اس میں اضافہ ہو جائے یا مستاجر نے اس چیز پر کوئی ایسا عمل کیا ہو جو قیمت رکھتا ہو یا اس کے متعلق اُس نے ایسی قیمتی کوشش کی ہو جو عادلانہ طور پر اس کیلئے زیادہ اُجرت کا موجب ہو۔ جن صورتوں میں کرایہ میں اضافہ کرنا جائز نہیں ہے، اگر کرایہ میں اضافہ کر دے تو جس قدر اضافہ کرے، وہ ربا اور حرام ہے۔ جیسا کہ ربا کے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ ربا، جو مفت خوری کی بہت سی اقسام میں سے ایک قسم ہے، تمام معاملات میں بلا استثناء حرام ہے۔

مسئلہ: 479 اجارہ معاملاتِ لازم میں سے ہے۔ اس میں اجارہ پر دی جانے والی چیز اور اجارہ کی مدت کو معین ہونا چاہئے۔ فریقین میں سے کسی کو بھی اسے فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، سوائے معین حالات کے۔

مسئلہ: 480 اجارہ کو کسی بھی وجہ سے فسخ نہیں کیا جا سکتا مگر یہ کہ اجارہ پر لی گئی چیز سے استفادہ ناممکن ہو جائے یا فریقین اسے فسخ کرنے پر متفق ہو جائیں یا اجارہ کی کسی شرط کی مخالفت کی جائے۔

مسئلہ: 481 اگر موجر یا مستاجر میں سے کوئی مر جائے، تب بھی اجارہ فسخ نہیں ہوتا، اس لئے کہ موجر نے اپنی ملکیت ایک محدود مدت کیلئے مستاجر کو اجارہ پر دی ہے۔ اگر وہ اس ملکیت کو فروخت کر دے یا اس کی موت کی صورت میں وہ اس کے وارث کو مل جائے تو ہر صورت میں اس مقررہ مدت

کے دوران یہ ملکیت مسلوب المنفعت ہے اور اجارہ کے باطل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اگر اجارہ کو صرف مستاجر کے استفادہ یا موجر و مستاجر میں سے کسی ایک کی زندگی تک مقید کیا گیا ہو تو اِن صورتوں میں موجر یا مستاجر کی موت سے اجارہ باطل ہو جائے گا۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں بھی اجارہ باطل نہیں ہوگا۔

مسئلہ: 482 اجارہ پر لی گئی چیز مستاجر کے پاس موجر کی امانت ہے، خصوصاً جبکہ وہ اس کی اُجرت بھی دے رہا ہے۔ لہٰذا اگر خیانت یا حفاظت میں کوتاہی یا اجارہ کی شرائط کی خلاف ورزی کے بغیر وہ ناقص یا تلف ہو جائے تو مستاجر کے ذمہ نہیں ہے، خصوصاً ایسے نقص یا تلف کی صورت میں جو معمول کے مطابق استعمال کی وجہ سے رونما ہو جاتا ہے۔

بہرصورت امانت کی تین اقسام ہیں:

1۔ جس پر امانت دار نہ کوئی چیز لیتا ہے اور نہ ہی کوئی چیز دیتا ہے۔ یہ یقینی طور پر "**ما علی المحسنین من سبیل**" کے زمرہ میں آتی ہے۔

2۔ اجارہ کی امانت جس پر امانتدار کرایہ ادا کرتا ہے، یہ بھی آیہ شریفہ میں داخل ہے۔

3۔ رہن کی امانت جس کا فائدہ صرف امانت دار کو ہوتا ہے۔ یہ صورت بھی ظاہراً آیہ شریفہ میں داخل ہے، اس لئے کہ یہ بھی احسان میں داخل ہے، نہ کہ خیانت میں، چاہے اس کے مقابل کوئی مال ہو یا نہیں۔ ان تینوں صورتوں میں امانت دار کی کوتاہی سے امانت کو نقصان پہنچے تو وہ ضامن ہے۔

مسئلہ: 483 اشیاء کی خرید و فروخت کی مانند اجارہ کی رقم (کرایہ) کا عادلانہ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ربا اور حرام ہے، اگرچہ اسے اصطلاح میں ربا نہ کہا جاتا ہو لیکن یہ مفت خوری ہے اور اس آیہ شریفہ میں داخل ہے: "لَا تَاكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ"۔

مسئلہ: 484 اگر کسی مکان کا کرایہ پانچ ہزار روپے ماہانہ ہو اور مستاجر ایک لاکھ روپے موجر کو دے دے اور پھر ماہانہ تین ہزار روپے کرایہ ادا کرے تو اگر کرایہ میں دو ہزار روپے کی کمی ایک لاکھ

روپے کے مقابل ہوتو یہ ربا اور حرام ہے لیکن اگر نقد ادا کئے گئے ایک لاکھ روپے اس لئے ادا کئے گئے ہوں کہ مستاجر کو اطمینان رہے اور اگر وہ موجر کو کرایہ ادا نہ کرے تو وہ اس میں سے کرایہ کی رقم لے سکے اور کرایہ کا کچھ حصہ اس رقم کے مقابل منفعت کے طور پر مدِ نظر نہ ہو تو صحیح ہے۔ اگر یہ دونوں پہلو مد نظر ہوں تو پھر بھی ربا کے لحاظ سے حرام ہے۔

مسئلہ: 485 کرایہ کی ادائیگی کا طریقہ اگر پہلے سے معین ہو تو اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر اجارہ کی تمام مدت کا کرایہ پیشگی ادا کرنا طے پائے تو اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے اور اگر ماہانہ یا کسی اور حساب سے طے پائے تو اس کے مطابق اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

مسئلہ: 486 اگر مستاجر کسی عذر کے بغیر کرایہ کی ادائیگی میں تاخیر کرے تو موجر اجارہ کو فسخ کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے بروقت کرایہ ادا نہ کرسکے تو ''فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ'' کی رُو سے اتنی مہلت دینا واجب ہے جس میں وہ جائز شرعی طریقوں سے اسے مہیا کر سکے۔ لیکن اگر مستاجر سوچے سمجھے بغیر اور اپنی مالی حالت کو مدِ نظر رکھے بغیر کوئی چیز اجارہ پر لے لے اور اس سے بھی بدتر یہ کہ اپنی اقتصادی حالت کی رُو سے یہ جانتے ہوئے کہ وہ بروقت کرایہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو یہاں ''فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ'' کی گنجائش نہیں ہے اور مالک اجارہ کو فسخ کرسکتا ہے۔

مسئلہ: 487 مستاجر مقررہ مدت تک اجارہ پر لی ہوئی چیز سے استفادہ کے علاوہ کوئی اور تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا، سرقفلی کا حق اگرچہ ایک عرفی اور عاقلانہ حق ہے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ سرقفلی کا حق لے کر مالک کی اجازت کے بغیر اجارہ پر لی ہوئی چیز کسی اور کے حوالے کردے۔

مسئلہ: 488 جس طرح مستاجر بعض اوقات سرقفلی کا حق رکھتا ہے، اسی طرح مالک بھی یہ حق رکھتا ہے کہ مستاجر سے سرقفلی کا حق لے لے۔ یہ حق صرف مالک کے بعض مخصوص حالات کے پیش نظر پیدا ہوتا ہے کہ کرایہ کی رقم کے علاوہ ملکیت کے لئے ایک اور حق بھی وجود میں آجاتا ہے جو کرایہ کی

معمولی رقم تو در کنار، ملکیت کی قیمت سے بھی بعض اوقات مہنگا ہوتا ہے۔

مسئلہ: 489 اگر مستاجر کسی عذر کے بغیر اجارہ پر لی ہوئی چیز سے استفادہ نہ کر سکے تو اجارہ پھر بھی برقرار رہتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنا مال ضائع ہونے سے بچانے کیلئے اجارہ پر لی ہوئی چیز کو کسی اور کو اجارہ پر دے سکتا ہے۔ اگر مالک ایسا کرنے کی اجازت نہ دے تو عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ معاملہ کو فسخ کر دیا جائے مگر یہ کہ مالک کیلئے نقصان دہ ہو۔

مسئلہ: 490 معاملہ کو فسخ کرنے کے جن اختیارات کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے، وہ اجارہ میں بھی معتبر ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص دو کمروں پر مشتمل ایک مکان کرایہ پر لے اور ان میں سے ایک میں اجارہ کی بعض شرائط موجود نہ ہوں تو مستاجر کو حق ہے کہ سرے سے اجارہ کو فسخ کر دے یا دُوسرے کمرہ کے اجارہ کی رقم یا بعض دُوسری شرائط میں نظر ثانی کرے یا یہ کہ اگر سواری کیلئے کوئی جانور تین دن سے زائد مدت کیلئے اجارہ پر لے اور وہ تین دن کے اندر اندر مر جائے یا بیمار ہو جائے تو اجارہ فسخ ہو سکتا ہے۔

وکالت

مسئلہ: 491 وہ عام شرائط جو تمام معاملات میں ضروری ہے وکیل اور مؤکل میں بھی ضروری ہے۔ چونکہ وکالت لازم نہیں ہے بلکہ جائز ہے، لہٰذا وکیل اور مؤکل میں سے کوئی بھی جب چاہے، وکالت کو ختم کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس سے دُوسرے کو نقصان نہ ہو۔ لیکن اگر وکالت میں ہمیشہ کیلئے باقی رہنے یا کسی خاص مدت تک وکالت کے برقرار رہنے کی شرط مقرر کر دیں تو اس صورت میں وکالت لازم ہو جائے گی اور طرفین میں سے کسی کو اس کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، اسے وکالتِ بلاعزل بھی کہتے ہیں۔

مسئلہ: 492 وکیل کے اختیارات اور وکالت کی مدت، معاہدۂ وکالت میں معین ہوتے ہیں اور وکیل کو ان کی خلاف ورزی کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی سے مؤکل کو نقصان

پہنچے تو وکیل کو یہ نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر اسے کوئی فائدہ پہنچے تو وکیل اس میں حصہ دار نہیں ہے۔

مسئلہ: 493 مؤکل نے وکیل کیلئے جو حق الوکالہ (اُجرتِ وکالت) مقرر کیا ہو، اگر عادلانہ اور ہر قسم کی دھوکہ دہی اور فریب کاری سے پاک ہو تو اسے کسی کمی بیشی کے بغیر ادا کرنا مؤکل کے ذمہ ہے اور وکیل اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اگر حق الوکالہ معین نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں وکیل صرف اپنے جائز عادلانہ حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ صرف اس صورت میں وکیل حق الوکالہ کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ یا تو صریحاً اس نے اپنے حق کو ساقط کر دیا ہو یا حالات سے یہی ظاہر ہو رہا ہو کہ وہ مفت وکالت کر رہا ہے۔

مسئلہ: 494 اگر مؤکل وکیل کو معزول کر دے تو معزولی کی اطلاع اس تک پہنچنے سے قبل اس نے اپنی وکالت کی اساس اور حدود کے مطابق جو کام انجام دیئے ہوں، وہ سب شرعاً صحیح اور ناقابل فسخ ہیں۔

مسئلہ: 495 اگر وکیل اور مؤکل میں کسی کام کے متعلق اس لحاظ سے اختلاف پیدا ہو جائے کہ آیا وہ کام وکیل نے اپنے معزول ہونے کی اطلاع ملنے سے پہلے انجام دیا ہے یا بعد میں تو ظاہراً وکیل کی بات مقدم ہے، اس لئے کہ اس کی وکالت صرف اُسی صورت میں بے اثر سمجھی جائے گی جب یہ ثابت ہو جائے کہ اُس نے یہ کام معزول ہونے کی اطلاع پانے کے بعد کیا ہے۔ لیکن اگر مؤکل اپنے اس دعویٰ پر شرعی گواہی پیش کر دے کہ وکیل نے مذکورہ کام معزول ہونے کی اطلاع پانے کے بعد انجام دیا ہے تو شہادت اور قسم کے شرعی معیار کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 496 وکالت اجارہ کی مانند نہیں ہے کہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے بلکہ یہ زندہ انسان کے اپنے بعض اختیارات کو کسی دُوسرے انسان کے سپرد کرنے کا نام ہے۔ جس طرح انسان اپنی موت کے بعد کوئی کام انجام نہیں دے سکتا، اُس کا وکیل بھی، جو بعض مقررہ اعمال میں اُس کا نائب

ہے، اُس کی موت کے بعد اُس کا وکیل نہیں رہے گا اور اس کی وکالت باطل ہو جائے گی۔

اسی طرح وکیل کے مرنے کے بعد اس کی وکالت بھی اس کے ورثاء کو منتقل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مراجع تقلید اور قضاۃ شرع کی وکالتیں ان کی موت کے بعد باطل ہو جاتی ہیں اور یہ وکالتیں ایسے مؤکلین کی محتاج ہوتی ہیں جن میں مناسب صلاحیتیں پائی جاتی ہوں۔

ضمانت

مسئلہ: 497 اگر کوئی شخص کسی کے قرض کی ادائیگی کو اپنے ذمہ لے لے کہ اگر مقروض خود ادا نہ کرے تو وہ اس کی جگہ اس کا قرض ادا کرے گا تو اس صورت میں اس پر واجب ہے کہ قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد اگر مقروض اپنا قرض ادا نہ کرے تو وہ ادا کرے۔ وہ بعد ازاں مقروض سے اس کا مطالبہ کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس نے مقروض سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر وہ اپنا قرض ادا نہ کرے تو وہ اس کی جگہ ادا کرے گا۔ بعد میں جب بھی مقروض ادا کر سکے، ادا کر دے یا اتنی مدت کے اندر ادا کرے۔ اگر ان کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو اور ضامن کے اس اقدام سے بھی یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ اس کام کو مفت انجام دے رہا ہے تو اس صورت میں بھی وہ مقروض سے اپنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ ضامن نے یہ کام مفت اور بلا معاوضہ انجام دیا ہے یا قرضِ حسنہ ہے تو اس صورت میں بھی جو کچھ اس نے ضامن کی حیثیت سے ادا کیا ہے، اُس کے مطالبہ کا حق رکھتا ہے مگر یہ کہ ثابت ہو جائے کہ وہ مفت ضامن بنا ہے۔

یہ ضمانت صرف اس صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب قرض دینے والا اور مقروض اس کو قبول کریں، چاہے یہ ضمانت بلا معاوضہ ہو یا با معاوضہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ضامن مقروض کا قرض ادا کرنے کی صلاحیت اور امکان رکھتا ہو ورنہ اس کی ضمانت باطل ہے۔



ازدواجی زندگی

ازدواجی زندگی ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جو بعض اوقات روٹی، کپڑے اور مکان سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کرلیتی ہے، اس لئے کہ بعض اوقات ممکن ہے کہ انسان لباس اور مکان کی کمی کو برداشت کرلے اور بھوک کو بھی اس حد تک برداشت کرلے جو اُسے موت کی سرحد تک نہ لے جائے لیکن اس کی جنسی ضرورت اس قدر شدت اختیار کرلے کہ اُس کی زندگی کو اس پر تنگ کرکے اُس کے لئے ایک ایسی ناقابل برداشت گھٹن کی حالت پیدا کردے کہ وہ اس کی تسکین کے لئے مکان، لباس اور خوراک جیسی بنیادی ضروریات کو قربان کردینے پر تیار ہوجائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شادی کو ایک ایسی اسلامی حیثیت دی ہے کہ اگر کوئی اس سنت سے رُوگردانی کرے تو گویا وہ مسلمان ہی نہیں ہے، جیسا کہ جنابِ رسولؐ خدا سے روایت ہے:

''اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ''.

''نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنت سے رُوگردانی کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے''۔

جبکہ زندگی کی دُوسری ضروریات کے متعلق ہرگز ایسی تنبیہ شرعِ مقدس کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شادی کی راہ میں موجود تمام مشکل اور ناقابل برداشت شرائط کو راستے سے ہٹا کر اسے اس قدر آسان بنادیا ہے کہ قرآن شریف کی ایک چھوٹی سی سورۃ کی تعلیم کو عقدِ دائم یا عقدِ منقطع کا مہر قرار دے کر شادی کی جاسکتی ہے۔

جن عورتوں کا مہر کم ہو، اُنہیں بہترین خواتین میں شمار کیا گیا ہے۔ شادی کیلئے مرد اور عورت کے درمیان ذہنی اور ایمانی ہم آہنگی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہی چیز ہر قسم کی خوش بختی کی ضامن ہے، اس لئے کہ اگر کوئی عورت بہت ہی خوبصورت ہو اور اس کا مہر بھی بہت ہی زیادہ ہو لیکن وہ بے ایمان یا سست ایمان یا بد اخلاق اور ناسازگار ہو تو ایسی عورت کامیاب گھریلو زندگی اور کنبے کی

تشکیل کے کام نہیں آسکتی۔

اسی طرح خوبصورت اور ثروت مند مرد، جو بظاہر باشخصیت بھی ہو لیکن لااُبالی اور بے ایمان یا سست ایمان ہو اور اپنی پسندیدہ عورت سے شادی کرنے کیلئے لاکھوں روپے مہر مقرر کرے، ہرگز کامیاب اور خوشگوار گھریلو زندگی کا ضامن نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ وہ ایمان اور احساسِ ذمہ داری سے تہی دست ہے۔ اگر کسی موقع پر اس عورت کے ساتھ زندگی نہ گزارنا چاہے تو ممکن ہے کہ اس پر ایسا دباؤ ڈالے اور ایسا رویہ اختیار کرے کہ عورت نہ صرف مہر بخشنے پر بلکہ اپنے مال سے بھی کچھ دے کر اس سے اپنا دامن چھڑانے پر مجبور ہو جائے۔ بہرصورت اگر مناسب اور شرعی بنیاد پر گھریلو اور ازدواجی زندگی کی تعمیر کی جائے تو یہ نہ صرف خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے بلکہ طلاق اور جدائی کے امکانات کو بھی بہت کم کر دیتی ہے۔

نکاح کے احکام

مسئلہ: 498 نکاح کی دو اقسام ہیں: ایک دائمی جس میں وقت معین نہیں ہوتا بلکہ اس کی مدت مرد اور عورت کی زندگی کے آخر تک ہوتی ہے، جو مجہول ہوتی ہے۔ نکاح کی دُوسری قسم نکاحِ منقطع ہے جس کی مدت موت سے پہلے کسی وقت تک معین ہوتی ہے جس کی انتہا موت سے پہلے یا اس کے بعد ہوسکتی ہے۔

مسئلہ: 499 نکاح، عقد اور ازدواج وغیرہ جیسے الفاظ نکاحِ دائمی اور نکاحِ موقت دونوں پر بولے جاتے ہیں۔ لہٰذا آیہ شریفہ: (24:4)

'فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً'

'جن عورتوں سے تم جنسی فائدہ حاصل کرو، ان کی مقررہ اُجرت اُن کو ادا کردو'۔

نکاحِ منقطع کے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ بھی جن آیات اور روایات میں یہ الفاظ پائے جائیں، اُن کا اطلاق نکاحِ دائمی اور منقطع دونوں پر ہوتا ہے، مگر یہ کہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جو انہیں نکاحِ دائمی سے

مخصوص کرتا ہو۔

چونکہ جنسی تسکین، کنبے کی تشکیل اور افزائش نسل، زندگی کی ہمہ گیر ضرورت ہے اور بعض اوقات روٹی، کپڑے اور مکان سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شارعِ مقدس نے اس کیلئے ہر قسم کی سہولت مقرر کر رکھی ہے کہ اگر مرد یا عورت یا دونوں کیلئے نکاحِ دائمی کا امکان نہ ہو تو نکاحِ منقطع اس کی جگہ لے لیتا ہے جس کی ذمہ داریاں بہت کم ہوتی ہیں۔

مسئلہ: 500 شرعِ مقدس اسلام میں شادی بیاہ صرف حلال ہی نہیں بلکہ مستحب بھی ہے۔ بعض اوقات واجب بھی ہو جاتا ہے، اگرچہ بعض اوقات حرام بھی ہے۔ لیکن ایسی شادی جو مباح ہو یعنی اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوں، قابل تصور نہیں ہے۔ اسی طرح ایسی شادی بھی متصور ہے جس کا نہ ہونا اس کے ہونے سے بہتر ہو، جسے اصطلاح میں مکروہ کہا جاتا ہے، جبکہ اس کے مسائل اور سختیاں، اس کے فوائد سے زیادہ ہوں یا بانجھ مرد یا عورت سے شادی کرنا۔ لیکن بنیادی طور پر شادی کرنا مستحب ہے اور بعض مخصوص حالات میں واجب یا حرام ہو جاتا ہے۔

عقدِ نکاح

مسئلہ: 501 عقد نکاح جس زبان میں بھی پڑھا جائے، درست ہے۔ اگر اس کا مخصوص تلفظ ''اَنکَحتُ''، ''میں نے نکاح کیا'' استعمال نہ بھی کیا جائے تو مرد اور عورت کے درمیان زبان، تحریر یا اشارہ سے انجام پانے والا ہر وہ فعل جو نکاح پر واضح دلالت کرتا ہو، کافی ہے۔ صرف طلاق میں اگر ممکن ہو تو لفظ کا ہونا ضروری ہے جس کی تفصیل آئندہ مذکور ہوگی۔ اگر نکاح میں لفظ کا ہونا شرط ہو، تب بھی وہ خاص الفاظ جو معمولاً استعمال ہوتے ہیں، ضروری نہیں ہیں بلکہ جو لفظ بھی نکاح پر دلالت کرتا ہو، کافی ہے۔

پس اگر مرد عورت سے کہے کہ آیا تم میری بیوی بننا قبول کرتی ہو اور عورت اُسے قبول کر لے تو نکاح انجام پا چکا ہے، بشرطیکہ یہ الفاظ یا فعل جو نکاح پر دلالت کرتے ہیں، ازدواجی زندگی کی تشکیل

کی نیت سے ادا کئے گئے ہوں، صرف یہ سوال یا خبر دینے کی حد تک محدود نہ ہوں۔

غرض کہ ہر وہ فعل یا اشارہ جو معاشرہ میں نکاح کے انجام پانے پر دلالت کرتا ہو، کافی ہے۔

صیغہ نکاح، چاہے عربی میں ہو یا کسی اور زبان میں، ضروری نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ واضح اور معلوم ہونا ضروری ہے کہ زنا اور دوستی نہیں بلکہ ازدواجی زندگی کی تشکیل کی نیت سے یہ سب کچھ انجام دیا جارہا ہے، چاہے دائمی ہو یا منقطع۔

اگر صیغہ عقد پڑھا جائے جو بہتر بھی ہے اور اس کی دلالت بھی واضح تر ہے تو ان دو قرآنی تعبیرات ''زَوَّجۡنَاکَهَا'' (37:33)، ''ہم نے تجھے اس کا زوج بنایا'' اور ''اِنِّیۡ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡکِحَکَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ هٰتَیۡنِ ''، (27:28) ''میں چاہتا ہوں کہ تجھے اپنی ان دو میں سے ایک بیٹی کے ساتھ بیاہ دوں'' کی رُو سے عقد نکاح کو جاری کرنے میں ابتداء مرد کی طرف سے ہونی چاہیئے اور ''اَنۡکَحۡتُهَا اِیَّایَ '' کہ ''میں اسے (عورت کو) اپنے نکاح میں لے آیا'' کی بجائے ''اَنۡکَحۡتُ نَفۡسِیۡ اِیَّاهَا''، ''میں خود کو اس (عورت) کے نکاح میں لے آیا'' کہنا زیادہ مناسب ہے اور یہی کافی ہے۔

صیغہ نکاح کو تین یا پانچ مرتبہ یا چہاردہ معصومینؑ کے عدد کے برابر تبرک کی وجہ سے چودہ مرتبہ دُہرانا ان چیزوں میں سے ہے جن سے اسلام کی رُوح سخت بیزار ہے۔ یہ کس قدر مہمل اور بے معنی بات ہے کہ نکاح منعقد ہو جانے کے بعد پھر بھی اسے تکرار کر کے کئی بار نکاح پڑھا جائے۔ اگر یہ تکرار اس لئے ہو کہ شاید پہلی دفعہ پڑھا گیا صیغہ نکاح صحیح نہ ہو تو یہ امکان تو ہر بار موجود ہے۔ یہ تکرارِ نکاح بہر صورت ایک مضحکہ خیز مسخرہ پن ہے جس کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

☆☆☆

صحتِ عقد کی شرائط

مسئلہ: 502 نکاح کے صحیح ہونے کی جو پانچ شرائط عام طور پر بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے صرف ایک شرط دلیل کی رُو سے ثابت ہے اور وہ قصدِ انشاء ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صیغہ نکاح کے الفاظ یا کوئی عمل یا اشارہ جو اس مطلب پر دلالت کرتا ہو، رشتہ زوجیت ایجاد کرنے کی نیت سے انجام پائے۔ علاوہ ازیں مرد اور عورت کا معین ہونا اور ان دونوں کا راضی ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن صیغہ کا عربی میں ہونا اور صیغہ جاری کرنے والے کا بالغ ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے بلکہ صیغہ جاری کرنے والے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ یہ جانتا ہو کہ کیا کہہ رہا ہے اور قصدِ انشاء رکھتا ہو۔

مسئلہ: 503 اگر صیغہ عقد مرد اور عورت کی مرضی کے بغیر جاری ہو اور بعد میں وہ اپنی مرضی کا اظہار کر دیں تو یہ عقد اس مرضی کے ساتھ صحیح ہے۔

مسئلہ: 504 باپ اور دادا یہ حق رکھتے ہیں کہ مصلحت کی صورت میں اپنے نابالغ یا دیوانہ لڑکے یا لڑکی کا کسی کے ساتھ دائمی یا موقت نکاح کر دیں اور اگر بالغ یا عاقل ہونے پر لڑکا یا لڑکی اس نکاح کو قبول کر لیں تو یہ نکاح صحیح ہے ورنہ باطل ہے، اس لئے کہ لڑکے اور لڑکی کا راضی ہونا نکاح کی اصلی شرائط میں سے ہے، باپ اور دادا لڑکا تو در کنار، لڑکی کو بھی نکاح پر مجبور کرنے کی ولایت نہیں رکھتے۔ ان کی ولایت کے معنی یہ ہیں کہ لڑکی کے راضی ہوتے ہوئے اس کی بہتری کو مدِ نظر رکھیں جبکہ لڑکے کی شادی کے متعلق انہیں سرے سے ولایت حاصل ہی نہیں ہے، مگر یہ کہ بلوغ سے پہلے ہو۔ اس کی صحت کیلئے بھی بلوغ کے بعد لڑکے کی مرضی ضروری ہے۔

مسئلہ: 505 باکرہ لڑکی کے نکاح میں باپ یا دادا کی اجازت شرط ہے لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ باپ یا دادا کا اجازت نہ دینا لڑکی کے مفاد کے خلاف ہے تو اس صورت میں ان کی ولایت ساقط

ہوجائے گی اورلڑکی اپنی مصلحت کے پیش نظر، جسے اُس نے صحیح طور پر پہچانا ہے اور اسے اہل حل وعقد اور عادل مجتہد کی تائید حاصل ہو، خود جس سے مناسب سمجھے، شادی کرسکتی ہے۔

مسئلہ: 506 باکرہ عورت کا ولی کی اجازت کے بغیر شادی کرنا ظاہراً حرام ہے مگر باطل نہیں ہے۔اس صورت میں جنسی مباشرت زنا نہیں ہوگی بلکہ حالتِ حیض ونفاس واحرام اور ماہِ مبارکِ رمضان کے روزہ کی حالت میں مباشرت کی مانند حرام ہوگی۔اگرلڑکی کا باپ اس شادی کی اجازت دے دے تو دوبارہ عقد نکاح پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہی پہلے سے انجام شدہ عقد مزید مضبوط اور مستحکم ہوجائے گا۔

مسئلہ: 507 اگر باکرہ لڑکی کو باپ کی عدم موجودگی میں شادی کی ضرورت پیش آجائے اور وہ باپ کی اجازت حاصل کرنے کیلئے اس تک دسترس نہ رکھتی ہو تو اس صورت میں باپ کے عمومی نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

فسخِ نکاح

مسئلہ: 508 اگر مرد دیوانہ ہو یا مباشرت کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو عورت نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتی ہے، چاہے یہ عیب عقد سے پہلے موجود ہوں یا بعد میں پیدا ہوں۔اگر یہ عیب عقد سے پہلے مرد میں موجود ہوں تو عورت طلاق کے بغیر ہی عقد نکاح کو فسخ کرسکتی ہے لیکن اگر عقد کے بعد پیدا ہوں تو اس میں احتیاط ہے کہ طلاق کے ذریعے جدائی عمل میں آئے۔روایات کے بعد اس حکم کی بہترین دلیل یہ ہے کہ ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا ہر عورت کیلئے موجبِ حرج اور نا قابل برداشت ہے اور آیہ نفی حرج کے علاوہ قاعدۂ لاضرر بھی ایسی زندگی کی بقا کی مذمت کرتا ہے۔

مسئلہ: 509 اگر عورت میں ان عیوب میں سے کوئی ایک بھی پایا جائے تو مرد نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے: دیوانگی، جذام، برص، اندھا پن، شل یا اپاہج ہونا، پیشاب اور حیض کے راستے کا ایک ہونا، پیشاب اور پاخانہ کے راستے کا ایک ہونا، شرمگاہ میں زائد گوشت یا ہڈی کا ہونا جو

جماع کرنے سے مانع ہو۔

اگر یہ عیوب نکاح سے قبل موجود ہوں تو مرد نکاح کو فسخ کرنے کا حق رکھتا ہے اور اگر نکاح کے بعد رُونما ہوں تو صرف طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

مسئلہ: 510 یہی نہیں بلکہ ہر وہ عیب جو عقد کی شرائط کے خلاف ہو، دُوسرے فریق کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اگر عورت میں ایسا عیب موجود ہو جس کی وجہ سے مرد کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے تو وہ مقررہ مہر کی مستحق نہیں ہے۔ اگر شوہر اس سے جماع کر چکا ہو تو وہ صرف مہر المثل کی مستحق ہوگی۔

وہ عورتیں جن سے شادی کرنا حرام ہے

مسئلہ: 511 جن عورتوں سے شادی کرنا حرام ہے، اُن کی چند اقسام ہیں:

پہلی قسم اُن عورتوں کی ہے جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں اور یہ ماں بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی ہیں۔

دُوسری قسم اُن عورتوں کی ہے جو رضاعت (شیر خوارگی) کی وجہ سے حرام ہیں جو متعلقہ آیہ کریمہ کی رُو سے صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن ہیں۔

تیسری قسم اُن عورتوں کی ہے جو بعض ازدواجی رشتوں کی وجہ سے حرام ہیں، جو آیہ شریفہ کی روشنی میں یہ ہیں:

1۔ساس، بشرطیکہ بیوی سے جماع کر چکا ہو۔

2۔اس سے مراد موجودہ یا سابقہ بیوی کی وہ بیٹی ہے جو اسکے دوسرے شوہر سے ہو اور آپ نے اُسے اپنی بیٹی کی طرح پالا ہو، اس لئے کہ ربیبہ کے معنی ہیں "پالی ہوئی"۔ اس سے نکاح کی حرمت بھی اسی صورت میں ہے جبکہ اُس کی ماں سے جماع کر چکا ہو لیکن اگر اُس کی ماں سے صرف نکاح کیا ہو اور ابھی تک جماع نہ کیا ہو تو پھر اُس سے نکاح کرنا حرام

نہیں ہے لیکن اگر بیوی کے کسی اور شوہر سے ہونے والی بیٹی پر ربیبہ کا لفظ صادق نہ آتا ہو تو اس سے نکاح حرام نہیں ہے۔

3۔ صلبی بیٹے کی بیوی (نہ کہ رضاعی یا منہ بولے بیٹی کی بیوی)۔

4۔ باپ کی بیوی بلکہ وہ عورت بھی جس سے باپ نے (معاذ اللہ) زنا کیا ہو۔

چوتھی قسم اُن عورتوں کی ہے جو مذکورہ بالا رشتوں سے خارج ہیں، جیسے دو بہنوں سے ایک ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنا۔ وہ زانیہ عورت یا زانی مرد جو توبہ نہ کریں پاک دامن مرد یا عورت پر حرام ہیں۔ جس عورت کو تین بار طلاق دی گئی ہو، تیسری طلاق کے بعد حرام ہو جاتی ہے اور اگر وہ کسی اور مرد سے دائمی نکاح کرلے، وہ اس سے جماع کرے اور پھر اُسے طلاق دے دے تو وہ پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔

یہ سارا سلسلہ اگر مزید دو بارہ دُہرایا جائے تو نویں طلاق کے بعد عورت ہمیشہ کیلئے مرد پر حرام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہ عورت جس پر اس کے شوہر نے زنا کی تہمت لگائی ہو اور اُس نے شرعی ترتیب کے مطابق ملاعنہ کے ذریعے اپنی بے گناہی ثابت کردی ہو، ہمیشہ کیلئے اپنے شوہر پر حرام ہو جاتی ہے اور اگر جماع کی وجہ سے کسی عورت کے پیشاب اور حیض کا راستہ ایک ہو جائے تو وہ بھی ہمیشہ کیلئے اپنے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔

مسئلہ: 512 وہ تمام عورتیں جن سے نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہے، اُن کی حرمت فقط نکاح یا مباشرت کی حد تک نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جو مرد کو مرد ہونے کی حیثیت سے عورت سے عورت ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے، حرام ہے۔ بنا بریں ان سے بوس و کنار اور شہوت کی نظر اور شہوانی گفتگو سب حرام ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر تولیدِ نسل، اگرچہ مباشرت کے بغیر، جدید طبی طریقوں سے نطفہ رحم میں داخل کرنے سے ہو، یہ بھی اس حرمتِ مطلقہ سے معلوم ہوتی ہے۔

مسئلہ: 513 ماں سے مراد صرف براہِ راست اور بلا واسطہ ماں ہی نہیں بلکہ نانی، ماں کی نانی

اور دادی، جتنا اُوپر چلے جائیں، اسی طرح دادی، باپ کی دادی اور نانی، جتنا اُوپر چلے جائیں، سب ماں کے زمرہ میں آتی ہیں، اسی طرح بیٹی میں بھی نواسی، پوتی اور ان کی بیٹیاں، نواسیاں اور پوتیاں، جہاں تک چلے جائیں، یہ سب بیٹی کے زمرہ میں آتی ہیں۔

اسی طرح پھوپھی سے مراد باپ کی بہن کے علاوہ دادا کی بہن، نانا کی بہن اور ان کے باپ دادا اور نانا کی بہنیں بھی ہیں۔ یہی حال خالہ کا ہے جو ماں کی بہن، نانی کی بہن اور دادی کی بہن کو بھی شامل ہے، جہاں تک چلے جائیں، یہ سب بھی اسی طرح حرام ہیں، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔

حرمتِ رضاعی

مسئلہ: 514 اس مسئلہ سے متعلق آیت کی رُو سے صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح حرام ہے۔ کیا ان دو کو آیت میں صرف نمونے کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح یہ دو رضاعی رشتے حرام ہیں، اسی طرح دُوسرے پانچ رضاعی رشتوں کا بھی یہی حکم ہے؟

ہرگز نہیں! اس لئے کہ جب حقیقی ماں اور بہن دُوسرے پانچ حقیقی رشتوں کی حرمت کیلئے نمونہ نہیں بن سکتیں تو رضاعی ماں اور بہن، جن کی حرمت نسبی رشتوں سے ملحق ہونے کی بناء پر ہے، کیونکر دُوسرے رضاعی رشتوں کی حرمت کا نمونہ بن سکتی ہیں۔ پس چونکہ قرآن شریف نے صرف ان دو رضاعی رشتوں کو حقیقی ماں اور بہن کے ساتھ ملحق کیا ہے، لہٰذا باقی پانچ رضاعی رشتوں، بیٹی، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی کی حرمت بلا وجہ ہے اور کوئی دلیل نہیں رکھتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ قرآن شریف مسائل کو اختصار کے ساتھ بیان فرماتا ہے اور ان کی تفصیل روایات میں بیان ہوتی ہے، لہٰذا قرآن شریف میں اسی طریق کار کے مطابق رضاعی ماں اور بہن کی حرمت کو بیان کر دیا گیا ہے اور باقی پانچ رضاعی رشتوں کی حرمت روایات میں بیان ہوئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مختصر گوئی کے پیشِ نظر ایسا کیا گیا ہے تو بیٹی جو نزدیکی رشتہ ہے،

اسے ترک کر کے بہن کا ذکر کیوں کیا گیا جو بیٹی کی نسبت دُور کا رشتہ ہے؟ علاوہ بریں اس مختصر جملہ کی بجائے، جو سب رشتوں کو شامل نہیں ہے، ایسا مختصر جملہ کیوں استعمال نہ کیا گیا، جو سب کو شامل ہونے کے علاوہ اس جملہ سے بھی زیادہ مختصر ہو جیسے ''هُنَّ مِنَ الرِّضَاعَةِ ''جس کے معنی یہ ہیں کہ ''جو عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں، رضاعت کے سبب سے بھی ایسی سب عورتیں حرام ہیں''۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ رضاعی رشتوں میں صرف ماں اور بہن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ دُوسرے رضاعی رشتوں کی حرمت پر اس مشہور حدیث سے استدلال کرنا ہرگز درست نہیں ہے:

''يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَايَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ''.

''جو عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں، وہی رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں''۔

اس لئے کہ اس آیت کی نص سے اس روایت کی تقیید کے بعد اس سے وہی معنی مراد ہوں گے جو آیہ شریفہ میں ہیں۔

نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ مسئلہ اُن مسائل میں سے ہے جن میں شیعہ اور سنی دونوں کے فقہاء نے آیت کی نص کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور اس مسئلہ میں ان دو کے علاوہ صرف پانچ رشتوں کا اضافہ کر کے سات تک نہیں بلکہ پانچ سببی محرمات کو بھی اس میں داخل کر کے محرماتِ رضاعیہ کی تعداد کو بارہ کر دیا ہے، حالانکہ قرآن شریف میں صرف دو کی حرمت پائی جاتی ہے۔

اگر مذکورہ حدیث کے اطلاق پر عمل کیا جائے تو بھی صرف وہی رضاعی عورتیں حرام ہیں جو نسب کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں یعنی بیٹی، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی جبکہ فتویٰ دینے والوں نے رضاعی بیٹے کی بیوی کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔

اس آیہ شریفہ کی نص کی رُو سے صرف وہ رضاعی ماں حرام ہے جس نے دُودھ پلایا ہے، رضاعی ماں کی ماں، نانی اور دادی وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

رضاعی بہن جس کی تین صورتیں ہیں، تینوں میں حرام ہے۔ لڑکا اور لڑکی دونوں نے اپنی ماؤں کی بجائے کسی اور عورت کا دُودھ پیا ہو۔ وہ لڑکی جسے لڑکے کی ماں نے دُودھ پلایا ہو، وہ لڑکی جس کی ماں کا دُودھ لڑکے نے پیا ہو۔

بنابرایں ''اُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیۡ اَرۡضَعۡنَکُمۡ'' میں صرف دُودھ پلانے والی عورت داخل ہے جبکہ ''اَخَوَاتُکُمۡ مِنَ الرِّضَاعَةِ'' میں رضاعی بہن کی تینوں مذکرہ صورتیں داخل ہیں۔

مسئلہ: 515 بیوی چاہے دائمی ہو یا منقطع، زندہ ہو یا مرچکی ہو یا طلاق لے چکی ہو، اُس کی ماں، اس کی نانی اور دادی، جتنا اُوپر چلے جائیں، اس کے شوہر پر حرام ہیں۔

مسئلہ: 516 بیوی کی بیٹی صرف اُس صورت میں حرام ہے جب بیوی سے جماع کیا گیا ہو لیکن جب تک بیوی سے جماع نہ کیا گیا ہو، اُس وقت تک اس کی بیٹی نہ تو محرم ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے نکاح کرنا حرام ہوتا ہے اور بیوی کو جماع سے قبل طلاق دے کر اُس کی بیٹی سے نکاح کیا جاسکتا ہے بلکہ اُسے طلاق دینے سے پہلے بھی اُس کی بیٹی سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں اُس کی ماں، ساس ہونے کی وجہ سے طلاق لئے بغیر جدا ہو جائے گی، اس لئے کہ آیہ شریفہ اس مسئلہ کو یوں بیان کرتی ہے:

''وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ''. (23:4)

''اور تمہاری ربیبہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہیں، تمہاری اُن بیویوں سے جن کے ساتھ تم مباشرت کر چکے ہو (تم پر حرام ہیں) پس اگر تم نے ان سے مباشرت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے''۔

پس اس آیت کی رُو سے بیوی کی بیٹی (ربیبہ) سے نکاح کرنے کیلئے اُس کی ماں کو طلاق

دینا شرط نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ اس صورت میں ماں اور بیٹی دونوں ایک ہی شخص کی زوجیت میں جمع ہوجائیں گی اور یہ حرام ہے، یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ یہ جمع حرام نہیں ہے بلکہ بیوی کی ماں سے نکاح کرنا حرام ہے۔

اس صورت میں جب انسان بیوی کی بیٹی سے نکاح کرلے تو اُس کی بیوی اُس کی ساس بن کر اُس پر حرام ہوجائے گی اور طلاق کے بغیر ہی اپنے شوہر سے جدا ہوجائے گی اور سوائے عدت کے اُس پر طلاق کے احکام بھی جاری نہیں ہوں گے اور اگر یائسہ ہو تو عدت کا حکم بھی اُس پر جاری نہیں ہوگا۔

چونکہ آیت کی رُو سے بیوی کی بیٹی کی قید لگائی گئی ہے، لہٰذا اگر کسی عورت سے (معاذ اللہ) زنا کیا جائے تو اُس کی بیٹی زنا کرنے والے پر حرام نہیں ہوتی اور وطی شبہ میں بھی یہی حکم ہے۔ صرف شرعی بیوی کی بیٹی سے نکاح حرام ہے، اگر بیوی سے جماع کرلیا ہو۔

مسئلہ: 517 آیہ کریمہ:

"وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ"(23:4)

"اور تمہارے صلبی بیٹوں کی حلال عورتیں (تم پر حرام ہیں)"۔

کی رُو سے منہ بولے بیٹے کی بیوی کی طرح رضاعی بیٹے کی بیوی بھی حرام نہیں ہے۔ بنیادی طور پر رضاعی بیٹا حرام موضوعات میں سے نہیں ہے کہ یہ حرمت اُس کی بیوی تک سرایت کرجائے اور آپ کی بیوی کا دُودھ پینے والا لڑکا صرف آپ کی بیوی اور بیٹی پر حرام ہے، جس طرح دُوسری ہمشیر لڑکیوں پر حرام ہے۔ یہ لڑکا آپ پر حرام نہیں ہے کہ اس کی بیوی بھی اس حرمت کی وجہ سے حرام ہو۔

یہ بالکل بے معنی سے بات ہے کہ جس لڑکے نے آپ کی بیوی کا دُودھ پیا ہے، وہ آپ کی بیوی کا رضاعی بیٹا اور آپ کی بیٹیوں کا رضاعی بھائی ہونے کے علاوہ آپ کا رضاعی بیٹا بھی ہو، اس لئے رضاعت کی وجہ سے رُونما ہونے والی حرمت کا تعلق صرف نکاح سے ہے، نہ یہ کہ شیر خوار بھی آپ

کے ساتھ اصلی رشتہ داروں کی طرح ہر لحاظ سے رشتہ داری رکھتا ہو۔ لہٰذا جس لڑکے نے آپ کی بیوی کا دُودھ پیا ہے، اُس کی بیوی آپ پر کیوں حرام ہو؟ کیا چونکہ یہ لڑکا آپ پر حرام ہے؟ جبکہ سبھی لڑکے ایسے ہیں۔

کسی مرد کے کسی لڑکے سے نکاح کرنے کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگر بالفرض رضاعی بیٹے کی حرمت کوئی معنی رکھتی بھی ہو تو اس کی بیوی کی حرمت پھر بھی اس مشہور حدیث کے عموم سے خارج ہے، اس لئے کہ اس حدیث نے رضاعت کو نسب کے ساتھ ملحق کیا ہے، سبب کو نہیں۔

مسئلہ: 518 باپ کی بیوی، صرف بیوی ہی نہیں بلکہ ہر وہ عورت جس سے باپ نے ہم بستری کی ہو، چاہے از راہِ حلال ہو یا شبہ کی وجہ سے ہو یا از راہِ حرام، اس لئے کہ آیہ شریفہ میں ''**ماںکح آبائکم** ''، ''جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا'' اور نکاح کے زمرہ میں عقد نکاح اور جماع دونوں آجاتے ہیں۔

روایات میں آیہ کریمہ کے مطابق یہی معنی لئے گئے ہیں کہ نکاح چاہے لفظی ہو یا عملی، حلال ہو یا حرام، باپ نے جس عورت کے ساتھ بھی کیا ہو، وہ عورت حرام ہے۔

''**آبائکم**'' میں باپ، دادا، نانا اور ان کے باپ دادا اور نانا، جہاں تک یہ سلسلہ چلا جائے، سب داخل ہیں۔ البتہ باپ کی دوسری بیوی کی ماں یا بیٹی حرام نہیں ہیں۔ اس کی بیٹی باپ پر بھی صرف اُس صورت میں حرام ہوگی، جب باپ اس سے جماع کر چکا ہو۔ لیکن باپ کی دوسری بیوی کی ماں یا بیٹی کے اس کے بیٹے پر حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسئلہ: 519 دو نسبی بہنوں کو زوجیت میں جمع کرنا حرام ہے، جس کی اصلی صورت یہ ہے کہ دونوں بہنوں سے ایک ساتھ یا یکے بعد از دیگرے نکاح کیا جائے، چاہے نکاح دائمی ہو یا موقت جبکہ فرعی صورت یہ ہے کہ جو عورت عدہ رجعیہ میں ہو، اُس کی بہن سے نکاح کیا جائے، اس لئے کہ رجعی عورت کی طرف نکاح کے بغیر رجوع کیا جا سکتا ہے۔ پس وہ بیوی کی مانند ہے اور اس کی عدت تمام

ہونے سے قبل اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔

مسئلہ: 520 جو عورت عدۂ بائن میں ہو، چاہے طلاقِ بائن کی تین اقسام میں سے کسی ایک طلاق کی عدت میں ہو یا نکاح منقطع سے خارج ہونے کی وجہ سے عدۂ بائن میں ہو کہ ان تمام صورتوں میں عدت کے دوران شوہر ہرگز بیوی کی طرف رجوع نہیں کرسکتا مگر یہ کہ دوبارہ عقد کیا جائے۔اس قسم کی عدت میں اگر عورت کی بہن سے نکاح کرلیا جائے تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے اور یہ نکاح صحیح ہے، اس لئے کہ اس صورت میں دونوں بہنیں اُس شخص کی زوجیت میں جمع نہیں ہیں، نہ اصل صورت میں اور نہ فرعی صورت میں۔لیکن طلاق، خلع اور مبارات کی عدت کے دوران اگر عورت نے جو کچھ شوہر کو دیا ہے، واپس لے لے تو شوہر کو بھی رجوع کا حق حاصل ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اس طرح یہ طلاق رجعی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔لیکن اگر عورت کی طرف سے اس اقدام سے پہلے اُس کا شوہر اُس کی بہن سے نکاح کرلے تو یہ اس کا حق ہے لیکن اس کے بعد وہ پہلی بیوی کی طرف کسی بھی طور پر رجوع نہیں کرسکتا۔

بنابرایں جس عورت سے عقد منقطع کیا گیا ہو، اُس کے نکاح سے خارج ہونے کے بعد اس کی عدت کے دوران اس کی بہن سے نکاح کرنے پر آیہ شریفہ کی نص اور روایاتِ معتبرہ کی رُو سے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ایک بے سروپا روایت جو اسے حرام قرار دیتی ہے، اس قرآنی نص اور روایاتِ معتبرہ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔

بہرصورت صرف دو نسبی بہنوں کو اصلی یا فرعی صورت میں اپنی زوجیت میں جمع کرنا حرام ہے، اس لئے کہ دو رضاعی بہنوں کے درمیان کوئی شرعی نسبت نہیں پائی جاتی، لہٰذا وہ اس مقام پر دو بہنیں شمار نہیں ہوں گی اور نہ ہی یہ دو بہنیں ایک دُوسرے پر حرام ہیں کہ رضاعی حرمت کی موجب ہوں اور ان کا رضاعی یا غیر رضاعی بھائی پر حرام ہونا صرف ازدواج اور نکاح سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ ان کے آپس کے تعلقات سے اور نہ ہی ان کے درمیان ایسی کوئی حرمت معنی رکھتی ہے بلکہ رضاعی حرمت

سے مراد رضاعی ماں یا رضاعی بہن سے نکاح کی حرمت ہے۔

مسئلہ: 521 ''اَلزَّانِیُ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ''. (4:24)

''زانی مرد زانیہ یا مشرکہ عورت کے ساتھ ہی نکاح کرسکتا ہے اور زانیہ عورت کے ساتھ بھی صرف زانی یا مشرک مرد نکاح کرسکتا ہے اور یہ مؤمنین پر حرام ہے''۔

اس آیہ مبارکہ کی نص کی رُو سے جس طرح مشرکہ عورت پاک دامن مؤمن پر حرام ہے، اسی طرح زانیہ عورت بھی اس پر حرام ہے اور جس طرح مشرک مرد پاک دامن مؤمنہ عورت پر حرام ہے، اسی طرح زنا کار مرد بھی اس پر حرام ہے۔ اس کے برعکس مسلمان زانیہ عورت جس طرح مسلمان زانی مرد کیلئے حلال ہے، اسی طرح مشرک مرد کیلئے بھی حلال ہے اور جس طرح مسلمان زنا کار مرد زانیہ مسلمان عورت کیلئے حلال ہے، اسی طرح مشرکہ عورت کیلئے بھی حلال ہے۔

لیکن سورۂ مبارکہ بقرہ میں مشرک مرد سے نکاح کو تمام مسلمان عورتوں پر اور مشرکہ عورت سے نکاح کو تمام مسلمان مردوں پر حرام کردیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے آیۂ نور کا ایک پہلو سورۂ بقرہ کی آیت سے منسوخ ہوگیا ہے لیکن باقی حکم اسی طرح ثابت اور برقرار ہے کہ زانیہ عورت پاک دامن مؤمن پر اور زانی مرد پاک دامن عورت پر حرام ہے۔ لیکن اگر یہ زانی مرد یا زانیہ عورت اس عمل سے دستبردار ہوکر توبہ کرلیں تو اس صورت میں ان سے نکاح کرنا جائز ہے، اس لئے کہ اب وہ زانی اور زانیہ کے زمرہ سے خارج ہوچکے ہیں۔

مسئلہ: 522 جو مرد کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو، اُسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ عورت شوہر دار نہیں ہے اور نہ ہی عدت میں ہے۔ اس لحاظ سے زانیہ عورت کی بات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ جو عورت زنا کرسکتی ہے، وہ جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔

اگر اس بات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو آیۂ نور کی رُو سے پاک دامن اور ناپاک کے درمیان ازدواج حرام ہے، اگر چہ یہ یقین حاصل کر لیا جائے کہ وہ شوہر دار نہیں ہے اور عدت میں بھی نہیں ہے۔ سورۂ نور کی آیت نہ صرف یہ کہ منسوخ نہیں ہوئی ہے بلکہ سورۂ مائدہ، جو آخری سورۃ ہے، اس میں اس کی تاکید کرنے کے علاوہ ایک اور پہلو کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے:

''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ''.(5:5)

کہ پاک دامن مؤمنہ عورتوں اور اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتوں کو ہی حلال قرار دیا گیا ہے۔ پس اگر کسی عورت کے زانیہ ہونے کا علم ہو تو سورۂ نور کی آیہ شریفہ کی رُو سے اس کی حرمت کا حکم معلوم ہے۔ اگر اس کا زانیہ یا پاک دامن ہونا معلوم نہ ہو تو اس صورت میں اس سے نکاح کرنا بظاہر صحیح ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ کی رُو سے صرف ''المحصنٰت''، یعنی پاک دامن عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے اور ان سے مراد وہ عورت ہے جس کی ناپاک دامنی ثابت نہ ہو۔

البتہ احتیاطِ مستحب یہ ہے کہ ایسی عورت سے نکاح نہ کیا جائے جس کے پاک دامن یا زانیہ ہونے کا علم نہ ہو۔ یہ جنسی انحراف میں مبتلا مرد یا عورت کی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے کہ جب تک وہ توبہ کر کے اس گندے عمل سے دستبردار نہ ہو جائیں، اپنی گندگی میں رہیں اور پاک دامن مؤمنین میں شامل ہونے کا حق نہیں رکھتے۔

مسئلہ: 523 زانی مرد یا عورت کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنا اور برقرار رکھنا دونوں حرام ہیں۔ پس اگر کوئی شوہر دار عورت زنا کی مرتکب ہو کر اپنی عفت کے دامن کو آلودہ کرلے تو یا بغیر طلاق کے اپنے سے شوہر سے جدا ہو جائے گی یا اُسے طلاق دے دینی چاہئے مگر یہ کہ اپنے کئے پر صحیح معنوں میں نادم اور پشیمان ہو جائے۔

اس بات کی روشن اور واضح دلیل لعان ہے کہ اس ذریعہ سے یا تو شوہر بیوی کے جرم کو ثابت

کردے گا تاکہ اُسے اس کے عمل کے سزا مل سکے اور یا عورت بغیر طلاق کے اس سے جدا ہو جائے گی، اس لئے کہ ایسی ازدواجی زندگی قابلِ برداشت نہیں ہے۔

مسئلہ: 524 اگر کسی زانیہ عورت سے نکاح کر کے اُسے زنا سے باز رکھنا ممکن ہو تو اس صورت میں اُس سے نکاح کرنا نہ صرف یہ کہ حرام نہیں بلکہ بعض اوقات نہی از منکر کی رُو سے واجب بھی ہو جاتا ہے اور اُس سے نکاح کی حرمت بھی دراصل نہی از منکر ہی کی ایک صورت تھی۔ پس اگر اُس سے نکاح کر کے اُسے اس منکر سے باز رکھا جاسکے تو اس صورت میں نہ صرف حرام نہیں بلکہ واجب بھی ہے۔

رضاعت کی شرائط

مسئلہ: 525 آیہ شریفہ کی رُو سے رضاعت میں یہ شرط ہے کہ دُودھ پلانے والی کو ماں اور دُودھ پینے والی کو بہن کہا جاسکتا ہو۔ زیادہ تر اور صحیح تر روایات کی رُو سے رضاعت سے مراد اس طرح دُودھ پینا ہے جس سے گوشت پیدا ہو اور ہڈیاں مضبوط ہوں، جس کیلئے پندرہ مرتبہ مکمل طور پر دُودھ پینے کو بھی معیار مقرر کیا گیا ہے۔ اگر اس تعداد سے گوشت نہ اُگے اور ہڈیاں مضبوط نہ ہوں تو کافی نہیں ہے اور اگر پندرہ سے کم تعداد میں ایسا ہو جائے تو ظاہراً کافی ہے لیکن اس میں احتیاط ہے کہ پندرہ مرتبہ مکمل طور پر دُودھ پینے سے کمتر نہ ہو۔

مسئلہ: 526 رضاعت میں یہ بھی شرط ہے کہ بچہ ہر مرتبہ سیر ہو کر دُودھ پیئے یعنی اگر ایک بار سیر نہ ہو تو دو یا تین بار سیر ہو کر دُودھ پیئے۔ بہرحال رضاعت میں معیار یہ ہے کہ دُودھ سے گوشت اُگے اور ہڈیاں مضبوط ہوں، چاہے جیسے بھی ہو۔

مسئلہ: 527 "اَرْضَعْنَكُمْ" اور "مِنَ الرِّضَاعَةِ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ دُودھ پستان سے پلایا گیا ہو، کسی اور ذریعے سے نہیں جو "اَرْضَعْنَكُمْ" کا مصداق نہ ہو، اس لئے کہ کوئی اور دُودھ پلانے اور اپنا دُودھ دوہ کر پلانے میں کیا فرق ہے؟

مسئلہ: 528 تاکیدی احتیاط یہ ہے کہ پندرہ مرتبہ دُودھ پلانے میں کسی اور عورت کے دُودھ

پلانے سے فاصلہ نہ آئے۔ لیکن اگر فاصلہ کم ہو تو ظاہراً اس صورت میں بھی رضاعت موجبِ حرمت ہے۔ پس اگر کوئی عورت ایک دن رات، جو رضاعت کا ایک شرعی معیار ہے، سے زیادہ کسی بچے کو دُودھ پلائے اور تھوڑے فاصلے سے اُسے کوئی اور دُودھ یا غذا دی جائے تو اگر دُودھ پلانے والی عورت کو رضاعی ماں کہا جا سکتا ہو تو یہی کافی ہے کہ آیہ شریفہ کی رُو سے رضاعت کا شرعی حکم اس پر جاری ہو، اس لئے کہ اصل یہ ہے کہ اس کے دُودھ سے گوشت پیدا ہو اور ہڈیاں مضبوط ہوں، چاہے مسلسل دُودھ پلایا جائے یا جس طرح بھی یہ بچہ اس عورت کا رضاعی بچہ شمار ہو۔

مسئلہ: 529 جب بچے کو دُودھ پلایا جائے تو ظاہراً بچے کو شیر خوارگی کی عمر میں ہونا چاہئے اور عورت کے دُودھ پلانے کی مدت بھی دو سال سے تجاوز نہ کر چکی ہو، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مشہور حدیث کی رُو سے ''لَا رِضَاعَ بَعْدَ فِطَامٍ'' یعنی ''شیر خوارگی تمام ہونے کے بعد رضاعت نہیں ہے''۔ یہاں ''لا رضاع'' نے شیر خوارگی کی مدت کے تمام ہو جانے کے بعد کی شیر خوارگی کو غیر مؤثر قرار دیا ہے، اس لئے کہ فطام شیر خوارگی کی انتہا ہے جو اس آیہ شریفہ کی رُو سے دو سال ہے:

''وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ''. (233:2)

''مائیں اپنی اولاد کو دو مکمل سال دُودھ پلائیں''۔

جب اصلی اولاد دو سال کے بعد شیر خوار نہیں ہے تو فرعی اولاد کیسے دو سال کے بعد شیر خوار کا حکم رکھ سکتی ہے!

مسئلہ: 530 کیا رضاعت میں یہ شرط ہے کہ دُودھ پلانے والی عورت کا دُودھ ایک ہی شوہر سے ہو؟ کوئی صحیح دلیل اس شرط کی تائید نہیں کرتی۔

علاوہ ازیں ''اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ'' (23:4) کی رُو سے اس حکم کا موضوع باپ

نہیں بلکہ صرف ماں ہے، لہٰذا کسی عورت کا رضاعی ماں کہلانا ہی اس حکم کے جاری ہونے کیلئے کافی ہے، چاہے اُس عورت کا شوہر اس بچے کا رضاعی باپ ہو یا نہ ہو، کہ نہ تو شوہر کی رضاعی بیٹی اس پر حرام ہے اور نہ ہی رضاعی بیٹے کا حرام ہونا کوئی معنی رکھتا ہے بلکہ صرف دُودھ پلانے والی ماں کا دُودھ پلانا ہی اس حرمت کا موجب ہے کہ یہ شیر خوار بچہ دُودھ پلانے والی عورت اور اس کا دُودھ پینے والی لڑکیوں پر حرام ہو جاتا ہے۔ اگر بچی ہو تو اس عورت کا دُودھ پینے والے لڑکوں پر حرام ہو جاتی ہے اور ''اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیۡۤ اَرۡضَعۡنَكُم وَ اَخوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ''(23:4) کا سبب عورت کا دُودھ پلانا ہے۔

پس اگر کوئی عورت دُودھ پلانے کی دو سال کی مدت میں کسی بچے کو دُودھ پلائے تو وہ اس پر اور اپنی رضاعی بہنوں پر حرام ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بچی کو دُودھ پلائے تو وہ بھی اپنے رضاعی بھائیوں پر حرام ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی تفصیلات عام طور پر بیان کی جاتی ہیں، وہ اس قرآنی دلیل کے محور سے خارج ہیں اور کوئی اور دلیل بھی نہیں رکھتی ہیں۔ اگر ان پر کوئی اور دلیل موجود ہو تو بھی اس آیت کی نص کے مقابل اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

چند مزید عورتیں جن سے نکاح حرام ہے

مسئلہ: 531 مشرک (بت پرست) عورتیں مسلمان مردوں پر حرام ہیں اور اسی طرح بت پرست اور اہل کتاب مرد، دونوں مسلمان عورتوں پر حرام ہیں۔ لیکن اہل کتاب عورت مسلمان مرد پر حرام نہیں ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ:

''وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ''.(5:5)

کی رُو سے جس طرح پاک دامن مسلمان عورتیں پاک دامن مسلمان مردوں پر حلال ہیں، اسی طرح اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی ان پر حلال ہیں، بشرطیکہ ان کی گمراہی کا سبب نہ بنیں اور نہ ہی ان

کے بچوں کو گمراہ کریں۔ مسلمان مرد مسلمان بیوی کے ہوتے ہوئے اُس کی اجازت سے ہی اہل کتاب عورت کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے۔ اگر اُس کی اجازت کے بغیر ایسا کرے تو وہ اس سے جدا ہوجانے کا حق رکھتی ہے۔ اگر کتابی عورت کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان عورت سے نکاح کرے اور اُسے اطلاع نہ دے تو اگر اُسے اطلاع ہوجائے اور وہ راضی نہ ہو تو اُس سے جدا ہوسکتی ہے۔

مسئلہ: 532 اگر مسلمان عورت بت پرست ہوجائے تو وہ اپنے شوہر پر حرام ہوجاتی ہے اور طلاق کے بغیر اُس سے جدا ہوجائے گی۔ لیکن اگر یہودی یا عیسائی ہوجائے تو اس کا حکم وہی ہے جو گزشتہ مسئلہ میں بیان ہوچکا ہے۔

مسئلہ: 533 اگر مسلمان عورت کا شوہر اسلام سے خارج ہوجائے، چاہے بت پرست ہوجائے یا یہودی یا عیسائی ہوجائے تو اُس کی مسلمان بیوی طلاق کے بغیر اُس سے جدا ہوجائے گی۔ اگر وہ مباشرت کرچکے ہوں تو عدتِ وفات جو چار ماہ اور دس راتیں ہیں، گزار کر کسی اور سے شادی کرنے میں آزاد ہے۔

مسئلہ: 534 بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح صرف اُس صورت میں جائز ہے جب بیوی اس کی اجازت دے دے۔

مسئلہ: 535 اگر کوئی شخص ایسی عورت سے زنا کرے جو طلاقِ رجعی کی عدت میں ہو تو یہ عورت اُس پر ہمیشہ کیلئے حرام ہوجائے گی، چاہے وہ اس کے عدت میں ہونے اور عدت میں زنا کے حکم کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ لیکن اگر ایسی عورت سے زنا کرے جو عدتِ بائن میں ہو، چاہے طلاقِ بائن سے ہو یا عقد منقطع سے، اگر اُس عورت سے زنا کرے تو اس سے عدت میں زنا کی وجہ سے نکاح حرام نہیں ہوتا بلکہ صرف زانی ہونے کی وجہ سے اس سے نکاح حرام ہوجائے گا۔ لیکن اگر توبہ کرلے یا نکاح کرنا اس کی توبہ کا سبب بن سکے تو اس سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔ اگر دونوں زنا کار ہوں اور دونوں توبہ نہ کریں تو اس صورت میں بھی ان دونوں کا نکاح کرنا حرام نہیں ہے، جیسا کہ سورۂ نور آیت 4 سے یہ حکم

ثابت ہوتا ہے۔

مسئلہ: 536 اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت سے نکاح کرلے جو کسی اور کی عدت میں ہو، چاہے عدت رجعی ہو یا غیر رجعی، اگر مرد اور عورت میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو عورت کے عدت میں ہونے اور عدت میں نکاح کے حرام ہونے کا علم ہو تو ہر صورت میں یہ عورت ہمیشہ کیلئے اس مرد پر حرام ہو جائے گی۔

مسئلہ: 537 اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرلے اور بعد میں معلوم ہو کہ نکاح کے وقت عورت عدت میں تھی تو اگر ان میں سے کسی کو بھی نکاح کے وقت عورت کے عدت میں ہونے اور عورت سے نکاح کی حرمت کا علم نہ ہو اور انہوں نے ابھی تک جماع بھی نہ کیا ہو تو عدت کے بعد اس سے نکاح کر سکتا ہے۔لیکن اگر اس سے جماع کر چکا ہو تو وہ عورت ہمیشہ کیلئے اُس پر حرام ہو جائے گی۔

مسئلہ: 538 کسی عورت کے شوہر دار ہونے کا علم ہونے کے باوجود اگر اُس سے نکاح کیا جائے تو وہ ہمیشہ کیلئے نکاح کرنے والے پر حرام ہو جاتی ہے، چاہے اُس سے جماع کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

مسئلہ: 539 اگر کسی لڑکے کے ساتھ لواط کیا جائے تو اُس کی ماں بہن اور بیٹی کے لواط کرنے والے پر حرام ہو جانے پر کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، خصوصاً جبکہ قرآن شریف میں بھی اس بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔

مسئلہ:540 اگر کوئی شخص یہ جاننے کے باوجود کہ حالتِ احرام میں نکاح کرنا حرام ہے، کسی عورت سے نکاح کرلے تو وہ عورت ہمیشہ کیلئے اُس پر حرام ہو جائے گی۔لیکن اگر اس حرمت کو نہ جانتا ہو تو اس کا عقد باطل ہے اور احرام کے بعد اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

مسئلہ: 541 وہ مرد یا عورت جس نے طوافِ نساء یا کوئی اور واجب طواف انجام نہ دیا ہو، طواف انجام دینے سے قبل ہر مرد یا عورت اُس پر حرام ہے، چاہے ان کا اپنا مرد یا عورت ہو یا اس

دوران کسی مرد یا عورت سے نکاح کیا ہو۔

مسئلہ: 542 اگر کسی نابالغ لڑکی سے نکاح کر کے اُس سے جماع کرے اور اُس کا پیشاب اور حیض کا راستہ ایک ہو جائے تو اس لڑکی کے ساتھ جماع کرنا ہمیشہ کیلئے حرام ہو جاتا ہے اور اس قید سے نجات دینے کیلئے اُسے طلاق دے دینی چاہئے۔

زن وشوہر کے ہم آہنگ حقوق

مسئلہ: 543 ان حقوق کے متعلق سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیت 228 اس طرح ہے:

"وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ".

"عورتوں کیلئے ایسے ہی حقوق ہیں جیسے حقوق ان کے ذمے ہیں معروف کے مطابق، اور مردوں کو ان پر ایک درجہ برتری حاصل ہے"۔

یہ آیۂ کریمہ عدۂ رجعی کے دوران مرد اور عورت کے حقوق کی ہم آہنگی کو بیان کر رہی ہے اور طلاق سے پہلے تو یہ ہم آہنگی بدرجہ اولیٰ موجود ہوگی۔

یہ درجہ جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے، ظاہراً جسمانی مردانہ قوت کا درجہ ہے۔ جس قدر وہ قوت میں عورتوں پر برتری رکھتے ہیں، اُتنا ہی اُن کے کاندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ سنگین تر ہوتا ہے۔ جیسا کہ دُوسری آیت میں ہے:

"اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ". (34:4)

"مرد عورتوں کے محافظ ہیں"، تاکہ اُن کی زندگی کے قوام اور پائیداری کی کوشش کرتے رہیں۔"

اس اصول کی رُو سے مرد اور عورت کے ازدواجی تعلقات عدالت اور حکمت کے پیش نظر ایک دُوسرے کے برابر ہیں اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ چونکہ مرد زیادہ طاقت ور ہیں، لہٰذا زیادتی اور بے انصافی سے کام لے سکتے ہیں بلکہ ایسی زیادہ طاقت کی وجہ سے ان کی ذمہ داریاں بھی عورتوں کی ذمہ

داری سے زیادہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث، جس کی سند صحیح اور متن غلط ہے، جسے آپؐ نے اُس عورت کے جواب میں فرمایا جس نے کہا کہ پس مجھے کوئی ایسا حق حاصل نہیں جو اُسے مجھ پر ہے تو آپؐ نے فرمایا: ''نہیں نہیں۔ اگر اُسے تجھ پر سو حقوق حاصل ہوں تو تجھے اُس پر ایک بھی حاصل نہیں ہے''۔ (الفقیہ 672:3، مجمع البیان :1: 327، فروع کافی :6:3)۔

یہ روایت اور اس جیسی دُوسری روایات اس آیت کے خلاف ہیں جو مرد اور عورت کے حقوق کو ہم آہنگ قرار دے رہی ہے جبکہ مرد کو عورت پر جو فوقیت حاصل ہے، وہ اس جسمانی اور اقتصادی قوت کا درجہ ہے جو مرد کی ذمہ داریوں میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔

مسئلہ: 544 جس طرح مرد کو ازدواجی حقوق کے خلاف کوئی عمل انجام دینے کا حق نہیں، اسی طرح عورت کو بھی ازدواجی حقوق کے خلاف کوئی عمل انجام دینے کا حق نہیں ہے۔ یاد رہے کہ ازدواجی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے مرد کو اصطلاح میں ''ناشز'' اور عورت کو ''ناشزہ'' کہا جاتا ہے۔

مسئلہ: 545 مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ایسے اعمال کو، جن سے ازدواجی حقوق کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو، گھر یا گھر سے باہر انجام دے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ قیدیوں اور غلاموں کی طرح ہر وقت شوہر کے اشارے کی منتظر رہے۔ پس اگر وہ مقتضائے ایمان اور شرعی ضروریات کے پیش نظر گھر سے باہر نکلے اور اُس کے جنسی، اخلاقی یا عقیدتی لحاظ سے منحرف نہ ہونے کا اطمینان ہو تو شوہر اُس کو گھر سے باہر نکلنے سے نہیں روک سکتا۔ اس کے برعکس اگر مرد کی کسی آمد و رفت سے اُس میں اس قسم کا کوئی انحراف پیدا ہونے کا امکان ہو تو نہی از منکر اور اپنے ازدواجی حقوق کی حفاظت کے لحاظ سے عورت اُس کو ایسی آمد و رفت سے منع کر سکتی ہے۔

مسئلہ: 546 اگر عورت اپنے ازدواجی فرائض کی ادائیگی میں پس و پیش سے کام لے تو مرد سے اُس کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر مرد اپنے ازدواجی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو عورت

اُسے ہم بستری سے روکنے کا حق رکھتی ہے تا کہ اُسے نہی از منکر کرنے کے علاوہ اپنے حقوق کا دفاع بھی کرسکے۔ آیہ کریمہ میں ہے:

”وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ“. (34:4)

”اور وہ عورتیں جن کے نشوز سے تم ڈرتے ہو یعنی اُن کا نشوز خوفناک صورت اختیار کر رہا ہو تو انہیں نصیحت کرو اور بستر میں ان سے دُور ہو جاؤ اور انہیں مارو“۔

انہیں مارنا نہی از منکر کا آخری مرحلہ ہے اور یہ حق صرف مرد ہی کو حاصل نہیں ہے بلکہ مندرجہ ذیل آیت میں عورت کو بھی ایسا حق دیا گیا ہے، اگرچہ مجمل اور لطیف الفاظ میں۔

”وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ط“ (128:4)

”اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کے نشوز اور روگردانی کا خوف ہو تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ آپس میں کسی بھی طرح صلح کرلیں“۔

مسئلہ: 547 چونکہ ازدواجی زندگی مشترک زندگی ہے، لہٰذا مرد اور عورت دونوں پر لازم ہے کہ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ ایک دُوسرے کی مدد کرتے ہوئے گھریلو زندگی کے معاملات کو چلائیں، کہ نہ تو مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ گھر کے تمام اندرونی کام عورت کی گردن میں ڈال دے اور نہ ہی عورت کو اس قسم کا کوئی حق حاصل ہے۔ لیکن چونکہ گھر کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا شرعاً مرد کی ذمہ داری ہے، لہٰذا زندگی کے اُمور اور تقسیم کار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ عورت گھر کے اندرونی معاملات کو انجام دینے میں مرد کی نسبت زیادہ کوشش کرے۔ لیکن ذمہ داریوں کی برابری میں مرد اور عورت کی جسمانی قوت میں فرق کو ضرور مدِ نظر رکھنا چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے علاوہ گھر کے کاموں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ مرد کو سنبھالنا چاہئے، اس لئے

کہ ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ''اور''لِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ'' کی رُو سے چونکہ اس کی قوت زیادہ ہے، اس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔

مسئلہ: 548 جو عورت اپنے تمام ازدواجی فرائض کو شرعی طور پر انجام دیتی ہو لیکن اُس کا شوہر اُس کے حقوق ادا نہیں کرتا تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اپنے حقوق حاصل کرے۔ یعنی شوہر کے مال سے اپنی معمول کی ضروریات کے اخراجات لے لے یا کسی اور ذریعہ سے ان اخراجات کو اس سے حاصل کرے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنی ضروریات کے پیش نظر کوئی کام کر سکتی ہے، اگرچہ اُس سے شوہر کے بعض جائز شرعی حقوق ضائع ہوتے ہوں۔

عورت کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ حاکم شرع سے مطالبہ کرے کہ اُس کے شوہر کو اخراجات ادا کرنے یا طلاق دینے پر مجبور کرے اور اگر شوہر نہ اخراجات ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرے اور نہ ہی طلاق دینے پر تیار ہو تو حاکم شرع سے درخواست کر سکتی ہے کہ ولایتِ شرعیہ کی رُو سے اُسے طلاق دے دے۔

مسئلہ: 549 جس طرح مرد عورت سے جنسی لذت حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے، عورت بھی مرد پر یہ حق رکھتی ہے بلکہ اُسے یہ حق زیادہ حاصل ہے، اس لئے کہ مرد ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ جائز اور شرعی طور پر جنسی تعلقات قائم کر سکتا ہے جبکہ عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ مرد جوان عورت کے ساتھ مباشرت کو زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک ترک کر سکتا ہے اور اگر ایک بیوی کے علاوہ اُس کی اور بیویاں بھی ہوں تو ان کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرنا واجب ہے کہ ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً'' کہ ''اگر تم یہ خوف رکھتے ہو کہ دو یا چند بیویوں کے درمیان عادلانہ ازدواجی برتاؤ نہ کر سکو تو پھر ایک پر اکتفا کرو'' (3:4) اور اگر اُس ایک کے ساتھ بھی عادلانہ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتے تو پھر نکاحِ دائمی کرنے کا سرے سے حق ہی نہیں رکھتے، اس لئے کہ اس کی ذمہ داریاں سنگین ہیں بلکہ نکاحِ منقطع یا لونڈی کے ذریعے (اگر لونڈیاں میسر ہوں) اپنی جنسی ضرورت کو پورا کرو۔

ایک بیوی کے ساتھ عدالت پر مبنی سلوک کرنا اور اُس سے مشکل تر چند بیویوں کے ساتھ عادلانہ رویہ رکھنا ازدواجی زندگی کے اصلی ترین واجبات میں سے ہے۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا مردوں اور عورتوں کی عدالت کو پروان چڑھانے کا ایک بہترین اور مشکل میدان ہے کہ مرد اس طرح عادلانہ طرزِ عمل اختیار کرے کہ اپنی تمام بیویوں کے حقوق ممکنہ حد تک ادا کرے اور وہ بھی اس کی اس مضبوط عدالت کے پیش نظر خواہ مخواہ کے عذر لنگ تراش کر اس عادل مرد اور اُس کی دُوسری بیویوں کے درمیان خوشگوار فضا کو خراب نہ کریں۔

مسئلہ: 550 اگر عورت کا مہر نقد ہو تو عورت مہر لینے سے قبل شوہر کو جماع کرنے سے منع کرسکتی ہے۔ اگر پہلی مرتبہ راضی ہوجائے تو کیا بعد میں مہر لینے سے قبل شوہر کو جماع کرنے سے منع کرسکتی ہے؟

ظاہراً پہلی اور بعد کی دفعہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چونکہ اس کا مہر نقد ہے، لہٰذا اس کی وصولی کیلئے وہ شوہر کو جماع کے مانع ہوسکتی ہے۔ دُوسرے تمام حقوق میں بھی ایسا ہی ہے کہ اگر کوئی شخص دُوسرے کا حق روکے بغیر اُس سے اپنا حق حاصل نہ کرسکتا ہو تو اپنا حق حاصل کرنے کیلئے وقتی طور پر اُس کا حق ادا کرنے میں پس و پیش کرتا رہے، اس لئے کہ اگر ایسا کرنے کی اجازت نہ ہو تو یہ کمزوروں پر ایک قسم کا ظلم ہے۔

مسئلہ: 551 قرآن شریف میں مہر کو کبھی فریضہ، کبھی نحلہ اور کبھی صَدُقہ (نہ صدقہ) کہا گیا ہے۔ ان سب الفاظ کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان سب کو مجموعی طور پر مہر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مسئلہ: 552 مہر کو عقد میں معین کرنا ضروری ہے۔ اگر معین نہ کیا جائے تو عورت مہر المثل کا حق رکھتی ہے جس کی ادائیگی مرد پر واجب ہے۔

مسئلہ: 553 عقد نکاح کرتے ہی سارا مہر، چاہے معین ہو یا غیر معین، شوہر پر واجب ہوجاتا ہے، سوائے ایک صورت کے اور وہ یہ کہ مرد جماع سے پہلے عورت کو طلاق دے دے، جیسا کہ آیہ

شریفہ کا ارشاد ہے:

''وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ''(237:2)

''اگر تم ان سے مباشرت سے قبل انہیں طلاق دو اور تم نے ان کیلئے کوئی فریضہ مقرر کر رکھا ہو تو جو کچھ تم نے مقرر کیا ہے، اُس کا نصف انہیں ادا کرو''۔

لیکن جماع سے قبل موت واقع ہونے کی صورت میں یہ حکم نہیں ہے بلکہ پورا مہر شوہر کے ذمہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مرد پورا مہر ادا کرے جبکہ دُوسری طرف سے یہ بھی مستحب ہے کہ عورت اس نصف کو بھی نہ لے، اس لئے کہ جس طرح نکاح کا آغاز محبت اور خلوص کے ساتھ تھا، اس کا اختتام بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اگر چہ اس صورت میں مرد پر صرف نصف مہر کی ادائیگی واجب ہے لیکن اس آیت کی رو سے ان کے مہر کی ادائیگی کے علاوہ کچھ اور بھی ہدیہ اور تحفہ کے طور پر انہیں ادا کرنا چاہئے:

''مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّاعَلَى الْمُحْسِنِيْنَ''(236:2)

انہیں اچھائی کے ساتھ فائدہ پہنچاؤ، مالدار اپنی وسعت کے مطابق اور تنگدست اپنی وسعت کے مطابق، یہ نیکوکاروں کے ذمے ایک حق ہے۔

مسئلہ: 554 مرد کو عورت کے حق سے ایک پائی تک کم کرنے کا حق نہیں ہے، چاہے ادا کر چکا ہو یا اُس کی ادائیگی ابھی باقی ہو، اس لئے کہ:

''وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ''.(19:4)

''اور ان پر اس مقصد کے پیش نظر دباؤ نہ ڈالو کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو، اس کا کچھ حصہ ان سے لے لو مگر یہ کہ انہوں نے کوئی آشکار (کھلم کھلا) برا فعل انجام دیا ہو''۔

کھلم کھلا برے فعل سے ہروہ برائی مراد ہے جواس حقیقت کوآشکار کردے کہ ان کے ساتھ از رُوئے شریعت زندگی گزارنے کا امکان نہیں ہے جیسے زنا یا بعض دُوسرے اخلاقی اورعقیدتی انحرافات، جن سے زندگی بہت ناہموار اور بیہودہ شکل اختیار کرلے۔صرف ایسی صورت میں مردکو یہ حق حاصل ہے کہ جو کچھ اسے دے چکا ہے، اس کا کچھ حصہ، نہ کہ تمام، واپس لے لے۔اس کے علاوہ دُوسرے حالات میں:

''وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا''.(4:4)

''اورعورتوں کے مہر جن کی بنیاد صدق ہے اور وہ ان کیلئے شہد کی مانند شیریں ہیں، انہیں ادا کردو اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے (ہر قسم کے دھوکہ اور فریب کے بغیر) اس میں سے کچھ تمہیں دیں تو بڑی خوشی سے نوشِ جان کرلو''۔

بنابرایں شوہر کو عورت کے حق سے کم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اور وہ اس کی ادائیگی میں کسی قسم کے پس وپیش اور لیت ولعل سے کام نہیں لے سکتا، اس لئے کہ خدا نے اُسے فریضہ قرار دیا ہے جو واجب سے بھی برتر ہے۔

نفقہ

مسئلہ:555 عورت کے تمام ضروری اخراجات مرد کے ذمہ ہیں کہ وہ انہیں اپنی مالی طاقت کے مطابق برداشت کرے۔اُس کی رہائش کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ''.

''اور انہیں سکونت مہیا کرو جس طرح تم خود اپنی مالی توانائی کے مطابق سکونت اختیار کئے ہوئے ہو''۔(6:65)

یہ آیت اُس عورت کے متعلق ہے جسے طلاقِ رجعی دی گئی ہو۔جب طلاق شدہ عورت کا یہ

حکم ہے تو طلاق سے پہلے کا حکم خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ایک اور آیۂ کریمہ جو طلاقِ رجعی والی عورتوں کے متعلق ہے، یہ حکم بیان کرتی ہے:

''وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ''.(236:2)

''اور مالدار اور تنگ دست سب اپنی مالی قوت کے لحاظ سے انہیں ان کے اخراجات بخوبی ادا کریں کہ یہ محسنین پر حق ہے''۔

اسی طرح ایک اور آیۂ کریمہ میں ان طلاق یافتہ عورتوں کے بارے میں، جو طلاق دینے والے شوہر سے اولاد رکھتی ہوں، یہ حکم بیان کیا گیا ہے:

'' وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''

''اور جس کا بچہ ہو، اُس پر ان کی خوراک اور پوشاک واجب ہے، معروف کے مطابق''۔(233:2)

جب رجعی طلاق یافتہ اور بائن طلاق یافتہ صاحبِ اولاد عورت کے روٹی، کپڑا اور مکان شوہر پر واجب ہوں تو اس بیوی کے اخراجات کی ذمہ داری، جو ابھی شوہر کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھی ہوئی ہے، شوہر پر نہیں ہوگی تو کس پر ہوگی؟

ان آیاتِ شریفہ میں ''رزقھن''، ''ان کا رزق''، ''کسوتھن''، ''ان کا لباس''، ''واسکنوھن''، ''انہیں سکونیت مہیا کرو''، میں عورتوں کی معمول کی تمام ضروریات شامل ہیں جن میں بیماری کی صورت میں معالجہ اور جائز یا واجب سفر کے اخراجات بھی داخل ہیں۔

مسئلہ: 556 اگر شوہر نفقہ واجب کی ادائیگی کے امکان کے باوجود بیوی کو نفقہ نہ دے تو وہ یہ حق رکھتی ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اپنا حق حاصل کرے۔ یہ نفقہ بیوی کا حق ہے جو اُس کی رضامندی کے بغیر شوہر سے ساقط نہیں ہوتا۔

مسئلہ: 557 اگر عورت نفقہ کے بغیر مرد کے ساتھ زندگی نہ گزار سکے یا مناسب نفقہ اور زندگی کی دُوسری ضروریات کے نہ ہونے کی وجہ سے ایسی زندگی کو جاری نہ رکھ سکے کہ یا تو ایسی زندگی عسر وحرج کی موجب ہو یا اُسے جاری رکھنے کی صورت میں بعض شرعی احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ان تمام صورتوں میں عورت اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اگر شوہر اس پر راضی نہ ہو تو حاکم شرع اُسے طلاق دینے یا مناسب زندگی بسر کرنے کی شرائط مہیا کرنے کا حکم دے گا۔ اگر شوہر حاکم شرع کے حکم کی بھی پابندی نہ کرے تو اس صورت میں مجتہدِ عادل، ولایتِ شرعیہ کی رُو سے عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔ اس صورت میں مہر کی ادائیگی بھی شوہر پر واجب ہوگی اور اُسے عدت میں رجوع کا حق بھی نہیں ہوگا۔

عقدِ منقطع (متعہ)

مسئلہ: 558 دائمی عقد کی طرح عقد منقطع بھی ایک اسلامی سنت ہے۔ یہ اُن مردوں اور عورتوں کیلئے ایک خاص رعایت ہے جو دائمی عقد کی ذمہ داریوں کو اُٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے کہ نہ تو ہر مرد مالی یا غیر مالی وجوہات کی بناء پر دائمی عقد کر سکتا ہے اور نہ ہی ہر عورت سے دائمی عقد کیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسے مرد اور عورت جو دائمی عقد نہیں کر سکتے، موقت اور منقطع عقد سے بھی بہرہ مند نہ ہوں؟

اگر قرآن شریف میں عقد منقطع کے متعلق صریح آیت موجود نہ ہوتی تو بھی نکاح سے متعلق آیات کے عموم اور اطلاق کی رُو سے نکاحِ دائمی کی مانند نکاحِ منقطع کا جواز ثابت ہے، جیسا کہ 'احل اللہ البیع' (275:2) کی رُو سے بیع قطعی کی طرح بیع شرط بھی حلال اور جائز ہے۔ جس طرح ذاتی مکان بنانے یا خریدنے کی قوت نہ ہونے کی صورت میں آپ کرایہ پر مکان لے کر اپنی رہائشی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں، اسی طرح اگر دائمی نکاح کا امکان نہ ہو تو نکاحِ منقطع سے اس خلا کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ آیہ شریفہ: (24:4)

''فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً''

''پس جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہوتو اُن کی مقررہ اُجرت انہیں ادا کرو''۔

نکاح اور ازدواج سے متعلق دُوسری تمام آیات کے برعکس اس آیہ شریفہ میں لفظ ''استمتاع'' کا استعمال ہونا متعہ کی بہت حساس اہمیت کی نشاندہی کرتا ہے اور جس طرح دائمی بیوی کے مہر کو قرآن شریف میں فریضہ کہا گیا ہے، اسی طرح عقد منقطع میں بھی اسے فریضہ کہا گیا ہے۔ نکاحِ دائمی اور نکاحِ منقطع کے درمیان چند فرق ہیں جو مندرجہ ذیل مسائل میں بیان کئے جارہے ہیں۔

مسئلہ: 559 دائمی نکاح میں جنسی بہرہ مندی اس کی اصلی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ شرط کے بغیر بھی اس کا وجود ایک فطری اور طبیعی سی بات ہے لیکن عقد منقطع میں لفظ ''استمتعتم'' کی رُو سے جماع اور مقدماتِ جماع جیسی جنسی بہرہ مندی کو عقد منقطع کے واقع ہونے اور مہر کی ادائیگی کی اصلی شرط قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث میں بھی بیان ہوا ہے کہ ''ھن مستاجرات''، ''یہ اجارہ کی گئی عورتیں ہیں''۔ اگرچہ دائمی عورتوں کے مہر کو بھی اُجرت سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد جنسی بہرہ مندی کی اُجرت نہیں بلکہ ازدواجی زندگی کی اُجرت ہے۔

مسئلہ: 560 عقد منقطع میں مرد پر عورت کا نفقہ واجب نہیں ہے مگر یہ کہ عقد کے وقت نفقہ کی شرط منظور کی گئی ہو یا عقد کی بنیاد ہی نفقہ پر رکھی گئی ہو۔

مسئلہ: 561 ظاہراً عقد منقطع میں مرد اور عورت کے درمیان میراث نہیں ہے مگر یہ کہ اس کی شرط رکھی گئی ہو۔

مسئلہ: 562 نکاحِ منقطع میں طلاق نہیں ہے بلکہ مدت تمام ہوجانے یا شوہر کی طرف سے باقی ماندہ مدت بخش دیئے جانے کی صورت میں جدائی عمل میں آجاتی ہے۔ اس جدائی کا ایسے طہر یعنی حیض سے پاکیزگی کے دَور میں واقع ہونا ضروری نہیں ہے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو۔

مسئلہ: 563 نکاحِ دائمی میں تیسری طلاق کے بعد عورت حرام اور نویں طلاق کے بعد ہمیشہ

کیلئے حرام ہوجاتی ہے جبکہ نکاحِ منقطع میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

مسئلہ: 564 نکاحِ منقطع میں جدائی کے بعد عورت کی عدت دو حیض ہے اور نکاحِ دائمی میں تین حیض اور اگر یہ جدائی حیض کی حالت میں واقع ہو تو چونکہ دو کامل حیض عدت کی مدت ہے، لہٰذا دُوسرے حیض کے بعد تیسرے حیض کے چند ایام سے پہلے حیض کے ایام کی کمی کو پورا کرنا چاہئے، اگرچہ پہلے ناقص حیض کو ہی ایک کامل حیض شمار کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 565 عقد منقطع میں گھریلو زندگی کی تشکیل ضروری نہیں ہے جبکہ نکاحِ دائمی میں بہرصورت ضروری ہے۔

مسئلہ: 566 عقد منقطع میں اگر جدائی کے وقت حاملہ ہو تو عورت حمل کی وجہ سے نفقہ کا حق نہیں رکھتی۔

مسئلہ: 567 عقد دائمی میں عورت کو شوہر کے ساتھ ہم خوابی کا حق حاصل ہے، خصوصاً اگر اُس کی متعدد بیویاں ہوں جبکہ عقد منقطع میں بیوی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

یہ عقد دائمی اور عقد منقطع کے درمیان چند اہم فرق ہیں۔ دُوسرے تمام ازدواجی احکام میں عقد منقطع اور عقد دائم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نکاح کی صحیح اور غیر صحیح شرائط

ہر وہ شرط جو قرآن شریف کے احکام کے خلاف ہو، حرام ہے اور بعض اوقات عقد کو بھی باطل کر دیتی ہے، مثلاً اگر عورت یہ شرط مقرر کرے کہ شوہر دُوسری شادی نہ کرے اور اگر دُوسری شادی کرلے تو وہ اس عقد پر راضی نہیں ہے یا یہ کہ شوہر کے دُوسری شادی کرنے کی صورت میں وہ اپنی طلاق کی وکالت رکھتی ہو تو پہلی صورت میں عقد باطل ہے لیکن دُوسری صورت میں اگرچہ عقد صحیح ہے مگر

اس کی شرط ساقط اور نا قابل قبول ہے، اس لئے کہ ایسی شرائط کا مطلب یہ ہے کہ مرد شرعاً حلال کی گئی چیز کو اپنے اُوپر حرام کر لے۔[1]

لیکن جو شرائط خلافِ شرع نہ ہوں، وہ صحیح اور قابل قبول ہیں جیسے مکان وغیرہ کی شرط۔ مرد اس قسم کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، اگر خلاف ورزی کا مرتکب ہوتو عورت طلاق کا حق رکھتی ہے۔ اگر عورت کی رضامندی عقد میں مقرر کی گئی کسی حلال شرط سے مشروط ہو اور شوہر اس شرط کی خلاف ورزی کرے تو طلاق کے بغیر ہی عورت نکاح کو فسخ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

نامحرم عورت کو دیکھنے کے احکام

مسئلہ: 568 نامحرم عورت پر نظر ڈالنے کی تین صورتیں ہیں:

1۔ شہوت اور ریبہ کے بغیر۔ 2۔ شہوت کے ساتھ، ریبہ کے بغیر۔

---

[1] ظاہراً عورت کی طرف سے ایسی شرط عائد کرنا جائز اور صحیح ہے۔ اس لئے کہ کسی عورت کا یہ خواہش کرنا کہ اس کا شوہر سارے کا سارا اسی کا ہو، کوئی غیر شرعی خواہش نہیں ہے۔ یہ استدلال ایک کمزور استدلال ہے کہ ایسی کسی شرط کو قبول کرنا حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنا ہے لہٰذا یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی شرائط تقریباً تمام معاہدوں میں پائی جاتی ہیں۔ واجب اور حرام چیزوں کو تو معاہدوں میں داخل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اس لئے کہ واجب کی ادائیگی بہر حال ضروری ہے اور حرام سے اجتناب بھی بہر حال لازمی ہے۔ ہر شخص کے پاس بہت سے حلال راستے (options) موجود ہوتے جن میں سے کسی پر عمل کرنا معاہدے کے دوسرے فریق کے مفاد کے خلاف ہوسکتا ہے لہٰذا ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے جائز مفاد کی حفاظت کی خاطر معاہدے کے دوسرے فریق پر کسی ایسے راستے کو اختیار نہ کرنے کی پابندی عائد کردے جو دراصل اس کے لئے جائز ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو ملازمت دیتے وقت مالک یہ شرط رکھ سکتا ہے کہ جب تک وہ اس کے پاس ملازم ہے کسی اور کے ہاں ملازمت نہیں کرے گا۔ ظاہر سی بات ہے کہ کسی اور کے ہاں ملازمت کرنا شرعی لحاظ سے حلال ہے لیکن ایسی شرط کو کوئی بھی ناجائز قرار نہیں دے سکتا۔ (ہمدانی)

3۔ شہوت اور ریبہ کے ساتھ۔

ریبہ سے مراد وہ خاص شہوت ہے جو جنسی بہرہ مندی کے نزدیکی مقدمات میں سے ہے، جیسے بوسہ دینا یا ہاتھ لگانا یا دُوسرے مقدمات ومؤخرات جو جنسی بہرہ مندی میں شمار ہوتے ہیں۔ نامحرم عورت پر نظر ڈالنے کی مذکورہ تین اقسام میں سے آخری دو اقسام بلاشک وشبہ حرام ہیں جبکہ پہلی صورت کے حرام ہونے پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور جب روایات میں نامحرم عورت کی طرف نظر کو شیطان کا تیر کہا گیا ہے کہ ''اَلنَّظَرُ سَھْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ '' تو واضح سی بات ہے کہ صرف وہی نظر شیطان کا تیر ہے جو کبھی نشانے پر جا لگے۔ شہوت اور ریبہ سے خالی نظر ایسا تیر نہیں ہے کہ کبھی نشانے پر جا لگے۔

علاوہ ازیں جن آیات میں نظر کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہاں بھی مراد صرف وہی نظر ہے جو شہوت اور ریبہ کے ہمراہ ہو یا عورت کا پیچھا کرنے اور اُسے اذیت پہنچانے کی موجب ہو۔ حجاب کی آیت میں حجاب کے وجوب کی یہی حکمت بیان کی گئی ہے:

''ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَایُؤْذَیْنَ''.(59:33)

''یہ (حجاب) اس سے قریب تر ہے کہ عورتیں پاک دامن اور عفیفہ ہونے کے لحاظ سے پہچانی جائیں اور اذیت میں مبتلا نہ ہوں''۔

اسی طرح

''ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ''.

''یہ (حجاب) تمہارے اور ان (عورتوں) کے دلوں کیلئے زیادہ پاکیزگی کا سبب ہے''۔(53:33)

بہرصورت چونکہ عورت پر نظر ڈالنے کی حرمت، جو اس آیہ شریفہ سے معلوم ہوتی ہے، ''یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ''، ''وہ اپنی بعض نظریں نیچے رکھا کریں'' (نور:31)، جنسی بے راہ روی کا سدِباب کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اگر عورت پر نظر ڈالنے میں ایسی بے راہ روی اور انحراف کا احتمال نہ ہو تو

اس پر نظر ڈالنا حرام نہیں ہے۔

مسئلہ:569 قرآن شریف میں حجاب اور نظر کرنے کے احکام مؤمنین اور مؤمنات کے

س پر نظر ڈالنا حرام نہیں ہے۔

مسئلہ: 569 قرآن شریف میں حجاب اور نظر کرنے کے احکام مؤمنین اور مؤمنات کے
ساتھ مختص ہیں، لہٰذا نابالغ لڑکی پر نظر کرنا، نابالغ لڑکے کا بالغ لڑکی پر نظر کرنا، اس حکم سے باہر ہیں۔ لیکن اگر نابالغ لڑکا جنسی مسائل کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو اور اس میں مباشرت کی صلاحیت بھی موجود ہو تو اس سے حجاب ضروری ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ:

''اَوِ الطِّفۡلِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَظۡهَرُوۡا عَلٰی عَوۡرٰتِ النِّسَآءِ''

''اور وہ بچے جو عورتوں کی شرمگاہوں پر ظاہر نہیں ہوئے'' (31:24) کی رُو سے صرف وہی لڑکے اس ممانعت سے خارج ہیں جو عورتوں کی شرمگاہوں پر ظاہر نہ ہوں۔

اس آیہ شریفہ میں ظہور سے مراد عورتوں کی شرمگاہوں سے آگاہی اور ان سے جنسی بہرہ مندی کا امکان ہے ورنہ صرف آگاہی کیلئے ''**لم یطلعوا**''، ''اطلاع نہ رکھتے ہوں'' کے الفاظ استعمال ہوتے۔

اسی طرح وہ مرد جو جنسی توانائی نہیں رکھتے، اُن کا حکم بھی یہی ہے۔ اسی آیہ کریمہ کی رُو سے:

''اَوِ التّٰبِعِیۡنَ غَیۡرِ اُولِی الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ'' (31:24)

''وہ تابع مرد جو جنسی حاجت نہ رکھتے ہوں، چاہے بڑھاپے، جنسی قوت کے فقدان یا کسی اور وجہ سے ایسی جرأت نہ کرسکیں کہ جس گھر میں کام کرتے ہیں، اُس گھر کی عورتوں کے بارے میں بری نیت رکھ سکیں، اُن سے حجاب واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 570 مسلمان عورتوں کے حجاب کا حکم دو بنیادوں پر ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں کی پاک دامنی اور ناموس اور احترام و عفت کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں آوارہ اور لا اُبالی

افراد کی شرارتوں سے محفوظ رکھا جائے اور دُوسری بنیاد یہ ہے کہ مردوں کی پاک دامنی کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں عورتوں کے ساتھ میل جول اور ہوسِ رانی سے باز رکھا جائے۔ان دونوں کا محور جنسی بہرہ مندی سے دُوری اور اجتناب ہے۔

بالفاظِ دیگر مسلمان خواتین پر نظر نہ کرنے کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ ان کے احترام کا تقاضا ہے کہ ان پر نظر نہ ڈالی جائے، دُوسرا پہلو جنسی بے راہ روی سے بچنے کا ہے۔

بنابرایں غیر مسلم عورتیں، یا وہ مسلمان عورتیں جو حجاب کی پابندی نہیں کرتیں، وہ اس احترام سے محروم ہیں جو باپردہ خواتین کیلئے ہے۔لہٰذا ان پر نظر کی حرمت صرف دُوسرے پہلو یعنی جنسی بے راہ روی سے بچنے کیلئے ہے، جیسا کہ حدیث میں دیہاتی عورتوں پر نظر کرنے کے جواز کی یہ حکمت بیان ہوئی ہے کہ:

"لاَ نَّهُنَّ اِذَانُهِيَنَ لا يَنْتَهِيَنَ".

"جب انہیں بے حجابی سے روکا جائے تو وہ نہیں رُکتی ہیں"۔

اب اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا کافر عورتوں کو شہوت کی نظر سے دیکھنا، بشرطیکہ گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، حرام ہے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔ جو روایات ان کی شرمگاہوں پر نظر کرنے کو گدھے کی شرمگاہ پر نظر کرنے کی مانند قرار دیتی ہیں، اُن سے بھی عدم حرمت کی تائید ہوتی ہے۔ان سے ناجائز جنسی مباشرت بھی حرام ہے، اگرچہ مباشرت کے علاوہ دُوسری جنسی لذتیں اُٹھانا، چاہے ان عورتوں سے ہو یا حیوانات سے، جائز نہیں ہے، اس لئے کہ شرعی طور پر جائز عورتوں کے علاوہ ہر ذریعے سے جنسی لذت حاصل کرنا حرام ہے۔

مسئلہ: 571 جس بچے یا بچی کو آپ نے اپنے بچوں کی طرح پالا ہے اور اس کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ آپ اس کے اصلی والدین نہیں ہیں، یا علم ہے لیکن اس کے اور آپ کے درمیان کوئی جنسی

کشش نہیں ہے اور نفسیاتی لحاظ سے آپ کا اور اس کا رشتہ ایسا ہی ہے جیسے اولاد اور والدین کا ہوتا ہے تو اس پر بھی محرم کے احکام جاری ہوں گے۔ ایسے لڑکے سورہ نور کی آیت: 24 کی رو سے '' **لم یظھروا علیٰ عورات النساء**'' اور '' **التابعین غیر اولی الاربة**'' کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے اور لڑکیاں '**والقواعد من النساء**' کے ساتھ ملحق ہو جائیں گی۔

مسئلہ: 572 جو عورت حجابِ شرعی میں ہو، اگر دیکھے یا جان لے کہ نامحرم مرد اُسے بری نظر سے دیکھ رہا ہے تو اُسے نہی از منکر کرے اور اگر یہ مؤثر واقع نہ ہو تو اُس کی نظر سے دُور ہو جائے یا نہی از منکر کے طور پر اپنے چہرے کو ڈھانپ لے، اگر چہ عام حالت میں چہرہ کا پردہ واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 573 حجابِ اسلامی میں چہرے اور کلائی تک دونوں ہاتھوں کا چھپانا واجب نہیں ہے، سوائے بعض استثنائی حالات کے۔ انہیں ڈھانپنا حرام بھی نہیں ہے، سوائے حالتِ احرام کے اور اگر وہ دیکھے کہ حالتِ احرام میں کوئی نامحرم اُسے بری نظر سے دیکھ رہا ہے تو اپنے چہرے کو اس طرح چھپائے کہ نقاب چہرے پر نہ لگے۔

مسئلہ: 574 جس طرح مرد کا نامحرم عورت کو بری نظر سے دیکھنا حرام ہے، اسی طرح عورت کا نامحرم مرد کو بری نظر سے دیکھنا بھی حرام ہے اور حجاب کے وجوب کے علاوہ نظر کے دیگر تمام احکام یہاں بھی جاری ہیں۔

طلاق

مسئلہ: 575 طلاق جو دائمی زن و شوہر کے درمیان جدائی کا نام ہے، اس میں بھی عدالت کو اسی طرح ملحوظ رکھنا ضروری ہے، جس طرح خود عقد نکاح میں۔ اس لئے کہ عقدِ ازدواج زندگی کے تمام اصلی اور فرعی اُمور میں عدالت اور محبت کی بنیاد پر ایک مشترکہ گھریلو زندگی کی بنیاد ہے، اگر اس مشترکہ ازدواجی زندگی کو جاری رکھنے سے عدالت کی پابندی ممکن نہ رہے تو یہاں طلاق کی ضرورت پیش آتی ہے، اس لئے کہ ازدواجی زندگی چاہے واجب ہو یا مستحب، آغاز اور انجام میں میاں بیوی

کے حقوق کی ضمانت کیلئے عادلانہ فرائض کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک یا دونوں، عدالت کی بنیاد پر حدودِ الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے اس مشترکہ زندگی کو جاری نہ رکھنا چاہیں یا نہ رکھ سکتے ہوں تو طلاق کے ذریعے اس بندھن کو کھول دینا واجب اور مناسب ہے جو اللہ کے احکام کی اطاعت اور اس کی حدود کی پابندی سے مانع ہو۔

یہی وجہ ہے کہ طلاق سے متعلق آیات اور روایات میں ازدواجی زندگی میں تقویٰ کی پابندی کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ اپنی توانائی کی آخری حد تک اس مشترکہ زندگی میں ایک دُوسرے کے حقوق اور حدودِ الٰہی کی پابندی کی جائے۔ اگر مرد اور عورت کے درمیان ہم آہنگی کا امکان نہ ہو اور اس کی وجہ سے حدودِ الٰہی کی مخالفت لازم آتی ہو تو جس طرح خدا کے حکم کے مطابق اس مشترکہ زندگی کا آغاز کیا گیا تھا، اسی طرح خدا ہی کے حکم سے طلاق کے ذریعے اسے ختم کرنا واجب ہے۔

چونکہ بعض اوقات طلاق سوچے سمجھے بغیر اور جلد بازی میں واقع ہوتی ہے، لہٰذا آیات اور روایات میں بہت تاکید کی گئی ہے کہ باصلاحیت افراد حتی الامکان طلاق کو روکنے کی کوشش کریں اور اگر طلاق واقع ہو بھی جائے تو عدۂ رجعیہ کی صورت میں اس طلاق یافتہ عورت کو عدت کے آخری لمحہ تک شوہر کے گھر رہنا ہوگا، اس لئے کہ:

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا.(1.65)

''تمہیں نہیں معلوم، ہوسکتا ہے خدا اس طلاق کے بعد بھی ایسے حالات پیدا کردے جن سے دوبارہ مشترکہ ازدواجی زندگی شروع کرنے کی راہیں ہموار ہوجائیں''۔

یہی وجہ ہے کہ عدۂ رجعیہ میں عورت شوہر سے پردہ کرنے اور اس کے گھر سے باہر جانے کا حق نہیں رکھتی بلکہ طلاق سے پہلے کی طرح دن رات اُس کی دسترس میں رہے تا کہ شاید وہ اپنے کئے پر نادم ہوکر ازدواجی زندگی کی طرف رجوع کرلے، جس کیلئے تازہ عقد کی بھی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ کی رُو سے ''وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا''، ''اور

ان کے شوہر عدۂ رجعیہ میں انہیں دوبارہ ازدواجی زندگی کی طرف لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں، بشرطیکہ وہ اصلاح اور بہتری کا ارادہ رکھتے ہوں''۔(228:2)

یہ ارادۂ اصلاح ہی ہے جس کی وجہ سے شوہر کو رجوع کا حق دیا گیا۔ اگر وہ ایسا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ اس سے بھی بدتر، عورت کو ایذا رسانی کی غرض سے رجوع کرتا ہے تو یہ رجوع شرعاً درست نہیں ہے اور زنا کا حکم رکھتا ہے۔ عدۂ رجعیہ میں عقد کے بغیر دوبارہ ازدواجی زندگی کے شرعاً صحیح آغاز کا امکان اس صورت میں ہوتا ہے جب گزشتہ کوتاہیوں اور غلطیوں کی تلافی اور اصلاح کے ارادہ کے ساتھ رجوع کیا جائے، نہ یہ کہ بوالہوسی کے سبب یا عورت کو ایذا رسانی کیلئے یا اُسے اُس کے حق سے دستبردار کرنے کیلئے یا اُسے جلد نئی زندگی کے آغاز سے روکنے کیلئے رجوع کیا جائے۔

بہرحال طلاق اور نکاح میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ جس طرح یہاں عدۂ رجعیہ میں رجوع کی اصلی شرط ارادۂ اصلاح ہے، اسی طرح ازدواجی زندگی کے آغاز میں بھی ضروری ہے کہ شریعت کی رُو سے صالح ازدواجی زندگی کا ارادہ موجود ہو، ورنہ یہ نکاح سرے سے جائز ہی نہیں ہے۔ مرد اور عورت کا ایک دُوسرے کیلئے مشکلات پیدا کر کے ایک دُوسرے کیلئے زحمت اور ترکِ حدودِ الٰہی کے موجب بننا ہرگز جائز نہیں ہے۔ ان اسباب میں سے ہر ایک اس ازدواجی زندگی کو ناجائز اور غیر مشروع بنانے کیلئے کافی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور حکمت کے منافی ہے کہ ایسے نکاح یا طلاق کو جائز قرار دے جو زندگی کے غیر مشروع اور ناجائز ہو جانے کا سبب ہو۔

نکاح اگرچہ زندگی میں بہت اہم اور تعمیری کردار ادا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن شریف میں سورۃ النکاح نہیں آئی ہے جبکہ سورۂ طلاق قرآن شریف میں موجود ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ طلاق کی ذمہ داری نکاح کی ذمہ داری سے زیادہ سنگین ہے، اس لئے کہ نکاح آبادکاری اور طلاق ویران گری ہے اور جس چیز کو تعمیر اور آباد کیا جا چکا ہو، اُسے تباہ و ویران کرتے وقت بہت زیادہ غور و فکر اور سوچ بچار سے کام لینا ضروری ہے، اس لئے کہ بنانا اور آباد کرنا بہت مشکل اور ویران کرنا

بہت آسان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ طلاق سے متعلق آیات وروایات میں اس ویرانی کو واقع ہونے سے روکنے کیلئے حتی الامکان کوشش کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بہت تاکید کی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان شرعی حدود کے مطابق، جہاں تک ہو سکے ہم آہنگی پیدا کی جائے، اس لئے کہ نکاح میں یہ مرد اور عورت دو فرد تھے لیکن اب ایک خاندان بن چکا ہے جس میں ممکن ہے کہ بچے بھی ہوں۔

طلاق اس خاندان کو، جو میاں بیوی کے علاوہ بچوں کا بھی محور ہے، ویران کر دیتی ہے جس سے مرد اور عورت کے خاندان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ واضح سی بات ہے کہ ویرانی کو روکنا محبت کو پیدا کرنے سے زیادہ اہم ہے، اس لئے کہ بہت سے لوگ ایک دُوسرے کو نہیں جانتے اور ایک دُوسرے کے دوست یا دُشمن بھی نہیں ہوتے لیکن جب لڑکے اور لڑکی کے درمیان نکاح کی بنیاد پر ایک محبت اور آشنائی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اگر جدائی رُونما ہو جائے تو مرد اور عورت دونوں کے خاندانوں میں ناچاقی اور عداوت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَبْغَضُ الْحَلالِ عِنْدَاللّٰهِ الطَّلَاقُ".

"خدا کے نزدیک حلال کاموں میں سے ناپسندیدہ ترین کام طلاق ہے"۔

آپؐ کا یہ فرمان اس طلاق کے بارے میں ہے جو حلال ہے۔ یہاں سے اس ناجائز اور حرام طلاق کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے جس میں بعض نادان لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک خاندان کا ٹوٹنا ایک حکومت کے ٹوٹنے سے زیادہ اہم ہے، اس لئے کہ حکومت انہی خاندانوں کی اساس پر قائم ہوتی ہے۔ اگر اساس ہی ویرانی اور تباہی کی لپیٹ میں آ جائے تو حکومت کہاں رہ سکتی ہے!

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں طلاق کا طریق کار اس طرح منظّم کیا گیا ہے، گویا یہ

ازدواجی زندگی کے بعد مرد اور عورت کے درمیان ایک نیا رابطہ ہے جو اس کی جگہ پر آیا ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

"وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ". (6:65)

"بخوبی ایک دُوسرے کو امر و نہی کرو اور دُوسرے سے امر و نہی کو قبول کرو"

کہ ازدواجی زندگی کے بندھن کا ٹوٹنا بھی اس کے بندھنے کی مانند محبت اور اچھائی کے ساتھ ہو۔

اسلام شادی اور نکاح کے ذریعے دو جسموں سے زیادہ دو دِلوں اور دو رُوحوں میں یگانگت ایجاد کرنا چاہتا ہے، ایسی یگانگت جس کی وجہ سے مرد اور عورت ایک ہی انسان بن جائیں۔ لیکن اگر کچھ مدت کے بعد معلوم ہو کہ یہ دو جسم یا دو دل ایک دُوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں تو اس صورت میں دونوں کو چاہئے کہ محبت کے ساتھ اس رشتے کو توڑ ڈالیں اور ایسا نہ ہو کہ شادی سے پہلے کے معمول کے مطابق تعلقات دُشمنی میں بدل جائیں۔

بنیادی طور پر طلاق اس بات کے پیش نظر مقرر کی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے اختلافات کی وجہ سے حدودِ الٰہی ترک نہ ہو جائیں اور نہ ہی اسلامی اخوت رشتہ کمزور پڑے، اس لئے کہ حدودِ اسلامی کی پابندی اور اخوتِ اسلامی اسلام کے معاشرتی نظام کی دو اہم بنیادیں ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی میں طلاق دینے والے نامعقول اور ناہنجار افراد کو سخت تنبیہ کی گئی ہے:

"وَلَا تُضَآرُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ".

"اور ان پر دباؤ ڈالنے کیلئے اپنے اور ان کے درمیان ضرر رسانی کی فضا پیدا نہ کرو"۔(6:65)

"لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُۥ بِوَلَدِهِۦ"(233:2)

"نہ تو ماں کو اُس کے بچے کے ذریعے ضرر پہنچایا جائے اور نہ ہی بچے کے باپ کو بچے کے

ذریعے ضرر پہنچے، اس لئے کہ معصوم بچے کو دشمنی اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ نہیں بننے دینا چاہیئے۔اس کے برعکس:

"فَاَمۡسِکُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡسَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ".

"یا تو انہیں معروف کے مطابق اپنے پاس رکھو یا احسان اور نیکی کے ساتھ انہیں آزاد کردو"۔(231:2)

اسی طرح:

"وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ حَقًّاعَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ"

"طلاق یافتہ عورتوں کیلئے معروف کے مطابق ایک متاع ہے اور یہ متقین پر ایک حق ہے"۔(241:2)

یہ متاع مہر کی طرح شوہر پر بیوی کا حق ہے، نیز:

"وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡامِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًااِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَاحُدُوۡدَاللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَاللّٰهِ فَلَاجُنَاحَ عَلَيۡهِمَافِيۡمَاافۡتَدَتۡ بِهٖ".

"اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو، اس میں سے کوئی چیز ان سے لو مگر یہ کہ ان دونوں کو یہ خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں، پس اگر حدودِ الٰہی کو قائم نہ کرنے کا خوف ہو تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت کچھ فدیہ دے کر آزاد ہو جائے"۔(229:2)

اسی طرح:

"وَمَتِّعُوۡهُنَّ عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِقَدَرُهٗ مَتَاعًابِالۡمَعۡرُوۡفِ حَقًّاعَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ".(236:2)

مالدار اور تنگ دست اپنی اپنی مالی وسعت کے مطابق انہیں ان کے حقوق کے علاوہ بھی

بہرہ مند کریں اور یہ نیکو کاروں پر ایک حق ہے''۔

علیٰ ہذا

''لِيُنفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ''. (7:65)

''جس کے رزق میں وسعت ہے، وہ اس وسعت میں سے اور جو تنگ دست ہے، جو کچھ اللہ نے اُسے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے''۔

یہ تاکیدات جو طلاق اور طلاق کے بعد عورتوں کے متعلق کی گئی ہیں، ان تاکیدات کی نسبت بہت زیادہ ہیں جو ازدواجی زندگی سے متعلق ہیں، اس لئے ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کے درمیان پائی جانے والی محبت ان تاکیدات کو غیر ضروری بنا دیتی ہے۔ لیکن چونکہ طلاق اور طلاق کے بعد جدائی اور دُشمنی کے پیدا ہونے کے امکانات اور موجبات پیدا ہو جاتے ہیں، لہٰذا انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے ہر قسم کی دُشمنی کو جنم لینے سے روکا جائے، صرف یہی نہیں بلکہ یہ محبت بعض اوقات دوبارہ ازدواجی زندگی شروع کرنے کا باعث بھی بن جاتی ہے، خواہ عدۂ رجعیہ کے دوران رجوع کے ذریعے ہو یا اس کے بعد عقدِ جدید کے ذریعے۔

اگر مرد رجوع نہ کرے اور دوبارہ عقد کرنے کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو تو بھی عورت کو دُوسری شادی کرنے سے روکنے کیلئے کسی بھی قسم کی مشکلات ایجاد کرنے اور رُکاوٹیں پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

''اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ''. (232:2)

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں ان کے شوہروں کے ساتھ شادی کرنے سے روکنے کیلئے ان پر دباؤ نہ ڈالو''۔

اس آیہ شریفہ میں ''شوہر'' کے دو معنی ہیں یعنی سابقہ شوہر اور دُوسرا شوہر۔ آیت اس بات سے روک رہی ہے کہ اگر عدت کے بعد یہ عورت اور اُس کا پہلا شوہر دوبارہ شادی کرنا چاہیں تو اس کے اپنے یا پہلے شوہر کے رشتہ دار اس نکاح سے مانع نہ ہوں اور اگر کسی اور مرد سے شادی کرنا چاہے تو پہلا شوہر اور اُس کے رشتہ دار اس سے مانع نہ ہوں۔

مسئلہ: 576 نکاح کی طرح طلاق میں بھی ضروری شرط ہے کہ مرد اپنے اختیار سے کسی خوف اور دباؤ کے بغیر طلاق دے۔

مسئلہ: 577 طلاق کے وقت عورت کا حیض یا نفاس سے پاک ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ شوہر نے اس طہر میں اس سے جماع نہ کیا ہو۔ اگر اس طہر سے پہلے حیض یا نفاس کی حالت میں اس سے جماع کر چکا ہو تو یہ بھی طلاق سے مانع ہے۔

مسئلہ: 578 صرف تین صورتوں میں مرد عورت کو حیض یا نفاس کی حالت میں طلاق دے سکتا ہے:

1۔ شوہر نے شادی کے بعد عورت سے جماع نہ کیا ہو۔

2۔ جماع کیا ہو اور یہ جانتا ہو کہ عورت حاملہ ہے۔

3۔ مرد کیلئے عورت کے حیض یا نفاس میں ہونے کا علم حاصل کرنا ممکن نہ ہو، چاہے سفر یا زندان میں ہونے کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے۔

پس اگر مسافر نہ ہو اور عورت کے حیض یا نفاس میں ہونے کا علم حاصل نہ کر سکتا ہو تو طلاق درست ہے۔ لیکن اگر مسافر ہو اور اس کے باوجود اس کی حالت سے آگاہی حاصل کر سکتا ہو اور آگاہی حاصل کئے بغیر طلاق دے دے تو یہ طلاق درست نہیں ہے مگر یہ کہ حالتِ طہارت میں واقع ہوئی ہو۔

بہر حال جب تک عورت کی حالت معلوم کرنا ممکن ہو، اُس کی حالت معلوم کئے بغیر اُسے

طلاق نہیں دی جاسکتی اور جب اس کیلئے عورت کی حالت معلوم کرنا کسی بھی طرح ممکن نہ ہو اور طلاق دینا بھی ضروری ہو تو صرف اُس صورت میں حیض یا نفاس میں دی گئی طلاق صحیح ہے اور اگر طلاق دینا ضروری نہ ہو تو اس وقت تک طلاق نہ دے جب تک اُس کی حالت معلوم نہ ہو جائے یا یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ وہ حالتِ طہارت میں ہے۔

مسئلہ:579 جو شخص عورت کی حالت کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے حیض یا نفاس کی حالت میں طلاق دینے پر مجبور ہو تو اتنی مدت صبر کرے جس میں اُسے یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ وہ پاک ہے اور پھر طلاق دے۔ اگر اتفاقاً یہ طلاق حیض یا نفاس کی حالت میں واقع ہو جائے تو یہ طلاق درست ہے۔ لیکن اگر ثابت ہو جائے کہ طلاق کے وقت عورت طاہر نہیں تھی تو دوبارہ شرائط کے ساتھ طلاق دے۔

مسئلہ:580 اگر کوئی شخص عورت کی حالت سے آگاہ ہو سکتا ہو اور عورت کو حیض یا نفاس کی حالت میں جانتے ہوئے طلاق دے دے اور بعد میں معلوم ہو کہ عورت پاک تھی تو یہ طلاق درست ہے لیکن اگر اُسے طہارت میں جانتے ہوئے طلاق دے دے اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ پاک نہ تھی تو طلاق باطل ہے۔

مسئلہ:581 اُسے حیض نہ آتا ہو تو اُسے طلاق دینے کیلئے ضروری ہے کہ اُس کے ساتھ آخری جماع کے بعد تین ماہ تک صبر کرے اور پھر اُسے طلاق دے۔ ان تین مہینوں کے دوران اُسے طلاق دینا طہر مواقع میں دی ہوئی طلاق کی مانند باطل ہے۔

مسئلہ:582 نکاح کے برعکس طلاق جاری کرنے میں لفظی صیغہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ آیہ شریف میں ہے:

''وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ''(227:2)

''اور اگر طلاق دینے کا عزم کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے''۔

اس آیت کی رُو سے طلاق میں لفظ کا ہونا ضروری ہے ورنہ یہاں ''سمیع'' کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

مسئلہ: 583 طلاق کا عربی زبان میں ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ جس زبان میں بھی طلاق دی جائے، اگر طلاق کے واقعی معنی محفوظ ہوں تو طلاق درست ہے۔

مسئلہ: 584 نکاح کے برعکس طلاق کے صحیح ہونے کیلئے دو عادل شاہدوں کی موجودگی ضروری ہے اور صرف طلاق ہی نہیں بلکہ عدۂ رجعیہ میں اگر شوہر رجوع کرنا چاہے تو اس کیلئے بھی دو عادل شاہدوں کی موجودگی ضروری ہے، اس لئے کہ:

''وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ''. (2:65)

''اپنے میں سے دو عادل افراد کو گواہ قرار دو''، طلاق اور رجوع دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔

مسئلہ: 585 ایک ہی وقت میں ایک ہی لفظ کے ساتھ ایک سے زیادہ طلاقیں درست نہیں ہیں۔ پس اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے:

''اَنْتِ طَالِقٌ اِثْنَتَيْنِ اَوْ ثَلَاثَةً''.

''تجھے طلاق دی گئی دو بار یا تین بار''۔

تو یہ ایک ہی طلاق شمار ہوگی، اس لئے کہ طلاق کے معنی نکاح کی گرہ کو کھولنا ہیں اور ایک گرہ کو ایک سے زیادہ مرتبہ کھولنا کس طرح ممکن ہوسکتا ہے، اس لئے کہ کھولنا بندھنے کے بعد ہی ممکن ہے اور ایک گرہ کو ایک ہی دفعہ چند بار کھولنا ممکن نہیں ہے۔ کیا آپ ایک کاغذ کو ایک ہی جگہ سے ایک ہی مرتبہ کئی بار پھاڑ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، اس لئے کہ اسے دوبارہ پھاڑنے سے پہلے جوڑنا ضروری ہے ورنہ پھٹی ہوئی چیز کو دوبارہ پھاڑنا کس طرح ممکن ہے؟

لہٰذا تیسری طلاق تو درکنار، دُوسری طلاق بھی اُسی صورت میں واقع ہوسکتی ہے جب پہلی طلاق کے بعد عدت کے دوران رجوع کے ذریعے یا اس کے بعد نئے عقد کے ذریعے دوبارہ رشتہ زوجیت برقرار ہو چکا ہو۔ یہی حال تیسری طلاق کا ہے۔ دو یا تین طلاقوں کا ایک ہی بار انجام دینا نہ

صرف غیر مشروع بلکہ نامعقول اور خلافِ حس بھی ہے کہ ایک ہی بار کس طرح تین بار عقد کو کھولا جا سکتا ہے، حالانکہ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ کھلنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ہمارے سنی بھائی ایک ایسی نامعقول اور کتاب وسنت کے خلاف ہونے کے علاوہ عقل اور حس کے خلاف چیز کو شرعی رنگ دیئے ہوئے ہیں، قرآن شریف نے بھی اس عقلی حقیقت کو ایک ادبی رنگ دے کر اس طرح تصریح کی ہے:

''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط فَاِنْ طَلَّقَهَافَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُحَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًاغَیْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَافَلَاجُنَاحَ عَلَیْهِمَآاَنْ یَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآاَنْ یُّقِیْمَاحُدُوْدَاللّٰهِ ط وَتِلْکَ حُدُوْدُاللّٰهِ یُبَیِّنُهَالِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ''. (229:2)

''طلاق دو مرتبہ ہے، پس یا تو انہیں بخوبی روک لیا جائے یا احسان اور نیکی کے ساتھ آزاد کر دیا جائے۔ پس اگر تیسری مرتبہ طلاق دے تو وہ اس کیلئے حلال نہیں ہے، حتیٰ کہ کسی اور شوہر کے ساتھ جماع کرے، پس اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ عقدِ جدید کے ذریعے ازدواجی زندگی کی طرف لوٹ جائیں، اگر یہ گمان کرتے ہوں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم کر سکیں گے، یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کیلئے بیان کرتا ہے''۔

مسئلہ: 586 محلل کیلئے شرط ہے کہ دوام کی نیت کے ساتھ عقد دائمی کرے، نہ یہ کہ ہم بستری کے بعد طلاق دینے کی نیت سے، تاکہ عورت پہلے شوہر پر دوبارہ حلال ہو سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی اسی کے متعلق ہے کہ:

''لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلِ لَهٗ''.

'اللہ نے حلال کرنے والے اور جس کیلئے حلال کی جائے، دونوں پر لعنت کی ہے'۔

یہ لعنت صرف اُسی صورت میں ہے کہ دُوسرا شوہر جماع کے بعد طلاق دینے کی نیت سے عقد دائمی کرے، جو درحقیقت نہ عقد دائم ہے اور نہ عقد منقطع۔ دائمی اس لئے نہیں ہے کہ اس میں ہمیشہ کیلئے اس رشتہ کی پائیداری کی نیت نہیں ہے اور موقت اس لئے نہیں کہ اس میں وقت کو معین نہیں کیا گیا جبکہ محلل کی اصلی شرط یہ ہے کہ نکاح دائمی ہو اور دائمی ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ عقد میں مدت کو مقرر نہ کیا جائے بلکہ ہمیشہ کیلئے ازدواجی زندگی کا ارادہ ضروری ہے، اگرچہ بعد میں طلاق تک نوبت پہنچ جائے۔

پہلے شوہر کیلئے عورت کو حلال کرنے کی نیت سے شادی کرنا اور طلاق دینا ایک ایسا عمل ہے جو نہ عقد دائم ہے اور نہ عقد موقت بلکہ یہ عمل زنا ہے اور زنا نہ صرف یہ کہ محلل نہیں ہے بلکہ تحریم کا سبب بھی ہے، اس لئے کہ زانیہ عورت کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے اور یہی وہ چیز ہے جو جنابِ رسولِ خدا کی لعنت کا سبب ہے ورنہ اگر صحیح طور پر نکاحِ دائمی کیا جائے اور بعد میں جائز شرعی وجوہات کی بناء پر طلاق دے دی جائے تو یہ رسولؐ اللہ کی لعنت کا باعث نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ قرآن شریف نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

مسئلہ: 587 ''حَتَّى تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ''، ''حتیٰ کہ اس کے علاوہ کسی اور شوہر سے نکاح کرے'' سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ اس شادی میں جماع کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ دُوسرے شوہر سے نکاح کرنا، نہ کہ دُوسرے ''مرد'' سے، عقد کے معنی نہیں رکھتا، اس لئے کہ شوہر بن جانے کے بعد اس کے ساتھ عقد نکاح نہیں پڑھا جاتا۔ پس دُوسرے شوہر کے نکاح سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ جماع کرے اور ''حَتَّى يَنكِحَهَا زَوْجٌ غَيْرُهُ''، ''حتیٰ کہ دُوسرا شوہر اس سے جماع کرے'' کے الفاظ اس لئے استعمال نہیں ہوئے کہ مرد کی غیرت کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ حتی الامکان ایسی طلاق سے پرہیز کرے۔

مسئلہ: 588 اس نکاح میں ضروری نہیں ہے کہ عورت کے ساتھ آگے کی طرف سے جماع کیا

جائے، اگر پیچھے سے کیا جائے یا روزہ یا احرام یا حیض ونفوس کی حالت میں جماع کیا جائے تو اگر چہ یہ سب حرام ہیں مگر اس کے باوجود ''تنکح'' ان سب پر صادق آتا ہے۔

مسئلہ: 589 طلاق کی اقسام ہیں: طلاقِ رجعی اور طلاقِ بائن۔ طلاقِ بائن کی تین اقسام ہیں:

طلاقِ بائن یا تو قطعی ہوتی ہے جس میں مرد یا عورت کسی کی طرف سے بھی رجوع کا امکان نہیں ہوتا جیسے نابالغ لڑکی کی طلاق۔ ایسی بالغ لڑکی کی طلاق جس سے جماع نہ کیا گیا ہو۔ ایسی عورت کی طلاق جو یائسہ ہو، اگر چہ اُس سے جماع کیا گیا ہو۔ تیسری اور نویں طلاق۔ ان تمام صورتوں میں طلاقِ بائن قطعی ہے اور عقدِ جدید کے بعد ہی عورت سے دوبارہ ازدواجی رشتہ جوڑا جاسکتا ہے، ماسوائے نویں طلاق کے کہ اس کے بعد عورت ہمیشہ کیلئے حرام ہوجاتی ہے اور اس سے نکاح کے ذریعے بھی ازدواجی رشتہ نہیں جوڑا جاسکتا۔

بائن غیر قطعی سے مراد طلاقِ خلع یا طلاقِ مبارات ہے۔ طلاقِ خلع اُس صورت میں ہے جب صرف عورت طلاق کی طلب گار ہو، بایں معنی کہ عورت کی نظر میں اُس مرد کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے حدودِ الٰہی کی پابندی ممکن نہیں ہے۔ طلاقِ مبارات میں مرد اور عورت دونوں طلاق کے طلب گار ہوتے ہیں اور دونوں کی نظر میں اس ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنے کی صورت میں زندگی دونوں پر بہت سخت اور حدودِ الٰہی کی پابندی ناممکن ہوجانے کا اندیشہ پایا جاتا ہو۔

قرآن مجید نے طلاق کی ان دو اقسام کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:

''وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ'' (229:2)

''اور تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو، اُس میں سے کچھ ان

سے واپس لے لو، مگر یہ کہ دونوں کو اللہ کی حدود قائم نہ کرنے کا خوف ہو تو اس صورت میں اگر عورت کوئی فدیہ دے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے'' کہ عورت کچھ مال دے کر اس ازدواجی زندگی کی قید سے آزاد ہو جائے اور دونوں حدودِ الٰہی کی مخالفت سے محفوظ رہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں صورتوں میں مرد عورت سے مہر سے زیادہ مال لینے کا حق رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ مہر سے زیادہ مال عورت سے لینا ایک بہت ظالمانہ مفت خوری ہے۔ اس ''فدیہ'' کا تعلق صرف مہر سے ہے اور اگر صرف عورت طلاق کی طالب ہو تو اس فدیہ کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہے کہ تمام مہر شوہر کو واپس کر دے۔ اگر دونوں طلاق کے خواہاں ہوں تو اس صورت میں تمام مہر واپس لینا مرد پر حرام ہے، اس لئے کہ جس طرح دونوں طلاق کا باعث بنے، مالی جرمانہ بھی دونوں کو ادا کرنا ہوگا۔ عورت مہر کا کچھ حصہ واپس کرے گی اور مرد بھی کچھ حصہ واپس لینے کا حق رکھتا ہے۔

لیکن اگر صرف مرد ہی طلاق کا خواہاں ہو، اس لئے کہ صرف اُس کی رائے یہ ہے کہ اس ازدواجی زندگی کے جاری رہنے کی صورت میں حدودِ الٰہی کو قائم رکھنا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں مرد کو عورت سے مہر کی ایک پائی بھی واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

بہرصورت ان تینوں صورتوں میں طلاق واجب ہے، اس لئے کہ ان صورتوں میں ازدواجی زندگی کے جاری رہنے سے دونوں یا کسی ایک کی طرف سے حدودِ الٰہی قائم نہ رہنے کا خوف موجود ہے۔ ازدواجی زندگی یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں شرکت صرف اُسی صورت میں جائز ہے جب شرعی احکام کی خلاف ورزی کی موجب نہ ہو۔ انہی تین صورتوں میں طلاق دینا صحیح اور واجب ہے۔

بہرصورت عورت سے کوئی چیز لینا جائز نہیں ہے، سوائے دو صورتوں کے، جن میں سے ایک یہ ہے:

''اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ''.

’’مگر یہ کہ دونوں کواللہ کی حدود قائم نہ رکھنے کا خوف ہو‘‘۔

اگر یہ خوف دونوں کو ہوتو طلاق مبارات ہوگی اور اگر صرف عورت کو ہوتو طلاقِ خلع ہوگی۔ صرف ان دونوں صورتوں میں عورت سے فدیہ لیا جاسکتا ہے۔اگر یہ خوف صرف مرد کو ہوتو طلاقِ رجعی ہوگی جس میں مرد کوطلاق کے بعد عدت کے تمام ہونے سے قبل عورت کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ اصلاح کا ارادہ رکھتا ہو۔لیکن پہلی دوصورتوں میں صرف اس صورت میں عورت کی طرف رجوع کرسکتا ہے، جب عورت اس فدیہ کو واپس لے لے جواُس نے دیا تھا۔اس طرح طلاقِ خلع یا طلاقِ مبارات،طلاقِ رجعی میں تبدیل ہوجائے گی۔

مسئلہ: 590 طلاقِ رجعی میں مرد یہ حق حاصل نہیں ہے کہ عدت کے دوران عورت کو گھر سے نکال دے اور نہ ہی عورت کو شوہر کا گھر ترک کرنے کی اجازت ہے،مگر یہ کہ ایسی ضرورت اور مجبوری پیدا ہوجائے جس کی وجہ سے عورت کے شوہر کے گھر میں رہنے سے زندگی کا درہم برہم ہونا لازم آتا ہو یا عورت کیلئے کوئی اور ایسی ضرورت پیش آجائے جس کی وجہ سے اُسے وقتی طور پر یا مستقل طور پر گھر سے باہر جانا پڑے۔البتہ کبھی کبھار معمول کی ضروریات کے پیشِ نظر گھر سے نکلنا گھر کو ترک کرنے میں شمار نہیں ہوتا بلکہ یہ تو طلاق سے پہلے بھی جائز ہے اور ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد کی حالت طلاق سے قبل کی حالت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مسئلہ: 591 اصلاح کا ارادہ رجوع میں شرط ہے،اس لئے کہ آیت کے مطابق:

’’وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا‘‘.

’’اوران کے شوہر انہیں عدت کے دوران دوبارہ ازدواجی زندگی کی طرف لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں‘‘۔(228:2)

مسئلہ: 592 رجوع کے دو پہلو ہیں:ایک قلبی اور دُوسرا عملی۔قلبی پہلو طلاق سے پہلے کی طرح ازدواجی زندگی کی طرف رجوع کا ارادہ اور نیت ہے جبکہ عملی پہلو سے مراد کوئی ایسا کام ہے جوانسان

اپنی بیوی کے ساتھ انجام دیتا ہے، مثلاً شہوت سے دیکھنا لمس کرنا اور چومنا وغیرہ۔ عقد کے برعکس رجوع میں دو عادل گواہ لینا ضروری ہے۔ چونکہ عام طور پر رجوع کے وقت گواہ لینا ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا رجوع کے بعد دو عادل گواہوں کو اپنے رجوع کی اطلاع دی جائے گی، اس لئے کہ:

"وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ". (2:65)

"اور اپنے میں سے دو عادل افراد کو شاہد قرار دو"۔

کا طلاق اور رجوع دونوں کے ساتھ یکساں تعلق ہے بلکہ طلاق کی نسبت یہ رجوع سے نزدیک تر ہے۔

مسئلہ: 593 اگر رجوع میں اصلاح کا ارادہ نہ ہو بلکہ اس سے بھی بدتر، عورت کو ایذا رسانی کیلئے رجوع کیا جائے تو اس سے عورت مرد پر حلال نہیں ہوتی اور ہر قسم کا ازدواجی عمل حرام ہے، اس حالت میں ہم بستری کرنا زنا ہے۔

مسئلہ: 594 اگر کوئی مرد ایسا کام کرے جسے عرفِ عام میں رجوع کہا جاتا ہو اور وہ اس عمل کو رجوع کی نیت کے ساتھ انجام دے تو رجوع صحیح ہے لیکن اگر رجوع کی نیت نہ رکھتا ہو تو قطعاً حرام ہے اور اگر جماع کرے تو زنا کا مرتکب ہوگا۔

بنابرایں رجوع کی تین شرائط ہیں:

1۔ نیت

2۔ رجوع کی نشاندہی کرنے والا مناسب عمل

3۔ اصلاح کا ارادہ

اگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو رجوع شرعی واقع نہ ہوگا۔

مسئلہ: 595 شرائط کے ساتھ ہم آہنگ رجوع، جو شوہر کا قطعی اور مسلّم حق ہے، کسی ذریعہ اور کسی معاہدہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ پس اگر مرد مال لے کر یا نذر، قسم یا عہد کے ذریعے اس حق کو ساقط کرے تو یہ حق ہرگز ساقط نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس کی حقیقی مصلحت:

"لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَذٰلِکَ اَمْرًا"(1:65)

"تمہیں معلوم نہیں، ہوسکتا ہے اللہ اس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت پیدا کردے"

کی تلافی کسی چیز سے نہیں کی جاسکتی اور یہ حق صرف مرد کا حق ہی نہیں جس پر سمجھوتہ ہوسکے بلکہ ایک حکم بھی ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

کلمہ "حق" جو بظاہر رجوع کو صرف شوہر کا حق قرار دیتا ہے "**لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا**" کی روشنی میں اسے حکم الٰہی بھی قرار دیتا ہے اور حکم خدا کسی صورت میں بھی قابلِ اسقاط نہیں ہے۔

مسئلہ: 596 اگر مرد دو بار اپنی بیوی کو طلاق دے اور ہر بار رجوع یا عقدِ جدید کے ذریعے اس سے ازدواجی تعلقات قائم کرے اور پھر تیسری دفعہ طلاق دے تو اس کے بعد اس سے رجوع یا عقد کے ذریعے ازدواجی رشتہ نہیں جوڑ سکتا، اس لئے کہ تیسری طلاق بائن ہے اور اس کے بعد صرف محلل کے ذریعے ہی اس سے عقد کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 597 اگر مرد نفقہ ادا کرسکتا ہو اور ادا نہ کرے یا بیوی کے ساتھ اُس کا سلوک قابل تحمل نہ ہو اور موجبِ عسر و حرج ہو یا حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کا باعث ہو تو ان تمام صورتوں میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو مرد کو مجبور کیا جائے گا کہ اسے طلاق دے۔ اگر وہ اسے بھی قبول نہ کرے تو حاکم شرع ولایتِ شرعی کی رُو سے عورت کو طلاق دے گا۔ اس طلاق میں مرد کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہے۔[1]

---

[1] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حاکم شرع اور ولایت شرعی موجود نہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے گا۔ اس مسئلہ نے شیعہ خواتین کے لئے بہت سنگین مشکلات پیدا کردی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی ایسی خواتین ہیں جن کے شوہران کے واجب یا جائز حقوق ادا نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں طلاق دیتے ہیں۔ اگر یہ خواتین عدالت کی طرف رجوع کر کے عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کرلیں تو مولوی صاحبان کہتے ہیں کہ یہ طلاق

مسئلہ: 598 اگر مرد کچھ مدت تک لا پتہ رہے اور اس کے زندہ یا مردہ ہونے کا علم حاصل کرنا بھی ممکن نہ ہو اور عورت کیلئے بھی اس حالت کا برداشت کرنا مشکل اور حرج کا سبب ہو تو حاکم شرع، ولایتِ شرعی کی رُو سے اُسے طلاق دے گا۔ مرد کے مردہ ہونے کے احتمال کی وجہ سے واجب ہے کہ عورت عدتِ وفات کو پورا کرے۔ اگر وہ زندہ ہو تو اسی عدت کے دوران عدتِ طلاق بھی تمام ہو جاتی ہے۔

درست نہیں ہے۔ آپ کسی مدرسے یا مسجد کے مولوی سے ''شرعی طلاق'' حاصل کریں۔ اگر کوئی عورت ابتداء ہی سے کسی مولوی کی ''پرائیویٹ عدالت'' سے طلاق حاصل کر لے تو اس پر وہ نکاح ثانی نہیں کر سکتی کیونکہ شوہر کی طرف سے حدود کا مقدمہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس مظلوم عورت کو حکومتی عدالت اور مولوی کی پرائیویٹ عدالت کے دوہرے عمل کی تکلیف اور اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ریاست کی قائم کردہ عدالتوں سے حاصل ہونے والی طلاق کیوں درست یا مؤثر نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب میں تین باتیں کہی جا سکتی ہیں:

1۔ چونکہ حکومت غیر شرعی ہے لہٰذا عدالتیں بھی غیر شرعی ہیں اور ان کے تمام فیصلے بھی غیر شرعی اور نا قابل قبول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دی ہوئی طلاق بھی درست نہیں ہے۔

2۔ چونکہ سرکاری عدالتوں کے جج صاحبان عادل نہیں ہیں لہٰذا ان کے فیصلے قابلِ قبول نہیں ہیں۔

3- طلاق کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان میں ہو۔ چونکہ عدالت کے ذریعے حاصل کی جانے والی طلاق عربی میں نہیں ہوتی لہٰذا یہ طلاق صحیح نہیں ہے۔

ان تین باتوں میں سے اگر پہلی بات کو صحیح مان لیا جائے کہ چونکہ حکومت غیر شرعی ہے لہٰذا عدالتیں بھی غیر شرعی ہیں اور ان کے تمام فیصلے بھی غیر شرعی اور نا قابل قبول ہیں تو پھر صرف طلاق ہی نہیں بلکہ کسی بھی معاملے میں ان عدالتوں کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔

مسئلہ:599 عدۂ رجعیہ کے دوران عورت کے تمام اخراجات مرد کے ذمہ ہیں لیکن اگر عورت احکامِ الٰہی کی اس طرح خلاف ورزی کرے جو ایک مسلمان کیلئے قابل برداشت نہ ہو تو اس صورت میں اس کے اخراجات مرد پر واجب نہیں ہوں گے۔

مسئلہ:600 اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر تھوڑی مدت کے بعد رجوع کر لے اور جماع کئے بغیر دُوسری مرتبہ طلاق دے دے اور پھر تھوڑی مدت کے بعد رجوع کر لے اور پھر ہم بستری کئے بغیر تیسری طلاق دے دے اور اس طرح ایک ماہ سے بھی کمتر مدت میں تین مرتبہ طلاق دے دے تو کیا اس تیسری طلاق کے بعد عورت عدت پوری کئے بغیر دُوسری شادی کر سکتی ہے؟ اس لئے کہ طلاق ایسی عورت کو دی گئی ہے جس کے ساتھ رجوع کے بعد جماع نہیں ہوا۔ کیا ایسی طلاق بائن بھی ہے اور عدت بھی نہیں رکھتی؟

کیا مساجد و مدارس پر دہشت گردی کے حملوں، مولوی صاحبان اور دیگر افرادِ ملت کے دہشت گردی کے حملوں میں شہید یا زخمی ہونے پر خود مولوی صاحبان ان ہی عدالتوں کی طرف رجوع نہیں کرتے؟ انہی عدالتوں سے قاتلوں اور دہشت گردوں کو پھانسی دینے کا مطالبہ نہیں کرتے؟ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ مولوی صاحبان کی درخواست پر یہ عدالتیں کسی قاتل یا دہشت گرد کو پھانسی دے دیں تو ٹھیک لیکن شوہر کی ستائی ہوئی کسی مظلوم عورت کو طلاق خلع دے دیں تو وہ ٹھیک نہیں ہے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ چونکہ ریاستی عدالتوں کے جج صاحبان عادل نہیں ہوتے لہٰذا ان کے فیصلے قابلِ قبول نہیں ہیں تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اس صورت میں بھی کسی کو کسی بھی مسئلہ میں ان عدالتوں کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہئے۔ اس معاملے کو صرف عورت کے طلاق خلع لینے تک کیوں محدود رکھا جائے۔ یہاں پر اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جہاں تک کردار کی عدالت کا تعلق ہے تو ریاستی عدالتوں کے جج صاحبان کی اکثریت مولوی صاحبان کی اکثریت سے زیادہ عادل ہے۔ اگر ان سے زیادہ نہ بھی ہو تو ان سے بدتر تو بہرحال نہیں ہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ بھی ایک نام نہاد شرعی حیلہ ہے جو ایسے افراد کی طرف سے اختیار کیا جاتا ہے جو بظاہر علمائے دین کہلاتے ہیں۔ یہاں پر پہلی طلاق کے بعد تین حیض گزرنے کے بعد ہی عورت دُوسری شادی کرسکتی ہے، اس لئے کہ پہلی طلاق سے قبل کئے گئے جماع کی وجہ سے یہ عدت ضروری ہے۔

اس طرح کم وقفوں کے ساتھ طلاق اور رجوع بھی ایک ہتھکنڈہ ہے، اس لئے کہ رجوع صرف اُس صورت میں صحیح اور واقع ہوتا ہے جب اصلاح کے ارادے سے ہو اور یہ ارادہ ان رجوعوں اور طلاقوں میں ناپید ہے۔

مسئلہ: 601 معمولی طلاق کا صیغہ ''اَنْتِ طَالِقٌ'' یا اس کا ترجمہ ہے اور طلاقِ خلع کا صیغہ ''زَوْجَتِیُ خَالَعْتُهَا عَلٰی مَابَذَلَتْ هِیَ طَالِقٌ'' یا اس کا ترجمہ ہے اور طلاقِ مبارات کا صیغہ ''بَارَاْتُ زَوْجَتِیُ عَلٰی مَابَذَلَتْ هِیَ طَالِقٌ'' یا اس کا ترجمہ ہے۔

مسئلہ:602 عقدِ منقطع والی عورت کی عدت دو حیض اور عقدِ دائم والی عورت کی عدت تین حیض اور تین طہر ہے، سوائے اُن حالات کے جن میں عدت نہیں ہے۔ تیسرے حیض کے بعد عورت اپنی عدت سے خارج ہو جاتی ہے، بشرطیکہ طلاق کے بعد اتنی مدت پاک رہے کہ اس کے بارے میں

جہاں تک طلاق کے عربی میں ہونے کا تعلق ہے تو طلاق کا عربی میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ نکاح و طلاق کا تعلق انسانی معاملات سے ہے جنہیں ان کی اپنی زبان میں انجام دینے کی مکمل اجازت ہے، ان کا عربی میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر کسی عورت کا شوہر اس کے حقوق ادا نہ کرتا ہو اور اسے طلاق بھی نہ دیتا ہو اور وہ عورت عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر لے تو یہ طلاق بالکل درست ہے اور اس کے بعد کسی مولوی سے صیغے پڑھوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصولی طور پر کسی شخص یا گروہ کو ریاست کے اندر ریاست بنانے، پرائیویٹ جہادی آرمی یا پرائیویٹ عدالت بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ (ہمدانی)

کہ ایک طہر گزر چکا ہے اور اس کے بعد اسے حیض آئے۔ دائمی طلاق کی عدت کا حکم اس آیہ شریفہ میں بیان ہوا ہے:

''وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ''.

''اور طلاق شدہ عورتیں تین قرء انتظار کریں''۔(228:2)

قرء عربی لغت میں جس طرح حیض کیلئے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح طہر کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک معنی مراد ہوتا تو اس کے مطابق لفظ کو استعمال کیا جاتا جو ''ثلاثة اطهار'' یا ''ثلثة حيض'' ہے۔

بنابرایں ''ثلاثة قروء'' سے مراد تین حیض اور تین طہر ہیں۔ پس عدت پر تین حیض کے علاوہ تین طہر کا صادق آنا بھی ضروری ہے۔ اگر طلاق کے بعد طہر کی باقی ماندہ مدت اتنی کم ہو کہ اُسے ایک طہر شمار نہ کیا جاسکتا ہو تو تیسرے حیض کے بعد والے طہر کے اتنے دن بھی عدت میں شمار کرنے چاہئیں جتنے پہلے طہر سے کم تھے، اگرچہ پہلا طہر جتنا بھی کم ہو، ظاہراً ایک طہر شمار ہوتا ہے، اس لئے کہ تین حیض کے ضمن میں تین طہر کا صدق یہاں پر واضح ہے۔

مسئلہ: 603 عقد منقطع والی عورت اور عقد دائم والی عورت دونوں کیلئے وفات کی عدت چار ماہ اور دس راتیں ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ میں ''اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرًا'' چار ماہ اور دس راتیں ہے، نہ کہ ''اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَعَشْرَةً'' چار ماہ اور دس دن۔

حاملہ عورت کیلئے طلاق کی عدت وضع حمل تک ہے، چاہے صحیح و سالم بچے کی ولادت کی صورت میں ہو یا سقطِ جنین کی صورت میں، اگرچہ جمے ہوئے خون یا نطفہ کی شکل میں ہو۔ لیکن اگر اس کا شوہر فوت ہو جائے تو اس کا عدۂ وفات چار ماہ اور دس رات یا وضع حمل میں سے وہ ہوگا جو طولانی تر ہو۔ جو عورت حیض کی عمر میں ہے لیکن کسی وجہ سے اُسے حیض نہیں آتا، اُس کی عدتِ طلاق نوے دن ہے۔

غصب

مسئلہ: 604 اگر کوئی شخص کسی مال یا حق کو بلا جواز غصب کرے تو غصب کی مدت کے دوران اُس چیز یا حق کے مالک کو پہنچنے والے نقصانات کی تلافی کرنا غاصب پر واجب ہے۔ اگر غصب شدہ مال کوئی جائز فائدہ رکھتا ہو تو وہ بھی مال کی طرح مال کے مالک کے ساتھ مختص ہے اور اگر غصب شدہ چیز چند افراد کے پاس ہو تو اگر اُن میں سے ہر ایک بطور مستقل اس میں تصرف کر رہا ہو تو ہر ایک پر اُس کی ضمانت ثابت ہے۔ اگر مشترک طور پر اس کو استعمال کر رہے ہوں تو ہر ایک، ایک معین یا غیر معین حصہ کا ضامن ہوگا۔

مسئلہ: 605 اگر غاصب غصب شدہ چیز میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا کر دے جس سے اُس کی قیمت کم ہو جائے تو اسے اس کی اصلی حالت پر لوٹانا غاصب پر واجب ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت میں جتنی کمی ہوئی ہے، اُتنی رقم اس کے مالک کو ادا کرنا واجب ہوگا۔ اگر اس میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا کر دے جس سے اس کی قیمت میں فرق نہ آئے تو اس صورت میں مالک صرف اُسے اُس کی پہلی حالت پر لوٹانے کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے، اگرچہ غاصب کو اس پر اخراجات برداشت کرنا پڑیں۔

اگر غاصب اس میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا کر دے جس سے اس کی قیمت میں اضافہ ہو جائے تو بھی مالک غاصب سے اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹانے کا مطالبہ کر سکتا ہے، بشرطیکہ مطالبہ سفیہانہ نہ ہو۔

اگر مالک اس چیز کو اسی حالت پر قبول کر لے تو غاصب اس سے زائد قیمت کا مطالبہ نہیں کر سکتا، البتہ اگر غاصب اس چیز کو مالک کی اجازت یا مطالبہ کے بغیر اس کی پہلی حالت پر لوٹا دے تو مالک اس سے ضائع شدہ زائد قیمت کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس لئے کہ یہ اضافہ اس کے اپنے مال میں ہوا ہے جس پر غاصب کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

مسئلہ: 606 اگر کوئی شخص غصبی زمین پر کوئی ایسی عمارت کھڑی کر دے یا زراعت یا شجرکاری

یا کوئی اور کام کرے اور مالک اس پر راضی نہ ہو تو زمین کو پہلی حالت پر لوٹانا غاصب پر واجب ہے اور غصب کی مدت کا کرایہ بھی اس کے ذمہ ہے۔ اگر مالک زمین کو اسی حالت پر قبول کرنے پر راضی ہو جائے تو غاصب اس سے کسی چیز کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتا اور صرف اپنی ان اشیاء کو، جو اس زمین میں ہیں، اُٹھا سکتا ہے، بشرطیکہ اس سے زمین پر کوئی نقصان وارد نہ ہو اور اگر مالک اس تصرف کی اجازت بھی نہ دے تو غاصب یہ حق بھی نہیں رکھتا۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غاصب کو اپنی اشیاء لینے کی اجازت نہ دینا مفت خوری نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب منفی ہے، اس لئے کہ غاصب نے خود اپنے مال کو اس حالت تک پہنچایا ہے اور اس روایت کی رُو سے کہ 'اَلْغَاصِبُ یُؤْخَذُ بِاَشَدِّ الْاَحْوَالِ' غاصب کا شدید ترین مواخذہ کرنا چاہیئے تا کہ لوگوں کا حق بھی محفوظ رہے اور غاصب بھی آئندہ کسی کا مال غصب کرنے کا خیال اپنے ذہن میں نہ لائے۔

میراث

مسئلہ: 607 جس طرح ہر انسان اپنی زندگی میں اپنے اقرباء کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کو موت کے بعد وراثت کی صورت میں مقرر کر دیا ہے کہ اس کے اموال کو عادلانہ طور پر اس کے اقرباء کے تین طبقات میں تقسیم کر دیا جائے۔ چونکہ تمام ورثاء کا حصہ برابر نہیں ہے اور بعض اقرباء ضرورت مند ہونے کے باوجود میراث میں حصہ دار نہیں ہوتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مال کے ایک تہائی حصہ میں مال کے مالک کو وصیت کرنے کا حکم دیا ہے تا کہ وہ اسے عادلانہ وصیت کے ذریعے ضرورت مند اقرباء میں تقسیم کرے۔ اس طرح ورثاء کو بھی حکم دیا ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر موجود اُن افراد کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیں جو میراث میں حق نہیں رکھتے۔

'وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنُ

فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْالَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا'

'اور جب تقسیم کے وقت اقرباء اور یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو انہیں اس میں سے ان کی شان کے مطابق اپنے امکانات کے پیش نظر کچھ دو اور ان سے اچھی بات کرو' (8:4)۔

شوہر اور بیوی، ورثاء کے تینوں طبقات کے ساتھ میراث میں شریک ہیں اور کسی بھی حالت میں ایک دُوسرے کی میراث سے محروم نہیں ہوتے، سوائے بعض استثنائی حالات کے، جیسے قاتل یا کافر ہونے کی صورت میں۔

اب چند ایسے مسائل پیش کئے جاتے ہیں جن میں ہمیں دُوسرے فقہاء سے اختلاف ہے:

مسئلہ: 608 مرد کو عورت کی میراث میں سے نصف یا ایک چوتھائی ملتا ہے جبکہ عورت کو مرد کی میراث میں سے ایک چوتھائی یا آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ بالفاظِ دیگر عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے۔ یہاں پر یہ سوال زیرِ غور آتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ عورت کا یہ ناچیز حصہ، خصوصاً اگر مرنے والے کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، دیتے وقت اُسے زمین اور زمین کی قیمت سے محروم کر دیا جائے؟ حالانکہ عام طور پر میراث کا زیادہ تر حصہ زمین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس مثال پر غور کریں:

اگر ایک مرد کی میراث بیس لاکھ ہے جس میں سے دس لاکھ کی زمین ہے اور دس لاکھ کی دُوسری اشیاء۔ یہ مرد چار بیویاں رکھتا ہے اور صاحبِ اولاد بھی ہے۔ اس کی بیویاں زمین سے حصہ نہیں پائیں گی جو دس لاکھ کی ہے۔ باقی ماندہ دس لاکھ کا آٹھواں حصہ ان چار بیویوں میں تقسیم ہوگا یعنی ہر ایک کو دس لاکھ کا بتیسواں حصہ ملے گا جو شوہر کی کل میراث کا 1/64 حصہ ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی صاحبِ اولاد عورت کی میراث دس لاکھ ہو تو اس کا شوہر اس کی میراث کا 1/4 حصہ پائے گا۔ کیا اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے؟

زمین اور زمین کی قیمت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے صرف عمارتوں اور دُوسری اشیاء کی قیمت میں

عورت کو وارث قرار دینا قرآن شریف کی نص کے خلاف ہے۔ جس طرح مرد کیلئے عورت کا ''مَـــــاتَـــرَکَ'' (ترکہ) عورت کے تمام اموال پر مشتمل ہے، اسی طرح عورت کیلئے مرد کا ''مَاتَرَکَ'' (ترکہ) مرد کے تمام اموال پر مشتمل ہے۔

اگر عورت کا 1/4 یا 1/8 حصہ جو ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں اور بھی کم ہو جاتا ہے، اگر زمین اور اس کی قیمت کو ظالمانہ طور پر مستثنیٰ کرنے کے بعد مزید کم ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں آیاتِ میراث میں چار مرتبہ قرض اور وصیت کے استثناء کا ذکر زیادہ مناسب تھا یا زمین کے استثناء کا؟ حالانکہ قرض اور وصیت کا استثناء دُوسری آیات میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ اگر آیاتِ میراث میں ان کا استثناء مذکور نہ ہوتا تو بھی اس بارے میں کوئی اجمال اور ابہام باقی نہ ہوتا۔ لیکن مرد کی میراث میں سے عورت کو زمین سے محروم کرنے والا یہ استثناء نہ ان آیات میں بیان ہوا ہے نہ قرآن شریف کی دُوسری آیات میں۔

یہ ایک ایسی چیز کو مبہم رکھنے کے مترادف ہے جس کا ذکر کم از کم ایک بار تو ضروری تھا، حالانکہ وصیت اور قرض کے استثناء کا ذکر ضروری نہ ہونے کے باوجود چار مرتبہ:

''مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ'' (11:4).

جیسے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

بنابریں قرآن کی نص کی رُو سے عورت کی نسبت مرد کا 'مَـاتَرَکَ' مرد کی نسبت عورت کے ''مَاتَرَکَ'' کی مانند ہے اور ہرگز قابل استثناء نہیں ہے۔ اگر اس استثناء پر دلالت کرنے والی روایات بھی موجود ہوں تو نص قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے ہرگز قابل قبول نہ ہوں گی اور ایسی روایات جو آیات کے خلاف نہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول ہوں، موجود نہیں ہیں۔

عورت کو زمین سے محروم کرنے والے فتاویٰ کی بنیاد جن روایات پر ہے، اُن میں سے ایک روایت یہ ہے کہ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ عورت صرف فرعی اموال سے

کیوں میراث پاتی ہے اور اصلی اموال میں سے کیوں نہیں پاتی ؟ آپؑ نے جواب میں فرمایا: اس لئے کہ عورت شوہر کے نسب میں داخل نہیں ہے جو اصلی رشتہ ہے۔ لہٰذا اصلی اموال سے میراث بھی نہیں پاتی۔

اس روایت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ مرد بھی تو عورت کے اصلی رشتہ نسب میں داخل نہیں ہے، پھر وہ کیوں اس کے اصلی اور فرعی اموال سے میراث پاتا ہے؟

ایک روایت میں راوی کے مندرجہ بالا سوال کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ عورت دُوسری شادی کر لے اور اپنے دُوسرے شوہر کے ساتھ پہلے شوہر سے میراث میں پائے گئے گھر میں آ کر رہنے لگے اور دُوسرے ورثاء کے لئے پریشانی کا باعث ہو۔

اس حدیث کی منطق کی رُو سے شوہر کو عورت سے بھی زیادہ محروم ہونا چاہئے، اس لئے کہ بیوی کے مرنے کے بعد دُوسری شادی کا رجحان مردوں میں زیادہ پایا جاتا ہے جبکہ شوہر کے مرنے کے بعد دُوسری شادی کا رجحان عورتوں میں کم پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں غصب کرنے اور پریشانی پیدا کرنے کی قوت عورت کی نسبت مرد میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ بنا بریں مرد کو یا تو سرے سے عورت کی زمین اور رہائشی مکان سے میراث نہیں ملنی چاہئے یا کم از کم اسے بھی عورت کی طرح ان سے محروم ہونا چاہئے۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ہمارے شیعہ فقہاء نے ان خلافِ قرآن روایات کو اس لئے فتویٰ کی بنیاد قرار دیا ہے کہ یہ اہل سنت کے فتاویٰ کے خلاف ہیں جو اگرچہ قرآن کے مطابق ہیں، حالانکہ روایات میں پہلی ترجیح قرآن شریف کے ساتھ موافقت ہے، نہ کہ اہل سنت کے ساتھ مخالفت، جس کی وجہ سے اہل سنت کے موافق روایت کو موافق قرآن ہونے کے باوجود اہل سنت کے موافق ہونے کے جرم میں ترک کر دیا جائے اور ان دو روایات کو، جو قرآن کے علاوہ عقل کے بھی خلاف ہیں، صرف اس لئے قبول کر لیا جائے کہ اہل سنت کے مخالف ہیں۔

اس عجیب وغریب فتویٰ کے سبب بعض اوقات سنی مردوں کی شیعہ بیویاں ان کی زندگی میں یا اُن کی موت کے بعد سنی ہوجاتی ہیں تا کہ اپنے شوہر کے تمام اموال سے میراث لے سکیں۔

یہ کیسی فقہ ہے جو قرآن شریف سے اس قدر بیگانہ ہے کہ اس میں قرآن شریف کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا جس کا نتیجہ ایسے رُسوا اور رُسوا کن فتاویٰ کی صورت میں ہم دیکھ رہے ہیں۔

یہاں یہ سوال ذہنوں میں اُبھر سکتا ہے کہ میراث میں عورتوں کا حصہ مردوں کے حصہ سے کمتر کیوں ہے اور اگر عورتیں زیادہ ہوں تو کم اور کمتر ہوتا چلا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس حقیقت کو مدِ نظر رکھا جائے کہ عام طور پر مرد زندگی کے تمام شعبوں مین خرچ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن عورتیں عام طور پر لینے والی ہوتی ہیں، لہٰذا یہ نصف بھی ان کیلئے زیادہ ہے اور مرد جو بظاہر عورتوں سے دوگنا لیتا ہے، یہ دوگنا بھی اُس کیلئے کم ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میراث میں عورتوں کا حصہ عام طور پر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

جہاں تک ایک سے زیادہ بیویوں کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ بھی اس حقیقت کے پیش نظر قابل فہم ہے کہ تعدادِ ازواج بذاتِ خود دولت کی تقسیم کا ایک ذریعہ ہے۔ جب تک مرد ایک سے زیادہ بیویوں کی کفالت نہ کرسکتا ہو، اُسے ایک سے زیادہ بیویاں اختیار کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ بنابراین اگر بعض مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں تو ان کی مالی قوت بھی اُتنی ہی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ ان کی ضروریات کو پورا کرسکیں۔ یوں میراث میں سے ان عورتوں کا حصہ ایک عورت کے حصہ سے کمتر نہیں ہوگا۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص چالیس لاکھ کی جائیداد کا مالک ہو اور چار بیویاں رکھتا ہو تو اس کی مالی قوت اس شخص کی نسبت زیادہ ہوگی جو دس لاکھ کی جائیداد اور ایک بیوی رکھتا ہے۔ اس طرح پہلے شخص کی چار بیویوں میں سے ہر ایک پہلے شخص کی بیوی کے برابر میراث پائے گی بلکہ بعض اوقات

ان کا حصہ اس ایک سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے، اس لئے کہ مرد چار سے زیادہ بیویاں اختیار کرنے کا ہرگز حق نہیں رکھتا۔

مذکورہ بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میراث کی تقسیم میں عورتوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں برتی گئی بلکہ ان کا حصہ درحقیقت مردوں کے حصے سے زیادہ ہے۔ البتہ زمین سے محرومیت کا جو ظلم ان پر ہوتا ہے، اس کا اللہ کے حکم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسئلہ: 609 آیہ شریفہ:

"يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ". (11:4)

"اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے"۔

مرنے کے بعد میراث کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ بات ایک ضمنی اور فرعی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مردے کو امر ونہی نہیں کرتا کہ اُسے موت کے بعد اُس کی اولاد کے بارے میں احکامات صادر کرے بلکہ آیہ شریفہ ایک عام قانون کی حیثیت سے یہ بیان کر رہی ہے کہ والدین کے اموال میں اولاد کا حصہ اس طرح ہے:

"لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ". (11:4)

"بیٹے کیلئے دو بیٹیوں کے حصہ کے برابر ہے"۔

والدین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ زندگی میں اس قاعدہ کی خلاف ورزی کریں مگر بعض استثنائی حالات میں جہاں عدالت وحکمت کا تقاضا یہ ہو کہ بیٹے اور بیٹی کو برابر یا بیٹی کو بیٹے سے زیادہ دیا جائے۔

بنابرایں اولاد کو ہدایا اور تحائف دیتے وقت بھی: "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" کی پابندی اسی طرح ضروری ہے جس طرح میراث میں۔ اگر کہیں کوئی کمی یا نقص بیٹے یا بیٹی کے متعلق رُونما ہو تو جس طرح موت کے بعد ایک تہائی مال اس قسم کی کمی اور نقص کی تلافی کیلئے میّت سے مختص

ہے، شاید یہ کہ ایک تہائی یا اس سے بھی زیادہ زندگی میں رُونما ہونے والی کمی اور حاجت مندی کو پورا کرنے کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔ بہر حال ایک تہائی مال زندگی میں اور موت کے بعد اولاد کی ضروریات اور کمی کو پورا کرنے کیلئے کافی ہے۔

مسئلہ: 610 ولدالزنا بھی حلال اولاد کی طرح والدین سے میراث پاتا ہے، وہ بھی اس سے میراث پاتے ہیں، اس لئے کہ ''اولادکم'' میں یہ بھی حلال اولاد کی طرح داخل ہے۔ قاعدہ ''اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ حَجَرٌ'' یعنی ''بچہ عورت کے شوہر کا ہے اور زانی کیلئے پتھر ہے''، صرف وہاں نافذ ہوتا ہے، جہاں معلوم نہ ہو کہ بچہ زنا سے پیدا ہوا ہے یا حلال سے۔

لیکن جہاں یہ بات واضح اور معلوم ہو کہ یہ بچہ حرام کا ہے، وہاں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ اگر ایسی صورتِ حال رُونما ہو جائے کہ کسی عورت کے رحم میں کسی مرد کا نطفہ حلال یا حرام ذریعہ سے داخل ہو جائے تو یہاں بھی حلال اولاد اور وَلَدُ الشُّبْهَه کی مانند توارث برقرار ہوگا۔ بہر صورت جس بچہ کے والدین یا اُن میں سے کوئی ایک معلوم ہو تو اُن کے اور بچے کے درمیان توارث جاری ہے یعنی ایک دُوسرے سے میراث لے سکتے ہیں، چاہے بچہ حلال کا ہو یا شبہ کا یا حرام کا، چاہے زنا سے ہو یا عورت کے رحم میں از راہِ حرام نطفہ داخل کرنے سے۔

مسئلہ: 611 آیہ شریفہ:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ

''اور اللہ کی کتاب میں بعض قرابت دار بعض پر مقدم ہیں'' (75:8)

کی رُو سے اگر کسی کی ایک بیٹی سے زیادہ اولاد نہ ہو تو اس کے ترکہ کا نصف اُس بیٹی کو اُس کے مقرر کردہ حصہ کے طور پر ملے گا اور باقی نصف بھی اُسے ہی ملے گا، اس لئے کہ وہی میّت کے سب سے نزدیک ہے۔ دُور کے رشتہ دار باقی ماندہ نصف میں کوئی حق نہیں رکھتے۔ البتہ اگر میّت کی بیوی یا شوہر موجود ہو تو باقی ماندہ نصف میں سے اس کا حصہ اس کو دے کر باقی اُس کی بیٹی کو دے دیا جائے گا۔

مسئلہ:612 قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دُور کے رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے، مثلاً سگے بھائی کی موجودگی میں سوتیلے بھائی کو میراث میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ البتہ اگر سگا بھائی نہ ہوتو اس صورت میں ماں کی طرف سے سوتیلے بہن بھائی اور باپ کی طرف سے سوتیلے بہن بھائی میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں برابر کے رشتہ دار ہیں۔

اسی طرح پوتے اور نواسی، دادا، دادی سے یا نانا، نانی سے میراث نہیں پا سکتے۔ اگر ان کی ماں یا باپ موجود ہوں جو دادا یا نانا کے وارث ہیں۔

اسی طرح دُوسرے تمام حالات میں جہاں قریبی موجود ہوں، وہاں دُور کے رشتہ دار کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا۔ اس مسئلہ پر مختلف احادیث میں سے انہی احادیث کو قبول کیا جائے گا جو آیہ شریفہ ''اولوا الارحام'' کے مطابق ہیں۔ چونکہ اس قرابت داری میں فقط نسبی قرابت داری ہی معیار ہے، لہٰذا غیر نسبی قرابت پر یہ حکم جاری نہیں ہوگا۔

مسئلہ:613 اس نسبی قرابت داری کی بنیاد پر بیٹے یا بیٹی کی موجودگی میں پوتے یا نواسے کو میراث میں سے حصہ نہیں ملتا۔ اسی طرح سگے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کے ہوتے ہوئے سوتیلے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

یہ وہ مسائل تھے جن میں ہمارے اور دُوسرے فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ظاہراً باقی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

وصیت

مسئلہ:614 وصیت کے عام معنی سفارش کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ خاص سفارش ہے جو انسان اپنی موت کے بعد بعض کاموں کو انجام دینے کیلئے کرتا ہے۔ چونکہ موت کے بعد کی حالت زندگی کی حالت کا استمرار ہے، لہٰذا جس طرح ایک مسلمان پر اُس کی زندگی میں اُس کے اقرباء اور دُوسروں کی نسبت جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مرنے کے بعد بھی انہیں وصیت کے

ذریعے حتی الامکان انجام دینا واجب ہے۔یعنی اگر وہ کوئی مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو جس طرح زندگی میں اس پر والدین اور دُوسرے قریب تر رشتہ داروں کے متعلق کچھ مالی فرائض عائد ہوتے تھے،موت کے بعد بھی ان کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ ورثاء کی جو مالی ضروریات میراث سے پوری نہیں ہوتیں،اُن کی تکمیل کیلئے ایک تہائی مال سے ان کیلئے وصیت کرے۔ جو رشتہ دار اس کی میراث سے حصہ دار نہیں ہیں،اُن کیلئے بھی وصیت کرے۔خود وارثوں پر بھی واجب ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر حاضر رشتہ داروں،یتیموں اور مسکینوں کو اپنے حصہ سے کچھ نہ کچھ ضرور دیں :

'وَاِذَاحَضَرَالْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْالَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا'

'اور جب تقسیم کے وقت اقرباء اور یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو انہیں اس میں سے ان کی شان کے مطابق اپنے امکانات کے پیشِ نظر کچھ دو اور ان سے اچھی بات کرو' (8:4)۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں اللہ نے وصیت کے وجوب کی تصریح فرمائی ہے:

''كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَاحَضَرَاَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَانِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ'' (180:2)

''تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آجائے تو اگر وہ مال چھوڑ رہا ہو تو اپنے والدین اور اقرباء کے متعلق معروف کے مطابق وصیت کرے کہ یہ متقین کے ذمہ ایک حق ہے''۔

اس آیہ شریفہ میں پہلے طبقہ کے ورثاء کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔اگر میراث میں سے ان کا حصہ ان کی ضروریات کیلئے کافی ہو تو دُوسرے ضرورت مند رشتہ داروں کا حق ہے کہ ان کیلئے وصیت کی جائے۔ ان کے بعد ان کا حق ہے جو میراث نہیں پاتے۔ورثاء پر بھی واجب ہے

کہ ”وَاِذَاحَضَرَ الْقِسْمَہ“ کی رُو سے اپنے حصہ میں سے انہیں کچھ دیں، جیسا کہ اُوپر مذکور ہو چکا ہے۔

وصیت کے متعلق آیہ شریفہ نے مال کی حد معین نہیں کی۔ روایات کی روشنی میں اس کی حد ایک تہائی مال مقرر ہوئی ہے۔ میراث کی آیت میں اسے قرض کے ہمراہ چار مرتبہ ”مَاتَرَکَ“ سے مستثنٰی کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرض کی صرف ادائیگی ضروری ہے جبکہ وصیت میں ادائیگی کے علاوہ اس کا وجود بھی ضروری ہے، اس لئے:

”مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِیْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ“(11:4).

کی رُو سے اگر کوئی شخص قابل توجہ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو وصیت اُس پر واجب ہے۔

مسئلہ: 615 وصیت موت کے وقت ہی واجب ہے اور باقی حالات میں مستحب ہے۔ موت کے وقت سے مراد وہ وقت ہے جب موت کی علامات ظاہر ہونے لگیں، اگر چہ موت یقینی نہ ہو، اس لئے کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں وقت اُس کی موت واقع ہو جائے گی۔ ایسا بھی ہوتا رہتا ہے کہ انسان موت کے منہ میں جا کر لوٹ آتا ہے۔ اس کے برعکس موت کی علامات رُونما ہوئے بغیر اچانک لقمہ اجل بن جانے والوں کی مثالیں بھی کم نہیں ہیں۔

بنابرایں ”اِذَاحَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ“ سے وہ وقت مراد ہے جب موت کی علامات ظاہر ہونے لگیں، اگر چہ موت کا وقوع یقینی نہ ہو۔ نیز یہ بھی واضح ہے کہ اس سے مراد جان کنی کا وقت بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اس وقت انسان موت سے دست بگریباں ہوتا ہے اور کسی قسم کا کام انجام دینا اُس کیلئے ممکن نہیں ہوتا۔

مسئلہ: 616 وصیت کا تعلق صرف مال ہی سے نہیں بلکہ حق سے بھی ہے، مثلاً یہ وصیت کرے کہ فلاں شخص اس کے بچوں کا قیم اور سرپرست ہو، اس لئے کہ ”اِنْ تَرَکَ خَیْرًا“ میں مال اور حق دونوں آجاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ کسی کو وصیت پر عمل کرنے کیلئے وکیل مقرر کرے جسے وصی بھی کہتے

ہیں، اس لئے کہ جس طرح وصیت کرنے والا اپنی زندگی میں اپنے اموال کا مالک تھا اور کسی کو اپنے اموال میں نمائندہ یا وکیل مقرر کرنے کا حق رکھتا تھا، اسی طرح اب بھی ان اہم اُمور کیلئے، جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، کسی ایک یا چند قابل اعتماد افراد کو اپنی وصیت پر عمل کرنے اور اپنے بچوں اور ان کے اموال کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے۔

مسئلہ: 617 دُوسرے تمام معاہدوں کی مانند وصیت کیلئے بھی کسی خاص لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ تحریر، عمل یا واضح اشارہ، جو بھی وصیت پر واضح دلالت کرتا ہو، کافی ہے۔ ہر وہ کام، تحریر یا اشارہ، جو وصیت پر دلالت کرے، اُسے ''وصیت'' کہتے ہیں۔

وصیت کی اہمیت کے پیش نظر اس کا واضح اور نا قابل انکار ہونا ضروری ہے۔ پس یا تو وصیت اتنے افراد کی موجودگی میں ہو جن کی گواہی سے ہر قسم کے شکوک وشبہات زائل ہو جائیں یا دو عادل افراد کو وصیت پر شاہد قرار دے یا دو عادل اس کی وصیت پر دلالت کرنے والے عمل یا اشارہ یا تحریر کی اس طرح گواہی دیں کہ اس میں شک وتردید کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے یا اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا طریقہ جو شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کو روک سکتا ہو، اختیار کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ: 618 دُوسرے تمام معاہدوں کی مانند وصیت کو بھی نا قابلِ تاویل ہونا چاہئے۔ اس میں کم اور زیادہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اگر زیادہ مال کی وصیت کی جائے تو لفظ ضروری ہے اور اگر کم مال کے متعلق ہو تو اشارہ کافی ہے بلکہ وصیت چاہے کم مال کے متعلق ہو یا زیادہ مال کے متعلق، اسے ضرور صریح، واضح و نا قابلِ تاویل ہونا چاہئے۔

مسئلہ: 619 وصیت کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ سمجھدار ہو۔ بنابرایں دیوانہ، سفیہ اور غیر سمجھدار بچہ اگر وصیت کریں تو ان کی وصیت درست نہیں ہے۔ صرف عادلانہ اور عاقلانہ وصیت ہی درست ہے، اگرچہ وصیت کرنے والا نابالغ ہو۔ غیر عاقلانہ اور غیر عادلانہ وصیت درست نہیں ہے، اگرچہ وصیت کرنے والا بالغ اور سمجھدار ہو، اس لئے کہ ''بالمعروف'' کی رُو سے ہر صحیح اور مناسب

وصیت درست اور نافذ ہے اور ہر غیر معروف اور غیر موزوں وصیت درست نہیں ہے اور نافذ بھی نہیں ہے۔

مسئلہ: 620 اگر کوئی شخص خودکشی کرے تو اُس کی وصیت بھی دُوسروں کی وصیت کی مانند صحیح اور نافذ ہے، اس لئے کہ وہ "اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ" کا واضح ترین نمونہ اور مصداق ہے۔ ایسے مجرم کو دُوسروں کی نسبت وصیت کی زیادہ ضرورت ہے تا کہ واجباتِ وصیت کو انجام دے کر اپنا گناہوں کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ بنابرایں وہ حدیث جو اس شخص کو وصیت کرنے کے حق سے محروم کر رہی ہے، ہرگز قابل قبول نہیں ہے، اس لئے کہ یہ شخص آیت کے اطلاق کا واضح ترین مصداق ہے اور ایسی واضح آیت کو ایک یا چند احادیث کے ذریعے مقید نہیں کیا جا سکتا، وہ بھی ایسی حدیث سے جس کا مضمون غلط ہے، اگر چہ اُس کی سند صحیح ہے [1]۔

"قال سمعت اباعبداللّٰه عليه السلام يقول من قتل نفسه متعمدافي نار جهنم خالدافيهاقيل له ارايت ان كان اوصى بوصيته ثم قتل نفسه متعمدامن ساعته تنفذ وصيته؟قال:فقال ان كان اوصى قبل ان يحدث حدثافي نفسه من جراحته اوفعل لعله يموت لم تجزوصيته".

"راوی نے کہا کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص عمداً خودکشی کرے تو وہ طویل مدت تک جہنم میں رہے گا۔ پوچھا گیا کہ اگر وہ وصیت کرنے کے بعد خودکشی کرے تو کیا اس کی وصیت نافذ ہوگی؟ آپؑ نے فرمایا کہ اگر خودکشی سے پہلے وصیت کرے اور پھر اپنے آپ کو زخمی کرے یا کوئی اور ایسا کام کرے تا کہ مر جائے تو اُس کی وصیت نافذ نہیں ہے"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُس کی وصیت کے نافذ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خودکشی کی وجہ سے جہنمی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ دُوسرے فرض کے مطابق خودکشی وصیت

مسئلہ: 621 جب موت کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو لوگوں کی امانتیں اور قرض جلد از جلد ادا کرنا واجب ہے یا انہیں اطلاع دے تاکہ وصول کرلیں یا انہیں ادا کرنے کی وصیت کرے۔

مسئلہ: 622 اگر امانت یا قرض کی ادائیگی کا وقت آن پہنچا ہو تو ان کے متعلق وصیت کرنا کافی نہیں ہے بلکہ حتی الامکان انہیں خود ادا کرنے کی کوشش کرے۔

مسئلہ: 623 جب موت کا وقت قریب ہونے لگے تو تمام حقوق اللہ اور حقوق الناس، جو اُس کے ذمہ ہیں، ان کا حساب کرے اور ان کے متعلق مناسب اقدام کرے، مثلاً اگر خمس، زکوٰۃ، کفارات، دیات اور صدقاتِ واجب یا نماز، روزہ اور حج کی قضا اس کے ذمہ ہو تو حتی الامکان انہیں انجام دے۔ اگر ممکن نہ ہو تو کسی قابل اعتماد شخص کو ان کے متعلق وصیت کرے۔ لیکن اگر حج یا دُوسری مالی ادائیگیوں کے متعلق وصیت کرے تو اس کے ایک تہائی مال سے ورنہ اصل مال سے ادا کی جائیں گی، اس لئے کہ ''من بعد وصیۃٍ'' وصیت سے متعلق زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کو مستثنیٰ کر رہی ہے، 'اَوْ دَیْـنٍ' اس کے تمام قرضے کو شامل ہے، چاہے حقوق اللہ سے ہوں یا حقوق الناس سے۔ نماز و

کے بعد انجام پائی ہے اور پہلے فرض کے مطابق بھی اگرچہ خودکشی کرنے والا جہنمی ہے لیکن اس کے باوجود مسلمان ہے۔ اگر خودکشی کی وجہ سے وہ کافر بھی ہو جائے تو بھی یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آیا کافر مسلمان کیلئے میراث نہیں چھوڑتا؟ پھر اُس کی وصیت کیوں اس کے بارے میں نافذ نہ ہو؟ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ خودکشی کرنے والا سفیہ ہے اور سفیہ کی وصیت نافذ نہیں ہوتی۔ اس خیال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کی وصیت بھی سفیہانہ ہو تو اس صورت میں تو یہ بات درست ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی وصیت عاقلانہ ہو اور وہ اس وصیت کے ذریعہ اپنے گناہ کی کسی حد تک تلافی کرنا چاہتا ہو تو وہ کیوں وصیت کرنے کے حق سے محروم ہو؟ اس کی یہ محرومیت خود اس کیلئے نقصان دہ ہونے کے علاوہ اُن لوگوں کیلئے بھی مضر ہے جن کے بارے میں وصیت کی جاتی ہے۔ ان کو اور دُوسرے پسماندگان کو اس کی خودکشی کا خمیازہ کیوں اُٹھانا پڑے جبکہ ''لاتزر وازرۃ وزر اخری''، ''کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھاتا''۔

روزہ کا اس میں داخل ہونا معلوم نہیں ہے، اس لئے یہ مالی فرائض میں سے نہیں ہیں۔ اگر وہ ان کے بارے میں وصیت نہ کرے تو اس صورت میں ورثاء پر ان کی ادائیگی کیلئے اجیر لینا کسی دلیل کی رُو سے واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 624 میّت کے نماز اور روزہ کی قضا کا اس کے بڑے بیٹے پر واجب ہونا ثابت نہیں ہے اور نہ ہی یہ ثابت ہے کہ باپ کے استعمال کی بعض خاص چیزیں بڑے بیٹے کا حق ہیں، اس لئے کہ ان دونوں سے متعلق نصوص میں تعارض پایا جاتا ہے جو انہیں بے اثر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اس خلافِ قاعدہ حکم کو ان سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

مسئلہ: 625 اگر کسی نے کوئی مال کسی جگہ چھپا کر رکھا ہو تو موت کے وقت ورثاء کو اس کی اطلاع دے۔ اگر چھوٹے بچوں کے حق کے ضائع ہونے کا خوف رکھتا ہو تو کسی قابل اعتماد اور صالح شخص کو ان کا سرپرست مقرر کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: 626 اگر دو یا چند افراد کو اپنا وصی مقرر کرے تو واجب ہے کہ وہ ایک دُوسرے سے مشورہ اور ہم آہنگی کے ساتھ وصیت پر عمل کریں۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک کو مستقل وصی قرار دے تو ان میں سے جو بھی وصیت پر عمل کرے تو دُوسرے اُس کی مخالفت کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

مسئلہ: 627 وصی کیلئے ضروری ہے کہ قابل اعتماد ہو اور سفیہ، نا اہل اور اُمور سے جاہل نہ ہو۔ وصی کیلئے مسلمان ہونا ضروری ہے مگر یہ کہ وصیت کرنے والا خود بھی غیر مسلم ہو یا جس شخص کے بارے میں وصیت کی جا رہی ہو، وہ غیر مسلم ہو۔

مسئلہ: 628 چونکہ وصیت کی بنیاد وصیت کرنے والے کی صوابدید اور جس شخص کے بارے میں وصیت کی جا رہی ہے، اُس کا مفاد اور مصلحت ہے، لہٰذا وصیت کرنے والا اپنی وصیت کو کالعدم یا تبدیل کر سکتا ہے، بشرطیکہ تبدیلی ظالمانہ نہ ہو، اس لئے کہ آیہ شریفہ کی رُو سے:

''فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ

عَلَيۡهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‘‘۔(182:2)

’’پس جو وصیت کرنے والے کی طرف سے کجی اور گناہ سے خائف ہو اور ان میں اصلاح کردے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے‘‘۔

جس طرح انسان کی زندگی میں ضروری ہے کہ وہ اپنے مال میں عاقلانہ اور مصلحت اندیشی کے پیش نظر تصرف کرے اور اس کا ظالمانہ، گناہ سے آلودہ اور سفیہانہ تصرف جائز نہیں ہے، اس کی وصیت کو بھی، جو اُس کی زندگی کے دَور کے فرائض کا استمرار ہے، مصلحت اندیشی اور عدالت پر مبنی ہونا چاہئے۔

پس اگر اس کے وارث ضرورت مند ہوں اور اس کے باوجود وہ اپنے ایک تہائی مال کو کسی اور شخص کو دینے یا کسی اور کام پر صرف کرنے کی وصیت کرے اور اس سے ورثاء کو نقصان پہنچے تو یہ وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ جَنَفَ اور اِثْم کی رُو سے اس وصیت کو نظر انداز کر دیا جانا ضروری ہے۔

مسئلہ:629 شرعی شرائط کی رُو سے صحیح وصیت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کرنا حرام ہے اور ان پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ:

’’فَمَنۡ بَدَّلَهٗ بَعۡدَمَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ‘‘.(18:1)

’’پس جس نے اسے سننے کے بعد اس میں تبدیلی کی تو اُس کا گناہ ان پر ہے جو اسے تبدیل کریں‘‘۔

مسئلہ:630 وصیت میں وصی کا قبول کرنا شرط نہیں ہے۔ اگر وہ رد کر دے تو صرف اس صورت میں وصیت باطل ہو جاتی ہے۔ بنابر ایں اگر کسی شخص کو وصی قرار دیا جائے اور اسے اس کی اطلاع بھی دے دی جائے اور وہ رد نہ کرے تو یہ وصیت نافذ اور وہ شخص وصی ہوگا۔ اگر رَد کر دے تو باطل ہو جائے گی۔ لیکن اگر وصی اس وقت رد کرے جب وصیت کرنے والا مر چکا ہو یا زندہ ہو لیکن کسی اور کو وصی مقرر کرنے کا امکان باقی نہ ہو تو اس صورت میں وصی کو رد کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر خود

وصیت پر عمل کرنے کی صلاحیت یا امکان نہ رکھتا ہو تو کسی کو اپنا نائب مقرر کرے۔

مسئلہ: 631 اگر کسی مال کو کسی شخص یا اشخاص کو دینے کی وصیت کرے، چاہے اس وصیت میں انہیں اس مال کا مالک قرار دے یا وصیت کرے کہ انہیں اس کا مالک بنا دیا جائے تو ایسی صورت میں اگر وہ لوگ اسے رد نہ کریں تو یہی وصیت کے نافذ ہونے کیلئے کافی ہے۔ اگر وہ اسے رد کر دیں تو یہ مال بھی مال الارث میں شمار ہوگا اور احکامِ میراث کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

مسئلہ: 632 وصیت میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ وصیت خلافِ شرع اور غیر منصفانہ، سفیہانہ، مصلحت کے خلاف یا ورثاء کیلئے نقصان دہ ہو۔

مسئلہ: 633 اگر مرض الموت میں کوئی شخص اقرار کرے کہ کسی کا فلاں مقدار مال اس کے ذمہ واجب الادا ہے تو یہ مال اصل ترکہ میں سے ادا کیا جائے گا، بشرطیکہ اس پر ورثاء کو نقصان پہنچانے کا الزام نہ آئے اور کوئی اس کی تکذیب بھی نہ کرے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا یہ اقرار قابل قبول نہیں ہے، خصوصاً اگر اس کے ورثاء میں نابالغ بچے بھی شامل ہوں، اس لئے کہ یہ اقرار حقداروں کے خلاف ہے اور قاعدہ ''اِقْرَارُ الْعُقَلاءِ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ جَائِزٌ'' ''عقلاء کا اپنے خلاف اقرار نافذ ہے''، یہاں جاری نہیں ہوتا، اس لئے کہ موت کی دہلیز پر اس قسم کا اقرار براہِ راست ورثاء کے خلاف قرار ہے، اس لئے کہ یہ سارا مال انہیں منتقل ہونے والا ہے۔ لیکن اگر صحت کی حالت میں جب اسے بظاہر قریب الموت نہیں سمجھا جاتا، ایسا اقرار کرے تو وہ قابل قبول ہوگا، اس لئے کہ یہ اقرار اس کے اپنے خلاف ہے۔

مسئلہ: 634 اگر یہ وصیت کرے کہ اس کا ایک تہائی مال اس کے ورثاء میں تقسیم کیا جائے اور یہ بھی معلوم ہو کہ اس کی مراد مساوی تقسیم ہے تو اگر یہ غیر عادلانہ نہ ہو تو اس کی وصیت نافذ ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر معلوم نہ ہو کہ اس کی مراد مساوی تقسیم ہے تو اس صورت میں اس ایک تہائی کو بھی باقی اموال کی مانند احکام میراث کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

مسئلہ: 635 اگر اس کی وصیت ورثاء کے تینوں طبقات کے متعلق ہو تو اس صورت میں بھی مذکورہ دو احتمالات کے مطابق دو قسم کی تقسیم عمل میں آئے گی۔

مسئلہ: 636 جس طرح اس بچہ کے بارے میں وصیت کرنا صحیح ہے جو ماں کے پیٹ میں ہے، اسی طرح احتمالِ حمل کے متعلق وصیت کرنا بھی درست ہے، مثلاً اگر اس کی اپنی بیوی یا کسی اور عورت کے متعلق وصیت کرے کہ اگر وہ حاملہ ہو تو اتنا مال اس سے پیدا ہونے والے بچے کا ہے تو یہ وصیت صحیح ہے۔ اگر دونوں صورتوں میں ایسا بچہ پیدا نہ ہو تو وہ مال بھی باقی ترکہ کی مانند ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

مسئلہ: 637 جن اُمور پر خرچ کرنے کی وصیت کرے، اگر ان میں سے بعض واجب اور بعض مستحب ہوں اور مالِ وصیت ان سب کیلئے کافی نہ ہو تو پہلے واجبات کو انجام دیا جائے، اس کے بعد اگر کچھ بچ رہے تو اس سے مستحب کو انجام دیا جائے۔

مسئلہ: 638 واجب حج اور دُوسری مالی ادائیگیوں کے بارے میں اگر وصیت نہ کی جائے تو انہیں اصل مال سے ادا کیا جائے گا اور اگر وصیت کی جائے تو ایک تہائی سے۔

مسئلہ: 639 اگر ایک تہائی مال کو بعض معین اُمور پر صرف کرنے کی وصیت کرے اور ان کے اخراجات ایک تہائی مال سے کم ہوں تو زائد مال ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اگر ان کے اخراجات ایک تہائی سے زیادہ ہوں تو ورثاء کی رضامندی سے زائد اخراجات کو ادا کر کے وصیت کو پورا کیا جائے، بشرطیکہ ان میں نابالغ بچے نہ ہوں۔ اگر ورثاء راضی نہ ہوں تو اسی ایک تہائی پر اکتفا کیا جائے گا۔ اگر ان میں سے بعض راضی ہوں اور بعض راضی نہ ہوں تو جو راضی ہیں، اُن کے حصہ سے زائد اخراجات کو ادا کیا جائے گا۔

مسئلہ: 640 اگر کوئی شخص اپنے قرضوں اور حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ اپنے لئے نماز، روزہ اور بعض مستحب انجام دینے کیلئے اجیر لینے کی وصیت کرے تو اگر ایک تہائی مال ان تمام اخراجات

کیلئے کافی ہوتو مسئلہ واضح ہے لیکن اگر کافی نہ ہوتو اس کے قرضوں کو اصل مال سے ادا کیا جانا چاہیئے۔ اگر باقی ماندہ اُمور کیلئے بھی کافی نہ ہوتو حقوق اللہ کی ادائیگی واجب نماز وروزہ کی ادائیگی کیلئے اجیر لینے پر مقدم ہے، مستحبات تو دُور کی بات ہے، اگر صرف نماز وروزہ کیلئے کافی ہوتو حقوق اللہ کو بھی اصل مال سے ادا کرنا چاہیئے۔ احتیاط واجب یہ ہے کہ دُوسری صورت میں بھی ایسا ہی کیا جائے۔

مسئلہ: 641 اگر کسی کے مرنے کے بعد کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اُس کا اتنا مال مرنے والے کے ذمہ واجب الادا تھا تو اگر معلوم ہو کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا دو عادل مرد اُس کے حق میں گواہی دیں یا ایک عادل مرد اور دو عادل عورتیں گواہی دیں یا وہ قسم کھائے اور ایک عادل مرد گواہی دے یا چار عادل عورتیں گواہی دیں تو جس قدر وہ مطالبہ کر رہا ہے، اُسے ادا کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر شہادت کامل نہ ہو، مثلاً ایک عادل مرد اور ایک عادل عورت یا چار سے کم عادل عورتیں گواہی دیں تو اُسے کچھ بھی نہیں ملے گا، اس لئے کہ ناقص شہادت سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی۔ شہادت بھی قابل تقسیم نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ اگر شہادت ناقص ہوتو اسی کے برابر مدعی کا دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے۔[1]

مسئلہ: 642 اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ کوئی چیز فلاں شخص کو دے دی جائے اور وہ شخص اُس چیز کو قبول یا رد کرنے سے پہلے مر جائے تو وہ چیز اُس وقت تک اس کے ورثاء کی شمار ہوگی جب تک وصیت کرنے والا اپنی وصیت کو کالعدم قرار نہ دے دے یا اُس شخص کے ورثاء اُس چیز کو رد نہ کر دیں۔ اگر ورثاء میں اس کے قبول یا رد کرنے پر اختلاف پیدا ہو جائے تو جو قبول کریں، وہ اپنے حصہ کے برابر اس میں لینے کا حق رکھتے ہیں۔ یہاں ظاہراً اس کی تقسیم مساوی ہوگی لیکن اگر وہ شخص جس کے بارے میں وصیت کی گئی ہے، ورثاء میں سے ہوتو اس صورت میں میراث کے احکام کے مطابق تقسیم ہوگی۔

مسئلہ: 643 اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ فلاں مال کسی غیر مسلم کو دے دیا جائے تو اگر اس

1۔ اگر گواہوں کے بغیر یا ناقص گواہی کی بنیاد پر یہ یقین حاصل ہو جائے کہ مرنے والا مقروض تھا تو اس کا قرض ادا کرنا ورثاء پر واجب ہے۔ (ہمدانی)

سے ورثاء پر ظلم نہ ہوتا ہو اور یہ وصیت بھی شرعی رجحان رکھتی ہو تو صحیح ہے اور اس پر عمل واجب ہے، جیسا کہ کسی کافر کو اسلام کی طرف مائل کرنے کیلئے یا یہ کہ وہ کافر وصیت کرنے والے کا بیٹا یا کوئی اور رشتہ دار ہو اور اس کی محرومیت سے کوئی فساد رُونما ہونے کا خطرہ ہو۔ بہرحال جہاں بھی ایسی وصیت کی بنیاد کسی شرعی مصلحت پر ہو، وہاں وصیت صحیح اور نافذ ہے۔

مسئلہ: 644 چونکہ وصی مالِ وصیت میں امین ہے، لہٰذا جب تک خیانت نہ کرے، اس منصب پر باقی رہے گا اور اگر اس کی کوتاہی کے بغیر کوئی چیز ضائع یا تلف ہو جائے تو وہ ضامن نہیں ہے، اگرچہ وصیت پر عمل کرنے کی اُجرت بھی اُس کیلئے مقرر ہو، اس لئے کہ امانت داری دراصل اُجرت نہیں رکھتی۔ لہٰذا وہ اس آیت کا مصداق ہے:

''مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ''. (91:9)

''نیکوکاروں کے اُوپر کوئی سبیل (الزام) نہیں ہے''۔

کھانے پینے کے احکام

حیوانات

مسئلہ: 645 حلال گوشت جانوروں کا گوشت ذبح کرنے یا شکار کرنے سے حلال ہوتا ہے۔ جن حیوانات کا شکار کیا جاتا ہے، وہ یا تو دراصل وحشی ہوتے ہیں یا پالتو ہوں اور پھر وحشی ہو جائیں، ان حیوانات کا گوشت شکار یا مقررہ شرعی شرائط کے مطابق ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے۔ لیکن پالتو جانوروں کا گوشت صرف ذبح کرنے سے ہی حلال ہوتا ہے مگر یہ کہ بھاگ جائیں اور وحشی ہو جائیں تو یہ بھی شکار کے زمرے میں آجاتے ہیں، اس لئے کہ صید (شکار) دونوں معنی میں بولا جاتا ہے یعنی ''شکار کرنا'' اور ''شکار ہونے والا حیوان'' جس میں تمام وحشی جانور آجاتے ہیں۔

شکار

مسئلہ: 646 بنیادی طور پر حیوانات کا شکار حرام ہے مگر یہ کہ ان کے گوشت، کھال یا دُوسری

اشیاء کی ضرورت ہو۔ بنابراین تفریحی شکار حرام اور اس کا سفر گناہ ہے۔

مسئلہ: 647 حالتِ احرام میں حلال شکار بھی حرام ہے، اس لئے کہ انسان حالتِ احرام میں ''حق'' کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔ پس کس طرح اُس کی مخلوق کا شکار کر سکتا ہے!

مسئلہ: 648 شکار اسلحہ کے ذریعے کیا جاتا ہے یا شکاری حیوان کے ذریعے۔ آلہ شکار کیلئے ضروری ہے کہ کاٹنے والا ہو، چاہے لوہے سے بنا ہو یا کسی اور چیز سے، چاہے عام طور پر کاٹنے والا ہو یا تیزی سے لگنے کی وجہ سے کاٹے، جیسے چھرے یا گولی جیسی چیزیں ہوتی ہیں، اس لئے کہ شکار میں صرف یہ ضروری ہے کہ آلہ شکار کاٹنے والا ہو، چاہے جیسا بھی ہو۔

مسئلہ: 649 حیوان کے ذریعے شکار کرنے کی شرط یہ ہے کہ شکاری حیوان تربیت یافتہ ہو اور اس طرح شکار کرتا ہو جیسے اس کے مربی کے ہاتھ میں آلہ شکار ہوتا ہے، چاہے یہ تربیت یافتہ شکاری جانور کتا، باز یا عقاب ہو یا کوئی اور پرندہ یا غیر پرندہ جانور۔ ایک اور شرط یہ بھی ہے کہ حیوان کو شکار کیلئے چھوڑتے وقت یا کم از کم جب وہ شکار کرنے لگے تو اللہ کا نام لیا جائے۔ اللہ کا نام لینا ہر شکار اور ذبح کرنے کی بنیادی شرط ہے۔

مسئلہ: 650 کتے اور سور کی مانند نجس العین جانوروں کے علاوہ تمام حرام گوشت حیوانات شرعی طور پر شکار یا ذبح کرنے سے پاک ہو جاتے ہیں، اگرچہ ان کا گوشت کھانا حرام ہے اور انہیں نماز اور احرام کے علاوہ ایسے کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے جن میں طہارت ضروری ہے۔

مسئلہ: 651 شکار کے حلال ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جب وہ شکار کرنے والے انسان کے ہاتھ میں آئے تو مر چکا ہو۔ اگر اس وقت تک زندہ ہو تو اس کو شرعی احکام کے مطابق ذبح کرنا چاہئے یا اس کی باقی ماندہ جان ذبح کے ذریعے نکلے۔

مسئلہ: 652 شکار شدہ جانور کے حلال ہونے کی ایک اور شرط یہ ہے کہ شکاری جانور اس میں سے کچھ نہ کھائے یا اپنی ضرورت کے مطابق کھائے یا بالفاظِ دیگر معلوم ہو کہ جانور نے اپنے لئے نہیں

بلکہ اپنے مالک کیلئے شکار کیا ہے۔ اگر وہ اس میں سے اتنا کھالے جسے عرفاً یہ کہا جائے کہ اُس نے اپنے لئے شکار کیا ہے یا اپنے اور مالک دونوں کیلئے مشترکہ شکار کیا ہے تو ان صورتوں میں اس کا گوشت حرام ہے۔ لیکن اگر معمولی سی مقدار میں کھالے جو مالک کیلئے شکار کرنے کے معنی سے منافات نہ رکھتا ہو تو حلال ہے۔

مسئلہ: 653 حیوان کو شکار کیلئے بھیجنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہو، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم اور اگر ایک سے زیادہ افراد مشترکہ طور پر اُسے بھیجیں اور ان میں سے ایک شخص شکار کی شرائط کو انجام دے تو شکار صحیح اور حلال ہے۔

مسئلہ: 654 اگر معلوم نہ ہو کہ حیوان شکاری حیوان کے عمل سے مرا ہے یا آلہ شکار سے یا کسی اور چیز سے، جیسے پانی میں ڈوب کر یا بلندی سے گر کر تو ان تمام صورتوں میں جہاں معلوم نہ ہو کہ اس کی موت کا سبب شکار ہے یا کوئی اور چیز تو اس حیوان کا گوشت حلال نہیں ہے۔

مسئلہ: 655 اگر شکار کرنے والا انسان اُس وقت شکار شدہ حیوان کے پاس پہنچے جب وہ شکاری حیوان یا آلہ شکار کے زخم سے مر چکا ہو تو حلال ہے اور اگر ان کے علاوہ کسی اور سبب سے مرا ہو تو حلال نہیں ہے۔ اگر ابھی تک زندہ ہو تو درصورتِ امکان اس کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو یا کافی وقت یا آلہ ذبح موجود نہ ہو تو دونوں صورتوں میں یہ حلال ہے۔

مچھلی کا شکار

مسئلہ: 656 اگر مچھلی کو پانی سے زندہ نکال لیا جائے یا وہ کود کر باہر آ جائے تو حلال ہے، چاہے فلس دار ہو یا بے فلس۔ فلس سے مراد وہ چھلکے ہیں جو مچھلی کی کھال پر ہوتے ہیں، اس لئے کہ فلس دار ہونے کی شرط کے بارے میں روایات میں تضاد پایا جاتا ہے، لہٰذا آیہ شریفہ ''اُحِلَّ لَکُمْ

صَیۡدُالۡبَحۡرِ ''(96:5)، ''تمہارے لئے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا ہے'' کی رُو سے بے فلس مچھلی بھی حلال ہے۔1

مسئلہ: 657 چونکہ مچھلی کے حلال ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ زندہ پانی سے باہر نکالی جائے یا خود نکل آئے، لہٰذا پانی سے باہر آنے کے بعد اسے ذبح کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر اسے زندہ نگل لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ یرقان کے علاج کیلئے چھوٹی مچھلیوں کو زندہ نگلا جاتا ہے۔ اسی طرح اسے زندہ پکانا بھی صرف حیوان کیلئے اذیت ناک ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اگرچہ اس کا گوشت حلال ہے لیکن اسے زندہ نگلنا کسی بھی لحاظ سے حرام نہیں ہے۔

مسئلہ: 658 جھینگا مچھلی بھی حلال گوشت دریائی جانوروں کی مانند حلال ہے۔ ہوائی اور سمندری مکڑی اگر کسی طرح پکڑ لی جائے تو وہ بھی مچھلی کی طرح حلال ہے۔ لیکن جو مکڑی ابھی تک پرواز کرنے کے قابل نہ ہو، اُسے کھانا حرام ہے، اس لئے کہ وہ صید یعنی شکار کے زمرہ سے باہر ہے۔

مسئلہ: 659 اگر مچھلی خود پانی سے باہر آئے یا کوئی اور غیر انسانی عامل اُسے پانی سے باہر لے آئے تو کیا اس صورت میں اس کا کھانا حلال ہے؟

مچھلی کے شکار کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، اُن میں اسے انسان کے ذریعے باہر لانے کی قید لگائی گئی ہے۔ دُوسری طرح آیہ شریفہ کسی قید اور شرط کے بغیر بطورِ مطلق یہ کہہ رہی ہے:

---

1 علامہ نراقی نے اپنی کتاب المستند میں کہا ہے کہ مچھلی کے حلال ہونے کیلئے اس پر چھلکے ہونا، علماء کے درمیان مشہور ہونے کی وجہ سے شرط ہے جبکہ بعض علماء اس کو شرط نہیں جانتے جیسا کہ شیخ طوسی نے کتاب التہذیب، النہایہ اور الاستبصار میں، محقق حلی نے اپنی بعض کتب اور کفایہ میں اس بات کو بعض علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔ نیز شہید ثانی نے مسالک میں اور محقق اردبیلی نے صحیح احادیث کی روشنی میں فتویٰ دیا ہے اور فیض کاشانی بھی چھلکے ہونے کو شرط نہیں جانتے۔ (مفاتیح الشرائع 184:2)۔

''اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ''.

''تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے'' (96:5)

چونکہ صید ''شکار کرنے'' اور ''شکار ہونے والے جانور'' دونوں کو کہا جاتا ہے، لہٰذا اس میں تمام دریائی حیوانات آجاتے ہیں جن میں یہ مچھلی بھی داخل ہے۔

روایات کی رُو سے مچھلی کے علاوہ دُوسرے دریائی جانور، سوائے جھینگا مچھلی کے، مستثنٰی کئے گئے ہیں۔ مچھلی اور جھینگا مچھلی بھی اگر پانی میں مر جائیں تو ان کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ بنا بر ایں اگر مچھلی خود بخود پانی سے زندہ نکل آئے تو شکار شدہ مچھلی کی طرح حلال ہے۔

ذبح کرنے کے احکام

مسئلہ: 660 حلال گوشت جانور کا ذبیحہ حلال ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ اسے قبلہ رُو لٹا کر اللہ کا نام لے کر اس کی گردن کی چار رگیں گلے کی اُبھری ہوئی جگہ کے نیچے سے کاٹی جائیں (ذبیحہ سے مراد ذبح شدہ جانور ہے)۔

مسئلہ: 661 گردن کی چار رگوں کو کسی خاص شکل اور ترتیب سے کاٹنا ضروری نہیں ہے بلکہ چاہے گلے کے سامنے یا گردن کے پیچھے سے دائیں یا بائیں طرف سے کاٹی جائیں تو ان سب صورتوں میں ذبح صحیح ہے، اس لئے کہ:

''اِنَّمَا الذِّبْحُ فِی الْحُلْقُوْمِ''.

''ذبح صرف حلقوم میں ہے''۔

نے کسی خاص جانب سے ذبح کرنے کو معین نہیں کیا۔

مسئلہ: 662 ضروری نہیں ہے کہ ان چار رگوں کو ایک شخص ایک ہی وقت میں کاٹے بلکہ اگر چند اشخاص مل کر ان کو کاٹ ڈالیں تو بھی کافی ہے، اس لئے کہ ذبح میں چار رگوں کے کٹنے، ذکرِ اسم اللہ

اور قبلہ رُو ہونا ہی کافی ہے۔

مسئلہ:663 ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر یہ علم ہو کہ ذبح کی شرائط کے مطابق ذبح کیا گیا ہے تو حلال ہے۔ بنا بریں اگر یہودی یا عیسائی بھی ان شرائط کو مدِنظر رکھ کر ذبح کریں تو اس کا گوشت کھانا حلال ہے اور شاید:

'وَمَالَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّاذُكِرَاسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ'(119:6)

''تمھیں کیا ہے کہ تم اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو''۔

اُن مسلمانوں کی سرزنش کر رہی ہو جو غیر مسلموں کے ان ذبیحوں کو نہیں کھاتے تھے جس پر انہوں نے ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کو یاد کیا ہو، اس لئے کہ سورۂ مائدہ کی آیت 5:

''وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ''.(5:5)

''اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے''

کی رُو سے ان کے تمام کھانے ہم پر حلال ہیں جن میں حلال گوشت حیوانات کا گوشت بھی داخل ہے مگر یہ کہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس لئے کہ:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ(121:6)

''اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس میں سے نہ کھاؤ اور یقیناً یہ فسق ہے''۔

ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لینا اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس میں سے کھانا دونوں فسق ہیں۔

چالیس سے زیادہ روایات میں یہ جملہ دُہرایا گیا ہے:

''اِنَّمَا هُوَ الْاِسْمُ وَلَا يُؤْمَنُ عَلَيْهِ اِلَّا مُسْلِمٌ''.

''سب سے اہم چیز تو اللہ کا نام ہی ہے اور سوائے مسلمان کے اس کے بارے میں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا''۔

اگر ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی غیر مسلم ذبح کرے اور اس پر اللہ کا نام لے اور دُوسری

شرائط کی پابندی کرے تو یہ عدم اطمینان برطرف ہوجاتا ہے اور کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

مسئلہ: 664 اللہ کا نام لینے میں صرف نیت یا قلبی یاد کافی نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کوئی نام زبان سے ادا کیا جائے، چاہے للہ یا باللہ ہو یا کوئی اور مفصل ذکر۔ اگر زبان سے کہنا ممکن نہ ہو تو اشارہ بھی کافی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کے نام کا زبانی ذکر قلبی ذکر کی نشاندہی کرتا ہو۔

بنابرایں اگر کوئی منکرِ خدا سو بار بھی اللہ کا نام لے تو کافی نہیں ہے اور اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ لیکن مشرک جو خدا کو مانتا ہے اور اہل کتاب، اللہ کا نام لے کر ذبح کریں اور دُوسری شرائط کی بھی پابندی کریں تو ان کا ذبیحہ حلال ہے۔

مسئلہ: 665 اگر چند آدمی مل کر کسی جانور کو اس طرح ذبح کریں کہ ایک اسے قبلہ رُو کرے، دُوسرا اللہ کا نام لے اور تیسرا اس کی چاروں رگیں کاٹ دے تو یہ کافی ہے، بشرطیکہ رگیں کاٹنے والا اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اس لئے کہ اس طرح ذبح کی شرائط پر عمل درآمد ہوجاتا ہے اور یہی مطلوب ہے۔

مسئلہ: 666 اگر کوئی جانور کسی غیر شرعی طریقے سے ذبح کیا جائے یا کسی اور وجہ سے مرنے کے قریب ہو اور ابھی اُس کی موت واقع نہ ہوئی ہو تو اس صورت میں اگر اس کی باقی ماندہ زندگی کا خاتمہ شرعی طور پر ذبح کرکے کردیا جائے تو یہ کافی ہے اور ''اِلَّا مَـا ذَكَّيْتُمْ''، ''سوائے اس جانور کے جسے تم تذکیہ کرو'' بھی اسی کے بارے میں ہے، یعنی اس کے زندہ ہونے کی علامت آنکھ یا دُم وغیرہ کی حرکت ہے۔ پس اگر اس کی باقی ماندہ زندگی کا خاتمہ ذبح شرعی کے سبب ہو تو حلال ہے اور اگر ذبح شرعی مؤثر نہ ہو اور اس کے بغیر ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوچکا ہو تو اس کا گوشت حرام ہے۔

مسئلہ: 667 اگر چار رگوں میں سے بعض کو غیر شرعی طریقے سے کاٹا جائے اور حیوان کی موت واقع ہونے سے قبل باقی رگوں کو شرعی حکم کے مطابق کاٹ دیا جائے تو اس کا گوشت حلال ہے۔

مسئلہ: 668 حیوان کو ذبح کرنے کیلئے تیز دھار آلے کا استعمال ضروری ہے۔ پس اگر وہ

کاٹنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو یا شدید ضرب کی وجہ سے کاٹا جائے تو ظاہراً کافی نہیں ہے۔

مسئلہ: 669 حیوان کے قبلہ رُو ہونے کیلئے اس کے سر اور بدن کے سامنے کے حصے کا قبلہ کے سامنے ہونا کافی ہے، چاہے وہ لیٹا ہوا ہو یا کھڑا ہو یا کسی اور حالت میں ہو۔ چاہے دائیں پہلو ہو یا بائیں پہلو یا جیسے بھی ہو، اس لئے کہ صرف قبلہ رُو ہونا ہی شرط ہے اور اس کی کوئی کیفیت معتبر نہیں ہے۔

مسئلہ: 670 ضروری ہے کہ حیوان کو قبلہ رُو کرنا اور اللہ کا نام لینا ذبح کرنے کی نیت سے ہو ورنہ ظاہراً کافی نہیں ہے۔

مسئلہ: 671 یہ جاننے کیلئے کہ حیوان کی موت ذبح کرنے والے کے فعل کے نتیجہ میں واقع ہوئی ہے، ایک علامت یہ ہے کہ اس کے بدن سے کافی مقدار میں خون باہر نکلے جسے قرآن شریف میں ''دمًا مسفوحًا'' کہا گیا ہے اور اسے ہی حرام قرار دیا گیا ہے۔ ذبح کے بعد حیوان کے بدن میں باقی ماندہ خون پاک اور حلال ہے۔

مسئلہ: 672 اُونٹ کو ذبح کرنے کیلئے اس کی چار رگوں کو کاٹنے کی بجائے اس کے حلق میں تیز دھار آلے سے سوراخ کرنا ضروری ہے۔ اسے نحر کرنا کہتے ہیں۔ اگر اس کی بجائے اس کی رگیں کاٹی جائیں تو کافی نہیں ہے۔ اسی طرح دُوسرے حلال گوشت حیوانوں کو اُونٹ کی طرح نحر کرنا کافی نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی بھی حیوان کو غیر مناسب طریقے سے ذبح کیا جائے تو اس کی موت سے قبل اس کا مخصوص طریقہ اختیار کر کے ذبح کرنے سے وہ حلال ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 673 اگر پالتو جانور سرکش ہو جائے یا کسی کنوئیں یا ایسی جگہ گر جائے جہاں اس کو ذبح کرنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں اگر اُسے کسی بھی کاٹنے والی چیز سے مار ڈالا جائے تو حلال ہے۔

مسئلہ: 674 اگر کسی جانور کو ذبح یا شکار کرنے کے نتیجہ میں اُس کے پیٹ میں اُس کا بچہ مر جائے تو ہو حلال ہے، بشرطیکہ اس کی خلقت پوری ہو چکی ہو۔ اگر یہ دو شرائط موجود نہ ہوں تو حلال نہیں ہے۔

مسئلہ:675 حیوان کا سر جدا کرنا ظاہراً حرام ہے لیکن اس سے اس کا گوشت حرام نہیں ہوتا۔

مسئلہ:676 مسلمانوں کے بازار سے خریدا ہوا گوشت اور کھال حلال اور پاک ہیں اور تحقیق وجستجو بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترکہ بازار سے کسی ایسے شخص سے خریدا جائے جس کا مسلم یا غیر مسلم ہونا معلوم نہ ہو تو حلال اور پاک نہیں ہے۔ لیکن اگر مسلمان کے ہاتھ سے خریدا جائے تو پاک اور حلال ہے، چاہے مسلمانوں کے بازار میں ہو یا مشترک بازار میں، مگر یہ کہ معلوم ہو کہ اس مسلمان نے انہیں کافر سے لیا ہے اور یہ مسلمان بھی ایسا ہو جو حلال وحرام کا پابند نہ ہو۔

مسئلہ:677 اگر جال کے ذریعے مچھلی کا شکار کیا جائے اور جال میں پھنسنے والی بعض مچھلیاں پانی میں مر چکی ہوں تو ان کی تعداد کے برابر مچھلیاں حرام اور باقی حلال ہیں۔

حلال گوشت پرندوں اور چرندوں کا ذکر

مسئلہ:678 تمام پالتو اور وحشی جانور جو درندے نہ ہوں، حلال گوشت ہیں اور تمام درندے خواہ پالتو ہوں یا وحشی، حرام ہیں۔ درندہ اُس حیوان کو کہتے ہیں جو ایسے دانت اور پنجے رکھتا ہو جو اُس کی درندگی کا ذریعہ ہوں۔ بنابریں خرگوش کا گوشت حلال ہے اور اس کی حرمت اور حلیت کے بارے میں دو متعارض روایات سے اس کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ جو روایت غیر درندہ حیوان کو حلال قرار دینے والے قاعدہ کے مطابق ہے، اُسے ترجیح حاصل ہے یا یہ کہ تعارض کے نتیجہ میں دونوں ساقط ہو جائیں گی اور یوں حرمت ثابت نہیں ہے۔

اسی اساس پر ہدہد وغیرہ جیسے پرندے، جو درندگی کی صفت نہیں رکھتے، حلال ہیں لیکن باز اور عقاب جیسے پرندے حرام ہیں۔ کوے کے بارے میں روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس

کی حرمت پر کوئی صحیح اور قابل قبول دلیل موجود نہیں ہے۔ صرف وہی کوے حرام ہیں جو درندگی اور مردار خوری کی حالت رکھتے ہوں۔[1]

مسئلہ: 679 حلال گوشت حیوانات میں پائی جانے والی مندرجہ ذیل چیزوں کا کھانا حرام ہے۔ ذبح کرتے وقت جو خون حیوان کے بدن سے خارج ہو، وہ حرام ہے اور جو خون ذبح کے بعد بدن میں رہ جائے، وہ حلال ہے۔

فضلہ، نر اور مادہ دونوں کے آلاتِ تناسلی، رحم، وہ غدے جنہیں دشول کہا جاتا ہے، خصیتین، سر کے مغز میں چنے کے دانے کی مانند پائی جانے والی ایک چیز، حرام مغز جو ریڑھ کی ہڈی میں ہوتا ہے، وہ پٹھے جو ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف ہوتے ہیں، پتہ، تلی، مثانہ، آنکھ کا ڈھیلا، وہ چیز جو سموں کے درمیان پائی جاتی ہے اور اس کی حرمت احتیاطاً ہے۔ ان چیزوں کا کھانا صرف اُس صورت میں حرام ہے جب یہ تنہا ہوں۔ لیکن اگر گوشت یا شوربے میں ہوں تو ان کا پانی جو شوربے میں مل جاتا ہے، حرام نہیں ہے، اگرچہ خود ان کا کھانا بہرحال حرام ہے۔

مسئلہ: 680 تمام خبائث مکمل طور پر حرام ہیں۔ خبائث سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے طبع انسانی متنفر ہے۔ طبع انسانی کا معیار اس کی ابتدائی اور فطری طبیعت ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی کجی اور انحراف پیدا نہ ہو چکا ہو۔ البتہ وہ چیزیں جنہیں بعض لوگ پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ انہیں پسند نہیں کرتے، اس ضابطے سے خارج ہیں، مثلاً پنیر، زیتون اور جھینگا مچھلی وغیرہ۔ اسی طرح اُن لوگوں کی پسند و ناپسند بھی اس ضابطے سے خارج ہے جو مکمل طور پر انسانی طبیعت سے دُور ہو کر حیوان بلکہ حیوان سے بھی پست تر ہو چکے ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان کے دانت کے نیچے آجائے، اُسے کھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ لال بیگ اور اسی قسم کے کیڑے مکوڑے تک کھا لیتے ہیں اور جو مائع چیز گلے

---

[1] علامہ حلیؒ نے " تبصرۃ المتعلمین " میں کوے اور ہدہد کے مکروہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حلال ہے لیکن ترک کرنا بہتر ہے۔ (ہمدانی)

سے نیچے اُتر سکتی ہو، اُسے پی لیتے ہیں۔

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اُونٹ وغیرہ کا پیشاب جو قطعاً خبائث میں سے ہے، حرام ہے، اس لئے کہ جو انسان ہر قسم کے خبائث کو کھاتے پیتے رہتے ہیں، حیوان کا پیشاب پینے سے وہ بھی اجتناب کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر وہ چیز جو انسانی صحت کیلئے نقصان دہ ہو یا اس کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہو، وہ شراب اور جوئے سے متعلق اس آیہ کریمہ کی رُو سے حرام ہے کہ:

"وَاِثۡمُهُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا".

یہ آیت اگرچہ شراب اور جوئے کے احکام کے ساتھ نازل ہوئی ہے لیکن یہ ایک ہمہ گیر قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہو، حرام ہے۔

مٹی کھانا اگر نقصان دہ ہو تو حرام ہے ورنہ حرام نہیں ہے۔ بنابرایں حضرت امام حسین علیہ السلام کی قبر کی مٹی کی تھوڑی سی مقدار شفا اور تبرک کیلئے کھانا نہ صرف یہ کہ حرام نہیں ہے بلکہ فضیلت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہر قسم کی خاک اگر مضر نہ ہو تو نہ حرام ہے اور نہ فضیلت رکھتی ہے۔

مسئلہ: 681 سگریٹ، حقہ، چرس اور افیون وغیرہ جیسی تمام اشیاء کو شروع کرنا اور جاری رکھنا حرام ہے، اس لئے کہ یہ تبذیر کے زمرے میں آتے ہیں اور آیہ کریمہ کی رُو سے:

"اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ". (27:17)

"یقیناً سب تبذیر کار شیطان کے بھائی ہیں"۔

جو شخص ان اشیاء کو خریدنے کے لئے رقم ادا کرتا ہے اور ان اشیاء کو استعمال کرتا ہے، وہ دو قسم کی تبذیر کا مرتکب ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ ان اشیاء کی قیمت پر پیسہ ضائع کرتا ہے اور دُوسرے یہ کہ اپنی صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ تبذیر مال اور دُوسری صورت میں تبذیر حال ہے۔ بنابرایں تمباکو نوشی وغیرہ جیسی اشیاء کے عادی افراد شیطان کے دوہرے بھائی ہیں۔ مفت میں ان

چیزوں کو حاصل کر کے استعمال کرنے والے اس کے عام بھائی ہیں۔

اگر اسراف، جو ضرورت کی اشیاء کے استعمال میں زیادہ روی کا نام ہے، نص قرآن کے مطابق حرام ہے تو تبذیر، جو مال کو ضائع کرنے کا نام ہے، اس کی حرمت اسراف کی حرمت سے بھی شدید تر ہے۔ اس قرآنی آیت کی رُو سے اس کا ارتکاب کرنے والے شیطان کے بھائی بتائے گئے ہیں کہ اگر تبذیر میں نہ فائدہ ہو اور نہ نقصان تو اس صورت میں اس میں حرمت کا ایک پہلو پایا جاتا ہے۔ اگر اس میں نقصان بھی پایا جاتا ہو تو اس میں حرمت کے ایک اور پہلو کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مسئلہ: 682 صرف حرام اشیاء کا کھانا پینا اور فعل حرام کا انجام دینا ہی حرام نہیں بلکہ جو لوگ ان محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں، اُن کے ساتھ شریک ہونا یا اُن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا بھی حرام ہے مگر یہ کہ نہی از منکر کیلئے ہو۔ اس کی دلیل سورۂ انعام کی آیت 68 ہے:

وَاِذَارَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَافَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡافِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ ؕوَاِمَّایُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡبَعۡدَالذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ.

''اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں بیہودہ بحث کرتے ہیں تاکہ ان کی تکذیب کریں یا لوگوں کو گمراہ کریں تو ان سے دُوری اختیار کرو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں، اگر شیطان تمہیں یہ بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو''۔

یہاں آیت کا آخری حصہ ظالموں کے ساتھ ہم نشینی کو مکمل طور پر حرام کر رہا ہے۔ اگرچہ اس کی ابتداء میں بدترین ظالموں کا ذکر ہے اور ظالم سے مراد گناہگار ہے۔

بنا براین گناہگاروں کے ساتھ ہم نشینی حرام ہے، ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہونا تو دُور کی بات ہے مگر یہ کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر جیسے افعال اس کا جواز پیدا کر دیں۔

مسئلہ: 683 صرف شراب خوری ہی نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کی عقل کو زائل کرنے اور نشہ

لانے والی ہو، حرام ہے، چاہے کھانے والی چیز ہو یا پینے والی یا کوئی اور کام۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بہت زیادہ انگور کھا کر مرغن شوربا پی کر دُھوپ میں لیٹ جائے تو اگر یہ عمل نشہ کا موجب ہو تو حرام ہے، اس لئے کہ اپنے اختیار سے نشہ میں مبتلا ہونا، جس صورت میں بھی ہو، محرماتِ اصلی میں سے ہے۔

مسئلہ: 684 کھجور اور انگور کا پانی اگر ابالا جائے تو دو تہائی ختم ہونے سے قبل، اگر وہ نشہ آور نہ ہو تو پاک اور حلال ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا''. (67:16)

''اور کھجوروں اور انگوروں کے پھل، جن سے تم نشہ آور چیزیں اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو''۔

اس آیت میں کھجور اور انگور کے مصنوعات کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے: نشہ آور چیزیں اور اچھا رزق۔ اس آیت سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ انگوروں اور کھجوروں کے مصنوعات میں سے جو بھی چیز نشہ آور نہ ہو وہ رزقِ حسن یعنی اچھا رزق ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جو چیز از روئے قرآن رزق حسن ہو اس کو حرام اور ناپاک کیسے کہا جا سکتا ہے۔ آیت کے ذیل میں یہ بھی کہا گیا ہے:

''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ''.

''اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نشہ آور چیزیں حرام اور رزقِ حسن پاک اور حلال ہے۔

مسئلہ: 685 کھانے پینے، لباس اور رہائش میں اسراف (فضول خرچی) قرآن شریف کی متعدد آیات کی رُو سے حرام ہے۔

مسئلہ: 686 اگر کوئی شخص بھوک یا پیاس کی وجہ سے اضطراب کا شکار ہو اور آپ کے پاس کافی مقدار میں خوراک یا پانی موجود ہو تو ساری خوراک کھانا اور پانی پینا حرام ہے، اگر چہ اسراف وتبذیر نہ

ہو۔

نذر، عہد اور قسم کے احکام

مسئلہ: 687 ان تین اُمور کے ذریعے ان کے مطابق کسی مستحب کو واجب اور مرجوح کو حرام کیا جاتا ہے، اس لئے کہ ان کا تعلق ایسی چیز سے قائم ہوتا ہے جنہیں از رُوئے شریعت کوئی ترجیح حاصل ہو۔ مستحب کی ادائیگی اسے ترک کرنے پر ترجیح رکھتی ہے اور مرجوح، جسے عام طور پر مکروہ کہا جاتا ہے، اسے ترک کرنا اسے انجام دینے پر ترجیح رکھتا ہے۔ اگر کسی واجب کے انجام کی نذر کی جائے تو اس کے وجوب میں شدت آ جاتی ہے اور کسی حرام کے ترک کرنے کی نذر کی جائے تو اس کی حرمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 688 صرف وہی نذر شرعاً درست ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کیلئے کسی فعل کی انجام دہی یا اس کے ترک کو اپنے ذمہ لے لیا جائے۔ ضروری ہے کہ یہ صریح الفاظ میں ہو، چاہے جس زبان میں بھی ہو، مثلاً اُردو زبان میں یوں نذر کی جاسکتی ہے کہ اللہ کیلئے مجھ پر لازم ہے کہ فلاں کام کروں یا اتنی رقم فلاں کام پر صرف کروں جو خدا کا پسندیدہ ہے، چاہے اس میں کوئی شرط پائی جائے یا شرط کے بغیر ہو۔

مسئلہ: 689 جس طرح متعلق نذر کو شرعاً پسندیدہ ہونا چاہیئے، اسی طرح نذر کرنے والے کا عاقل ہونا بھی ضروری ہے۔ سفیہ اور کم عقل انسان کی نذر باطل ہے مگر یہ کہ اُس کی نذر عاقلانہ ہو۔

مسئلہ: 690 ضروری ہے کہ متعلق نذر کو انجام دینا ممکن ہو۔ پس اگر کوئی شخص ایسی نذر کرے جسے انجام دینا عقلاً، عرفاً اور شرعاً اس کی توانائی سے خارج ہو تو یہ نذر باطل ہے، مثلاً اگر کوئی شخص یہ نذر کرے کہ اس سال روزِ عرفہ کربلا جائے اور یہ بھی جانتا ہو کہ اس سال وہ واجب الحج ہے یا نہ جانتا ہو اور نذر کرنے کے بعد اسے اس کا علم ہو تو ان دونوں صورتوں میں نذر باطل ہے یا یہ نذر کرے کہ فلاں دن رسولؐ اللہ یا آئمہ سلام اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کی زیارت کیلئے سفر کرے اور بعد میں یہ معلوم

ہو کہ وہ دن ماہِ رمضان میں آرہا ہے جس کا روزہ رکھنا واجب ہے تو اس صورت میں بھی نذر باطل ہے، اس لئے کہ وہ سفر جو ترکِ روزہ کا باعث ہو، ماہِ رمضان میں حرام ہے مگر یہ کہ ضروری ہو یا ایسی نذر کرے کہ ہر روز پچاس کلومیٹر پیدل چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آئمہ معصومین علیہم السلام اجمعین میں سے کسی کی زیارت کو جائے۔

مسئلہ: 691 نذر صرف اُن افعال کو واجب یا حرام کرتی ہے جنہیں انجام دینا یا ترک کرنا شرعاً ترجیح رکھتا ہو۔ نذر خود کسی عمل یا ترکِ عمل میں ترجیح پیدا نہیں کرسکتی۔ بنابراین میقات سے قبل احرام کی نذر باطل ہے، اس لئے کہ میقات سے پہلے احرام کی حالت اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ شرعاً ترجیح نہیں رکھتا بلکہ حرام اور بدعت بھی ہے۔ کسی بدعت کو کیونکر ذر کے ذریعے سنتِ اسلامی میں داخل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی سنت کو بدعت قرار دیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ: 692 اگر عورت ایسی نذر کرے جس سے شوہر کا حق ضائع نہ ہوتا ہو تو ایسی نذر میں شوہر کی اجازت ہرگز شرط نہیں ہے۔ اگر شوہر کوئی ایسی نذر کرے جس سے عورت کی حق تلفی ہوتی ہو تو یہ نذر حرام ہے مگر یہ کہ عورت اجازت دے۔ ہر وہ نذر جو کسی حق کے ضائع ہونے کی موجب ہو، حالت ِرجحان سے نکل کر حرام ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: 693 اگر کسی کا حق نذر سے ضائع ہونے کا امکان ہو اور اس کی اجازت سے نذر کر لی جائے تو اجازت دینے کے بعد اسے نذر کو باطل کرنے کا حق نہیں ہے مگر یہ کہ یہ اجازت سفیہانہ اور مالکِ حق کی مصلحت کے خلاف ہو تو ایسی صورت میں یہ نذر شروع سے ہی باطل ہے۔

مسئلہ: 694 نذر کی صحت کیلئے والدین کی اجازت بھی ضروری نہیں ہے مگر یہ کہ اس سے ان کا حق ضائع ہوتا ہو، یا یہ کہ ان کی نظر کسی ایسی مصلحت پر ہو جس کے غلط ہونے پر کوئی دلیل نہ ہو اور نذر سے یہ مصلحت ضائع ہوتی ہو یا یہ کہ یہ نذر ان کی ناخوشی کا باعث ہو، بشرطیکہ یہ ناخوشی خیالی نہ ہو، اس لئے کہ والدین کی ولایت مصلحت اندیشی کی وجہ سے ہے، نہ کہ استبداد اور خودسری کی خاطر۔

مسئلہ: 695 شرعی نذر کو تمام مقررہ خصوصیات کے ساتھ انجام دینا واجب ہے۔

مسئلہ: 696 اگر کسی مقررہ دن روزہ رکھنے کی نذر کرے اور بعد میں معلوم ہو کہ اس دن روزہ رکھنا کسی وجہ سے حرام ہے کہ یا تو حیض و نفاس کے دن ہوں یا عید الفطر اور عیدِ قربان کا دن ہو یا بیماری ہو تو ان تمام صورتوں میں نذر باطل ہے اور اس کی قضا بھی واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: 697 اگر متعلق نذر کوئی ایسا عمل ہو جو پہلے ہی انجام دیا جا چکا ہو یا کسی وجہ سے اس کی انجام دہی رجحان نہ رکھتی ہو تو یہ نذر باطل ہے، مثلاً یہ کہ کوئی شخص کسی معین مسجد یا مدرسہ وغیرہ کیلئے قالین دینے کی نذر کرے اور یہ کام پہلے سے کوئی اور انجام دے چکا ہو اور اب یہ قالین وہاں دینا اسراف و تبذیر کے زمرہ میں آتا ہو مگر یہ کہ مستقبل قریب میں اس کی ضرورت ہو۔ لیکن اگر ایک طویل مدت تک اس کی ضرورت نظر نہ آ رہی ہو تو یہ نذر اسراف یا تبذیر کے زمرہ میں آ کر باطل ہو جائے گی۔

مسئلہ: 698 اگر کسی امام یا ولی یا کسی مقدس مکان پر کوئی مال خرچ کرنے کی نذر کی جائے تو اس مال کو وہاں خرچ کرنا چاہئے جس کے متعلق نذر کو زیادہ ضرورت ہو۔ اگر اس شخص یا اس کے مزار پر خرچ کرنا غیر ضروری ہو تو اس صورت میں زائرین اور خدام پر صرف ہوگا۔

مسئلہ: 699 اگر کچھ مال یا صدقہ دینے یا نماز یا روزہ کی ادائیگی کی نذر کی جائے لیکن ان کی مقدار معین نہ کی جائے تو کم از کم اتنی مقدار کو انجام دینا واجب ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس نے اپنی نذر ادا کر دی ہے۔

مسئلہ: 700 چونکہ متعلق نذر صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو انسان کے اختیار میں ہو یا کسی ایسے شخص کے اختیار میں ہو جس پر نذر کرنے والے کو اختیار ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ نذر کرے کہ اگر خدا نے اُسے بیٹی دی تو وہ فلاں شخص کے ساتھ اس کی شادی کرے گا تو یہ صرف اُس صورت میں واجب الادا ہے جب لڑکی بھی رضامند ہو، اس لئے کہ وہ خود بھی اس پر راضی ہے اور کسی شرعی وجہ کے بغیر اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ لڑکی کو اس کی رضامندی کے بغیر اس معین شخص

سے بیاہ دے لیکن اگر وہ لڑکی کو اس شادی پر راضی کر سکتا ہو تو ایسا کرنا واجب ہے، اس لئے کہ لڑکی کی رضامندی کی صورت میں یہ نذر درست اور واجب العمل ہے، اس لئے کہ یہ اس کے اختیار میں ہے، اگرچہ اس کے بعض مقدمات کو انجام دینا پڑے۔ لیکن اگر ان مقدمات کا حصول اس کی ذِلت کا باعث یا موجبِ حرج ہو تو پھر واجب نہیں ہے۔ عسر جو کہ حرج سے بھی زیادہ مشقت کا باعث ہے اور جو عمل موجبِ عسر ہو، اس کی نذر نہیں کی جا سکتی۔

مسئلہ: 701 نذر پر عمل نہ کرنے کا کفارہ وہی ہے جو ماہِ رمضان کے روزہ کو ترک کرنے کا ہے۔ ایک غلام آزاد کرنا یا دو ماہ کے روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

مسئلہ: 702 اگر کوئی شخص نذر کرے کہ کبھی سگریٹ نہ پیئے گا یا کبھی نمازِ شب کو ترک نہ کرے گا تو جس حد تک اس پر عمل کرنا ممکن ہے، اُس کی پابندی واجب ہے اور جس حد تک ناممکن ہے، وہ واجب نہیں ہے۔ اس صورت میں دراصل یہ نذر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جن میں سے ایک ممکن اور واجب ہے اور دُوسرا غیر ممکن اور غیر واجب۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے چند کاموں کو انجام دینے کی نذر کی جائے جن میں سے بعض جائز، ممکن اور رجحان رکھتے ہوں اور بعض اس کے برعکس ہوں، تو اس صورت میں اوّل الذکر کے متعلق نذر صحیح اور واجب الادا ہے جبکہ ثانی الذکر کی نسبت باطل ہے۔

مسئلہ: 703 جو شرائط نذر میں پائی جاتی ہیں، وہ سب عہد اور قسم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ عہد کی مخالفت کا کفارہ بھی ترکِ روزۂ رمضان اور مخالفت نذر کے کفارہ کی مانند ہے جبکہ قسم کی مخالفت کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا یا دس مسکینوں کو ایسا کھانا کھلانا ہے جو انسان عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے یا دس مسکینوں کو لباس مہیا کرنا ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو تین دن روزہ رکھنا، قسم توڑنے کا کفارہ ہے، جیسا کہ آیہ شریف میں ہے:

"لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ

عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَاتُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ (89:5)

''اللہ تعالیٰ تم سے مؤاخذہ نہیں کرتا، تمہاری قسموں میں لغو قسم پر لیکن مؤاخذہ اس پر کرتا ہے کہ تم قسموں کو مستحکم کر دو۔ سو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجہ کا کھانا دینا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو یا ان کو کپڑا دینا یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا اور جس کو مقدور نہ ہو تو تین دن کے روزے ہیں، یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جبکہ تم قسم کھالو''۔

مسئلہ: 704 جس طرح نذر میں متعلق نذر (جس چیز کی منت مانی جائے) کے انجام دینے کی قوت اس کے رجحانِ شرعی کا وجود اور اس کا خدا کیلئے ہونا ضروری ہے، عہد اور قسم میں بھی یہ سب شرائط ضروری ہیں۔ قسم کیلئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اسماء میں سے کسی اسم کے ساتھ ہو۔ غیر خدا کی نذر یا عہد کی مانند غیر خدا کی قسم بھی شرعاً معتبر نہیں ہے، اگرچہ قرآن شریف، رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومین علیہ السلام کی ہو۔

نذر کی طرح عہد و قسم بھی مشروط یا غیر مشروط ہو سکتے ہیں۔ جو احکام اور فروع نذر کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں، وہ سب عہد اور قسم میں بھی پائے جاتے ہیں، اس لئے کہ تینوں کی اساس ایک ہے اور ان کو خدا ہی کیلئے منعقد کیا جا سکتا ہے۔

وقف

مسئلہ: 705 وقف لغت میں کسی چیز کو حرکت کی حالت سے نکال کر روک دینے کو کہتے ہیں اور فقہی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو اپنی ملکیت سے خارج کر کے بعض مقررہ شرعی مصارف کیلئے وقف کر دے۔

بنیادی طور پر مال دو قسم کی حرکتوں سے تعلق پیدا کر سکتا ہے، ایک مالکانہ حرکت، کہ جس

طرح مالک چاہے شرعی احکام کے مطابق اس میں تصرف کرے، خواہ اسے فروخت کردے، کرایہ پر دے، کسی کو ہبہ کردے یا عاریتاً دے یا اس طرح کے دیگر تصرفات اور دُوسری قسم غیر مالکانہ حرکت ہے جس میں تمام مالکانہ حرکات متوقف ہو جاتی ہیں اور وقف شدہ چیز وقف کرنے والے کی طرف سے مقررہ شرائط کے ساتھ مقررہ شرعی مصارف میں حرکت کرتی ہے۔

مسئلہ: 706 جس طرح دُوسرے معاملات کیلئے کوئی خاص لفظ ضروری نہیں ہے، وقف میں بھی کسی خاص لفظ یا صیغہ کا ہونا ضروری نہیں ہے، عملاً بھی کوئی چیز وقف کی جاسکتی ہے، مثلاً مسجد میں کوئی قالین بچھا دینا جبکہ عارضی یا عاریہ کی حالت نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ: 707 چونکہ صرف وہی چیز وقف کی جاسکتی ہے جو واقف کی ملکیت میں ہو، لہٰذا وہ عمومی اموال جن کو کسی کے ساتھ مختص نہیں کیا جاسکتا، سوائے اس کے کہ مقررہ شرعی شرائط کے پیش نظر کوئی شخص ان سے استفادہ کرنے میں دُوسروں پر مقدم ہو، انہیں ہرگز وقف نہیں کیا جاسکتا۔ بنابرایں زمین، جنگل اور دریا وغیرہ قابل وقف نہیں ہیں مگر یہ کہ وقف ان فوائد کی نسبت ہو جو اِن سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں اگر وقف شدہ چیز کا مخصوص فائدہ باقی نہ رہے جس کے پیش نظر اسے وقف کیا گیا تھا تو خود اس چیز اور اس کے دیگر فوائد سے بہرہ مند ہونا دُوسروں کے لئے جائز ہوگا مگر یہ کہ وہ تمام فوائد کے لحاظ سے وقف کی گئی ہو۔

زمین کے متعلق اس وقف کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب کوئی شخص زمین کو آباد کرتا ہے تو وہ اس سے ہر قسم کا استفادہ کرنے میں دُوسروں پر مقدم ہے۔ جس طرح وہ اس اولویت کو کسی مال کے مقابلہ میں کسی اور کو منتقل کرسکتا ہے، اسی طرح اسے وقف بھی کرسکتا ہے کہ اس صورت میں یہ اولویت اس کے اختصاص سے نکل کر کسی خاص یا عام المنفعت مصرف میں منتقل ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: 708 چونکہ وقف عبادات میں شامل نہیں ہے، لہٰذا اس میں قصدِ قربت کی شرط نہیں ہے۔ اس کی بنیادی شرط یہی ہے کہ اسلامی لحاظ سے کسی شخص یا عوام کے مفادات میں ہو۔

مسئلہ: 709 اگر کسی چیز کو کسی شخص یا اشخاص کیلئے وقف کیا جائے تو اگر وہ اسے رد کر دیں تو وقف باطل ہے ورنہ صحیح ہے، چاہے وہ قبول کریں یا سکوت اختیار کریں۔

مسئلہ: 710 اگر کسی چیز کو کسی شخص یا اشخاص کیلئے وقف کیا جائے تو یہ وقف اسی صورت میں صحیح ہے جب وہ خود، ان کا وکیل یا ولی اسے اپنے تصرف میں لے آئے۔

مسئلہ: 711 جو شروط دُوسرے عقود اور ایقاعات میں ضروری ہیں، وقف میں بھی ضروری ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وقف کرنے والا سفیہ یا مجور نہ ہو۔

مسئلہ: 712 چونکہ وقف کے نتیجہ میں موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، لہٰذا وقف کے وقت موقوف علیہ (جس کیلئے وقف کی جائے) کا موجود ہونا ضروری ہے۔ بنا بر ایں کسی چیز کا ایسے شخص یا اشخاص کیلئے وقف کرنا صحیح نہیں ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے مگر یہ کہ وقف نسل بعد از نسل ہو۔ مگر اس میں بھی کم از کم اس سلسلہ کے ایک فرد کا وقف کے وقت شرائط کے مطابق موجود ہونا ضروری ہے۔

مسئلہ: 713 اگر کسی مال کے وقف کرنے سے واقف کے ورثاء کو مالی نقصان پہنچتا ہو تو یہ وقف ہرگز صحیح اور نافذ نہیں ہے، اس لئے کہ وقف میں ذاتی اور عمومی اسلامی مصلحت کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص وارث رکھتا ہے، وہ اپنے تمام یا زیادہ تر اموال کو ان کی مصلحت اور بہرہ مندی کے خلاف وقف نہیں کرسکتا اور اپنی اولاد کیلئے نسل بعد از نسل، وقف بھی صرف اس صورت میں صحیح ہے جب اس سے طبقہ اوّل کے ورثاء کو نقصان نہ ہو، اس لئے کہ وقف ایک شرعی معاہدہ ہے اور شارع مقدس ہرگز اس بات پر راضی نہیں ہے کہ ایک شرعی معاہدہ کی وجہ سے واقف غیر شرعی اور غیر عادلانہ افعال کا مرتکب ہو، مثلاً کسی بزرگ کے مزار کے اردگرد پائے جانے والے آوارہ کتوں کیلئے کوئی چیز وقف کرنا جبکہ اس کے اردگرد بسنے والے غرباء یا اس کی اپنی اولاد اور دُوسرے رشتہ دار فقر وافلاس میں گرفتار ہوں۔

بہرحال نذر، عہد، قسم اور وصیت کی طرح وقف کو بھی شرعی موازین کے مطابق، علماء کی نگرانی

میں انجام پانا چاہئے تا کہ وہ اموال جو مسلمانوں کے مفادات اور ان کی مصلحت اور ان کی زندگی کے قیام کے ذریعہ ہیں، ضائع نہ ہوں اور بہتر مصارف کی موجودگی میں دُوسرے مصارف پر صرف نہ ہوں۔ جس طرح مہر بیوی بچوں اور والدین کے اخراجات جیسے براہِ راست مالی فرائض کو شرعی موازین کے مطابق اور ہر قسم کے اسراف وتبذیر سے پاک ہونا چاہئے، اسی طرح وصیت، وقف، نذر، عہد اور قسم کی صورت میں بالواسطہ مالی فرائض کو بھی اہم اور اس کے بعد اہم کے مطابق انجام دینا ضروری ہے، جیسا کہ آیہ شریفہ میں ہے:

''وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا''. (5:4)

''اور اپنے اموال کو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا ہے، سفہا کو نہ دو''۔

اس آیت کی رُو سے سفہاء کے اموال کو بھی ''امو الکم''، ''تمہارے اموال'' قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اس قانون کی تشکیل کرتی ہے کہ تمام خصوصی اموال ذاتی اور عمومی پہلو رکھتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے ذاتی مال کو دُوسروں کے مفادات کے خلاف یا ان کو نقصان پہنچانے کیلئے صرف کرے تو اس کو اس عمل سے روکنا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ ایک سفیہانہ عمل ہے۔ جب ذاتی اموال کا یہ حال ہے تو ان عمومی اموال کا کیا حال ہوگا جنہیں لوگوں کی ضرورت اور فعالیت کے تناسب سے ان کی دسترس میں واقع ہونا چاہئے۔



امر بالمعروف اور نہی از منکر

اگر چہ فقہ سیاسی اسلام کوایک مستقل کتاب میں بیان کریں گےلیکن چونکہ امر بالمعروف اور نہی از منکر صرف سیاسی اور حکومتی پہلونہیں رکھتے بلکہ ان میں ایک عمومی پہلوبھی پایا جاتا ہے، لہٰذا اس رسالہ کے اختصار کے پیش نظر ان کے متعلق یہاں بھی مناسب بحث کریں گے۔

مسئلہ: 714 قرآنی آیات کی نصوص اور روایات کی روشنی میں امر بالمعروف اور نہی از منکر دین کے دوستون ہیں۔ان کے متعلق ہم نے اپنی کتاب ''سپاہِ نگہبانِ اسلام'' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔امر جو وجوب پر دلالت کرتا ہے، اس کی مناسبت سے معروف سے مراد وہ واجبات ہیں جو اسلامی فضامیں سب پرعیاں اورسب کے تسلیم شدہ ہوں۔اسی طرح نہی جوحرمت پر دلالت کرتی ہے، اس کی مناسبت سے منکر سے مراد وہ محرمات ہیں جنہیں اسلامی معاشرہ میں حرام تسلیم کیا گیا ہے:

''**وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ**''.(104:3)

''اورتم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہیۓ جواچھائی کی طرف بلائے ،واجبات کاحکم دےاورمحرمات سے روکے''۔

اس آیت کی رُو سے جب تک کسی واجب کا تارک یا حرام کا مرتکب اسے حرام یا واجب نہ جانتا ہو، یا ان کے حرام یا واجب ہونے کا اطمینان نہ رکھتا ہو، اسے امر بالمعروف اور نہی از منکر کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے،اس لئے کہ اس آیہ شریفہ میں سب سے پہلے **یدعون الی الخیر** ،یعنی ''خیر کی طرف بلاتے ہوں'' کا ذکر ہوا ہے جس میں خیرِ علم ،عقیدہ اور عمل سب آجاتے ہیں۔

اس کے بعد ''**یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر**'' کوذکر کیا گیا ہے جس کے

معنی یہ ہیں کہ خیر کی طرف دعوت کے بعد اگر وہ واجبات کو ترک یا محرمات کو انجام دے تو اسے امر و نہی کیا جائے، جس کے تین مراتب ہیں: قلبی، لفظی اور عملی۔

پہلے انجامِ واجب اور ترکِ حرام کے ساتھ قلبی طور پر ہم آہنگ ہو، اس کے بعد نرم اور واضح الفاظ میں امر و نہی کرے اور اگر یہ مؤثر واقع نہ ہو تو پھر عملاً اسے امر بالمعروف اور نہی از منکر کیا جائے جس میں پہلے تو اس سے قطع تعلق اور ترکِ معاشرت کیا جائے۔ آخر میں طاقت کے استعمال وغیرہ کے ذریعے اسے امر بالمعروف اور نہی از منکر کیا جائے۔[1]

امر و نہی کرنے والے کیلئے شرائط

مسئلہ:715 امر و نہی کرنے والے کو اس واجب یا حرام کا بخوبی علم ہونا چاہئے جس کے بارے میں وہ امر و نہی کر رہا ہو۔ علاوہ ازیں اس کیلئے یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ جس شخص کو وہ امر یا نہی کر رہا ہے، وہ بھی اس واجب کو واجب جانتے ہوئے ترک کر رہا ہے یا حرام کو حرام جانتے ہوئے انجام دے رہا ہے، اس نے توبہ بھی نہیں کی ہے اور توبہ کا ارادہ بھی نہیں رکھتا ہے۔ اس صورت میں امر بالمعروف اور نہی از منکر واجب ہے۔

---

[1] طاقت کے استعمال کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت دے دی جائے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنی قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ایک مناسب حد تک طاقت کا استعمال کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ماں باپ اپنی اولاد پر، بڑے بہن بھائی چھوٹے بہن بھائیوں پر اور اساتذہ اپنے شاگردوں پر۔ اس سے آگے کا معاملہ ہو تو اسلامی ریاست کے قانون نافذ کرنے والے اور انتظامی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی معاشرے میں اسلامی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کیلئے ان اقدار کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی اور تادیبی کاروائی کریں۔ (ہمدانی)

مسئلہ: 716 امر ونہی کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ جس واجب کا وہ امر کر رہا ہے، خود اس کا تارک نہ ہو، جس حرام کی نہی کر رہا ہے، خود اُس کا ارتکاب نہ کرتا ہو یا واجب کے ترک کرنے اور حرام کے انجام دینے پر نادم ہو کر توبہ کر چکا ہو، اس لئے کہ آیہ شریفہ:

"اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ"(44:2)۔

"کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

دُوسروں کو اچھائی کی طرف بلانے والے اور اپنے آپ کو بھول جانے والے افراد کو بے عقل قرار دیا گیا ہے۔ کیا واجب، مباح یا مرجوح کو انجام دینا بے عقلی اور قابلِ سرزنش ہے؟ ایسے ہی افراد کی مذمت میں ایک اور آیت بھی ہے:

"لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ". (3،2:61)

"تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے؟ اللہ کے ہاں یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم ایسی بات کہو جس پر تم عمل نہیں کرتے"۔

چونکہ امر بالمعروف اور نہی از منکر واجب ہے اور اس کے مقدمات کو فراہم کرنا بھی واجب ہے، لہٰذا تارکِ واجب اور عامل منکر پر واجب ہے کہ پہلے خود واجب پر عمل کرے تا کہ اس کا حکم دے سکے اور حرام کو ترک کرے تا کہ اس سے منع کر سکے۔

بنابرایں اگر وہ امر ونہی نہ کرے تو واجب کا تارک ہوا ہے اور اگر خود واجب کو ترک اور حرام کو انجام دیتے ہوئے امر ونہی کرے تو اس صورت میں فعل حرام کا مرتکب ہوا ہے۔ اس صورت میں وجوب اور حرمت کا اجتماع پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک لحاظ سے یہ امر ونہی واجب اور دُوسرے لحاظ سے

حرام ہے۔ امر ونہی کا ایسا اجتماع جو انسان نے خود ایجاد کیا ہو، شرعاً محال اور ناروا نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے اختیار سے اپنے لئے ایسے حالات پیدا کر دے کہ مردار خوری پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں مردار خوری اس پر حرام بھی ہے اور واجب بھی۔ واجب اس لحاظ سے کہ جان کی حفاظت واجب ہے اور حرام اس لحاظ سے کہ اُس نے خود ایسے حالات پیدا کئے ہیں جن کی وجہ سے مردار خوری پر مجبور ہوا ہے۔ قرآن شریف میں ''**الا ما اضطررتم**''، یعنی ''مگر یہ کہ تم اضطرار میں ڈال دیئے جاؤ'' کی رُو سے مردار خوری صرف اُس حالت میں حلال ہے جب انسان نے خود اپنے اختیار سے اپنے لئے اضطرار پیدا نہ کیا ہو۔

مسئلہ: 717 امر بالمعروف اور نہی از منکر کی ایک شرط یہ ہے کہ اس فریضہ کو انجام دینے کی وجہ سے اسے انجام دینے والے کو کوئی ایسا خطرہ در پیش نہ ہو جس کی اہمیت اس معروف کے ترک کرنے یا منکر کے انجام دینے کے خطرے سے زیادہ ہو۔ یہ ایک دائمی اسلامی قاعدہ ہے کہ جب بھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں دو واجب کاموں کو انجام دینا ناممکن ہو جائے تو اس وقت زیادہ اہمیت رکھنے والا واجب، واجب ہوگا اور وہ کم اہمیت والا واجب جو زیادہ اہمیت والے واجب کے ترک کا موجب بن رہا ہو، حرام ہو جائے گا۔

چونکہ جان، مال، ناموس، عقل اور ایمان جنہیں نوامیس خمسہ یعنی پانچ ناموس کہا جاتا ہے، تمام الٰہی ادیان میں ان کی حفاظت بنیادی واجبات میں شامل ہے، لہٰذا اس کے بعد کے مرحلے کا جو بھی واجب ان سے ٹکرائے گا، وہ حرام ہو جائے گا۔

یہ تھیں امر بالمعروف اور نہی از منکر کی شرائط۔ ان کے علاوہ اور کوئی شرط مثلاً خطرہ سے امن یا احتمالِ تاثیر وغیرہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے مگر یہ کہ خطرہ ایسا ہو جو ترکِ واجب یا انجامِ حرام کے خطرے سے زیادہ یا اس کے برابر ہو۔ پہلی صورت میں امر و نہی حرام ہے اور دُوسری میں نہ حرام ہے اور نہ واجب بلکہ جائز۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسا عمل ہے جس میں نابکار گناہگاروں سے واسطہ پڑتا ہے اوراس کے نتیجہ میں بعض خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ پس اگر یہ خطرات ترکِ واجب اور انجامِ فعل حرام کے خطرات سے کمتر ہوں تو اس صورت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب رہے گا۔ ہم سورۂ لقمان آیہ 16 میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو یہ نصیحت پڑھتے ہیں:

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اوراس کے نتیجہ میں جو مصیبت درپیش آئے، اُس پر صبر کرو کہ یہ دینی اُمور میں پائیداری اور ثابت قدمی ہے''۔

جن فرائض کی بنیاد ہی جان یا مال وغیرہ کے خطرات پر رکھی ہو، یہ خطرات انہیں انجام دینے سے ہرگز مانع نہیں ہوسکتے، مثلاً دفاع اور جہاد جیسے اُمور جن کی بنیاد ہی خطرات پر ہے۔ کیا جہاد اور دفاع میں بھی خطرات سے محفوظ ہونا ان کے وجوب یا جواز کی شرط ہے؟

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو دفاع اور جہاد کی مانند دین کے ستون اور اسلام کے محافظ ہیں، ان کے بارے میں یہ سوچنا ہرگز معقول اور صحیح نہیں ہے کہ یہ صرف خطرات سے محفوظ ہونے کی صورت میں ہی جائز یا واجب ہیں، اس لئے کہ امن کی یہ شرط ان دو محافظانِ اسلام کو غیر مؤثر بلکہ بیکار بنا دے گی۔

رہی احتمالِ تاثیر کی بات تو وہ اس آیہ شریفہ کے خلاف ہے:

''وَاِذْقَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًاشَدِيْدًا قَالُوْامَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ''. (162:7)

یہ آیت اُن بنی اسرائیل کے بارے میں ہے جنہوں نے حکم خدا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک نام نہاد شرعی حیلہ کی آڑ لے کر مچھلی کا شکار کیا۔ اس پر بعض لوگوں نے ان فریب کاروں کو

نہی عن المنکر کیا۔بعض لوگوں نے نہی از منکر کرنے والوں کو نہی از منکر سے منع کیا کیونکہ اُن کی نظر میں نہی از منکر کے مؤثر ہونے کا احتمال نہیں تھا۔اسی واقعہ کو یہ آیت یوں بیان کر رہی ہے:

''اور جب ان میں سے ایک جماعت نے کہا کہ تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا شدید عذاب کرنے والا ہے؟ انہوں نے جواباً کہا: تمہارے رب کے ہاں معذور ہونے کیلئے اور ہوسکتا ہے کہ یہ پرہیز کرنے لگیں''۔

اس آیہ شریفہ کی رُو سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مستقل محور مقرر ہوئے ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور ہونا اور دُوسرا شاید وہ پرہیز کرنے لگیں۔

اگر ان کے پرہیز نہ کرنے کا یقین حاصل ہو جائے تو بھی نہی عن المنکر واجب ہے تا کہ نہی از منکر کرنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور ہو۔ انبیاء سلام اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں قرآن شریف میں یہ بیان ہوا ہے:

''عُذْرًا اَوْ نُذْرًا''. (6:77)

''یا وہ اپنی دعوتِ رسالت پر معذور ہوں یا ان کی دعوت مؤثر واقع ہو''۔

علاوہ ازیں اگر احتمالِ تاثیر پر کوئی دلیل موجود ہوتی تو بھی اس سے یہ مراد لینا درست نہ ہوتا کہ امر و نہی کرتے ہی گناہگار اپنے گناہ سے دستبردار ہو جائے بلکہ امر و نہی کی تکرار میں کئی فوائد ہیں جن میں کم از کم یہ ہے کہ گناہگار کسی حد تک متنبہ ہو جائے گا اور اگر نہ بھی ہو تو اس پر حجت تمام ہو جائے گی، اس لئے کہ اگر امر و نہی کا تکرار نہ ہوتا تو یہ گناہگار یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ اگر امر و نہی کا تکرار ہوتا تو عین ممکن ہے کہ وہ گناہ سے دستبردار ہو جاتے۔ اسی عذر کو ختم کرنے کیلئے رسولوں کو مبعوث کیا گیا ہے ''تا کہ ان کی بعثت کے بعد لوگوں کیلئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے''۔ یہ خود ایک دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر میں احتمالِ تاثیر شرط نہیں ہے۔

علاوہ ازیں، قطعِ عذر کے علاوہ تاثیر کے دو اور پہلو بھی ہیں جن میں سے ایک امر و نہی کرنے

والے کا یہ یقینی یا احتمالی علم ہے کہ اس کا عمل مؤثر واقع ہوگا اور دُوسرا پہلو، وہ موجودہ یا آئندہ حقیقت ہے جو اس پر پوشیدہ ہے، اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کے مؤثر نہ ہونے کے باوجود یہ امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ فی الواقع یہ مؤثر واقع ہو، اس لئے کہ انسان کا علم واقع کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ واقع انسان کے علم سے وسیع تر ہوتا ہے۔ امر و نہی کا تعلق واقع کے ساتھ ہے، ہماری ظاہری نظر اور محدود فکر کے ساتھ نہیں۔

ہم بنی اسرائیل کے مچھلی کے ناجائز شکار کے اس واقعہ کے آخر میں یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں عذابِ الٰہی سے صرف وہی لوگ محفوظ رہے جو امر بالمعروف اور نہی از منکر کر رہے تھے۔ باقی سب عذاب میں گرفتار ہوئے، اگرچہ سب کا عذاب یکساں نہ تھا:

''فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ. فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ''. (7:165-166)

''پس جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو برائی سے روکتے تھے اور ہم نے ظلم کرنے والوں کو ان کے گناہ کے باعث برے عذاب میں مبتلا کر دیا اور جب انہوں نے اس نہی کی مخالفت کی تو ہم نے انہیں کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ''۔

اس آیہ شریفہ کی رُو سے صرف وہی لوگ عذاب سے محفوظ رہے جنہوں نے فریضہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کو انجام دیا تھا۔ اس فریضہ کو ترک کرنے والے اور اس فریضہ کو انجام دینے والوں کو منع کرنے والے بھی عذاب پانے والوں میں داخل ہوگئے۔ لیکن ان کا عذاب کیا تھا؟ اس کا ہمیں علم نہیں۔ مسخ ہونے کا عذاب صرف اُن لوگوں کیلئے تھا جو اس مجرمانہ کارروائی میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے یعنی مچھلی کا شکار کرنے والے جنہیں بندروں کی صورت میں مسخ کر دیا گیا۔

امر بالمعروف اور نہی از منکر اُمتِ اسلامی پر واجبِ کفائی ہیں، بایں معنی کہ:

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ".

کی روشنی میں ایک ایسے گروہ کی موجودگی اسلامی اُمت میں ضروری ہے جو بھلائی کی طرف دعوت، امر بالمعروف، نہی از منکر کے تین شعبوں میں دعوت الی اللہ کے مقدس فریضہ کو انجام دے اور اُمت ِ اسلامی کی خیر وسعادت کے اسباب فراہم کرے۔

بنابرایں اُمتِ اسلامی میں ترک ہونے والے واجب یا انجام پانے والے حرام کی ذمہ داری پورے معاشرے پر عائد ہوتی ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو اپنی توانائی اور امکانات کی مناسبت سے فریضہ امر بالمعروف اور نہی از منکر ادا کرتے ہیں۔ جماعتِ نگہبانِ اسلام کی تشکیل پوری اُمت پر واجب ہے۔ جو لوگ اپنی صلاحیت اور توانائی کے مطابق امر بالمعروف اور نہی از منکر کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، اُن پر لازم ہے کہ ایسے ہی صلاحیت رکھنے والے خاموش تماشائیوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں اور اس کے بعد مل کر اس فریضہ کو انجام دیں۔ اگر پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہو تو مزید افراد کو اس جماعت میں بھرتی کرنے کا یہ سلسلہ برابر جاری رکھیں، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ایک مؤثر اور کارآمد جماعت معرضِ وجود میں آجائے جو فریضہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کو اس طرح انجام دیں کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل کا منہ کالا ہو۔

مسئلہ: 718 اگر کوئی شخص ایسے واجب کا حکم دے جس پر وہ خود عمل کرتا ہو لیکن کسی اور واجب کو ترک کرتا ہو تو کیا اس صورت میں امر بالمعروف کرنا اس پر حرام ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر صرف اُس صورت میں حرام ہے جب امر کرنے والا ایسے واجب کا امر کرے جسے وہ خود انجام نہ دیتا ہو یا ایسے منکر سے نہی کرے جس کا وہ خود مرتکب ہوتا ہو۔ آیات وروایات میں بھی اس کی سرزنش اور مذمت کی گئی ہے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی از منکر کو انجام دینے کیلئے عدالتِ مطلقہ کی شرط ہوتی تو اس فریضہ کی ادائیگی کیلئے کافی افراد کی

موجودگی کبھی ممکن نہ ہوتی۔

علاوہ ازیں امر بالمعروف اور نہی از منکر کو واجب کرنے والی آیات و روایات کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی از منکر کے قبول کرنے کو واجب کرنے والی آیات و روایات بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ امر و نہی کرنے والوں کیلئے عادلِ مطلق ہونا ضروری نہیں ہے۔ جس طرح امر و نہی کرنے والے پر امر و نہی کرنا واجب ہے، اسی طرح اگر کوئی اسے امر بالمعروف اور نہی از منکر کرے تو اس پر واجب ہے کہ اسے قبول کرے، جیسا کہ:

''وَاْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ''. (6:65)

''ایک دُوسرے سے امر بالمعروف قبول کرو''۔

''كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ''. (79:5)

''ایک دُوسرے سے امر نہی از منکر کو قبول نہیں کرتے تھے''۔

ان آیات کی رُو سے یک طرفہ امر و نہی کی مذمت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ انسان خود امر کرے اور دُوسروں کے امر کو قبول نہ کرے۔ دُوسروں کو نہی کرے اور خود اُن کی نہی کو قبول نہ کرے۔

بہرصورت دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی از منکر کے فرائض کو انجام دینے والا ادارہ یعنی وزارتِ ارشادِ اسلامی کی تشکیل اسلامی حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے تاکہ ان تین فرائض کو منظّم طریق کار کے تحت انجام دیا جائے، اگرچہ اس وزارت کے قیام کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ عامۃ المسلمین ان تین فرائض کو ادا نہ کریں، خصوصاً اگر وزارتِ ارشاد میں نقص اور کوتاہی موجود ہو تو اس صورت میں خود اس وزارت کو امر بالمعروف اور نہی از منکر اور دعوت الی الخیر کے تین ابعاد میں ہدایت کرنے والوں کی موجودگی ضروری ہے۔

تمام مسلمان ہرصورت میں ان عظیم فرائض کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ صرف بعض افراد یا بعض جماعتوں کی ذمہ داری نہیں ہے، اگرچہ جماعتِ نگہبانانِ اسلام کی تشکیل اس سلسلہ کی

سب سے اہم ذمہ داری ہے۔

احکامِ اسلام کو سیکھنا، سکھانا اور پھر خود اس کا گرویدہ ہونا اور دُوسروں کو اس کا گرویدہ بنانا، خود اس پر عمل کرنا اور دُوسروں کو عمل پر مائل کرنا، تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ ہر شخص پر اس کی صلاحیت اور قوت کے مطابق اس ذمہ داری کو انجام دینا اور اس میں دُوسروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے، جیسا کہ سورۂ مبارکہ والعصر میں ایمان اور عمل صالحات کے بعد تو اصو بالحق، عقیدۂ حق، علم حق، عمل حق کے مثبت پہلو اور تو اصو بالصبر، ان کے منفی پہلو کے بارے میں تمام مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد کردی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ ایک دُوسرے کو واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کی وصیت کرتے رہیں۔

بعض گناہوں کا بیان

جھوٹ

مسئلہ: 719 جھوٹ ایسی بات کو کہتے ہیں جو خلافِ واقع ہو۔ قرآن شریف میں تقریباً تین سو مرتبہ مختلف الفاظ اور صورتوں میں اس کا ذکر بہت زیادہ مذمت کے ساتھ آیا ہے۔ جھوٹ کے کئی پہلو ہیں۔ بعض اوقات یہ تمام عقیدتی اور واقعی پہلوؤں میں جھوٹ ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جھوٹ بولنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے، نہ تو وہ خود واقعیت رکھتا ہے اور نہ ہی جھوٹ بولنے والا اس پر اعتقاد رکھتا ہے۔ کبھی اس میں ایک پہلو پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے والا اس پر اعتقاد نہیں رکھتا، اگرچہ وہ حقیقت ہو یا اس کے برعکس وہ اعتقاد رکھتا ہو، اگرچہ وہ بات خلافِ حقیقت ہو۔ یہ تینوں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف ہونے کے باوجود جھوٹ ہیں۔ بعض اوقات ایک چیز عقیدہ، نیت اور حقیقت کے لحاظ سے سچ ہوتی ہے لیکن بظاہر جھوٹ کی صورت ہوتی ہے۔ اس صورت میں اسے توریہ کہتے ہیں۔ جو بات ان چاروں پہلوؤں سے خالی ہو، وہ بالکل سچ ہے۔

مسئلہ: 720 جھوٹ صرف خلافِ واقع خبر ہی کو نہیں کہا جاتا بلکہ وہ انشاء جس میں خبر کا پہلو پایا

جاتا ہو، اس میں بھی جھوٹ ہوسکتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ آئیں کھانا کھائیں اور درحقیقت نہ دسترخوان لگا ہواور نہ ہی کھانا موجود ہوتو اسے بھی جھوٹ شمار کیا جائے گا، حتیٰ کہ اگر دونوں میں سے کوئی ایک موجود ہواور دُوسری چیز موجود نہ ہوتو بھی یہ جھوٹ ہے، اس لئے کہ یہ بات ایک ایسی خبر کی حیثیت رکھتی ہے جو خلافِ واقع ہے۔

مسئلہ: 721 جھوٹ کی مندرجہ بالا چاروں صورتوں میں سے ہر ایک دائمی اور ہمہ گیر قاعدہ کی رُو سے حرام ہے اور اخبار وانشاء دونوں صورتوں میں حرام اور باطل ہے، سوائے ان صورتوں کے جن میں قرآن وسنت کی رُو سے مستثنیٰ ہوا ہے یا جہاں قرآن وسنت کے واضح دلائل کی رُو سے اپنے سے زیادہ اہم یا مساوی واجب سے ٹکرا جائے تو پہلی صورت میں واجب اور دُوسری میں جائز ہوگا۔ اگر انسان ایک جیسے چند جھوٹ میں سے ایک جھوٹ بولنے پر مجبور اور مضطر ہو جائے تو ان میں سے ایک حلال ہوگا، سب نہیں۔

اگر جان و مال وآبرو وناموس یا کسی اور ایسی چیز کی حفاظت کی خاطر جھوٹ بولنا پڑ جائے تو اس صورت میں نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ اسی طرح قابل اصلاح افراد کے درمیان اصلاح کیلئے جھوٹ بولنا بھی حرام نہیں ہے بلکہ بعض اوقات واجب ہے، اس لئے کہ اس کا فائدہ اور مصلحت زیادہ ہے۔ اسی طرح تقیہ کی صورت میں اہمیت کے درجات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کی حرمت زائل ہو جاتی ہے، اگر جھوٹ بولنے کا خطرہ سچ کے ضرر سے کمتر ہو۔

مسئلہ: 722 جن موارد پر جھوٹ بولنا جائز یا واجب ہے، وہاں حتی الامکان توریہ سے کام لینا چاہئے جس کے معنی یہ ہیں کہ جھوٹی بات سے سچے معنی کا ارادہ کیا جائے تاکہ حتی الامکان خلافِ واقع گفتگو سے اجتناب کیا جاسکے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑنے کے بعد نمرودیوں کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

"قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَافَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا

یَنطِقُوْنَ". (63:21)

"بلکہ یہ بت شکنی اس بڑے بت نے انجام دی ہے، تم خود انہی سے پوچھ لو، اگر یہ بات کرتے ہیں"۔

یہاں "اگر بات کرتے ہیں" کا تعلق بت توڑنے سے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر یہ بات کرتے ہیں تو انہیں اس بڑے بت نے توڑا ہے لیکن چونکہ یہ بات نہیں کر سکتے، لہٰذا یہ کام اس کا نہیں ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ سے بچنے کے ساتھ ساتھ ان کے خوابیدہ شعور کو بھی جھنجھوڑ دیا اور وہ یہ اعتراف کرنے لگے:

"ثُمَّ نُكِسُوا عَلٰى رُؤُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ".

"وہ سر جھکائے یہ کہنے لگے کہ تم جانتے ہو کہ یہ بات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے"۔(64:21)

اسی طرح جب نمرودیوں نے ان کی طرف سے بتوں کو درپیش خطرات کا سدِباب کرنے کیلئے عید کے دن انہیں اپنے ساتھ شہر سے باہر چلنے کو کہا تو انہوں نے کہا: "انی سقیم"، "میں بیمار ہوں"۔ یہاں بیماری سے مراد وہ رُوحانی درد اور اذیت تھی جو انہیں اپنی قوم کی بت پرستی سے ہوتی تھی۔ بہر حال جہاں تک توریہ ممکن ہو، خالص جھوٹ بولنا حلال نہیں ہے، اس لئے کہ صرف اضطرار ہی جھوٹ کے حلال ہونے کا باعث ہوسکتا ہے۔ پس جس کیلئے توریہ ممکن ہو، وہ خالص جھوٹ بولنے پر مضطر نہیں ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ قاعدہ "اَلضَّرُوْرَاتُ تُقَدَّرُ بِقَدَرِهَا" کی رُو سے مجبوری کی حالت میں ضروری چیزیں ضرورت کی مقدار میں ہی جائز ہوتی ہیں۔ جب توریہ، جو ایک خفیف قسم کا جھوٹ ہے، اس کے ذریعے ضرورت برطرف ہوسکتی ہو تو اس صورت میں خالص جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

مسئلہ: 723 چونکہ توریہ بھی جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا استثنائی حالات میں جائز یا واجب ہے، اس لئے کہ جو بات سننے والے کے ذہن کو واقع کے خلاف لے جائے، اس کا بڑا حصہ جھوٹ ہے اور یہ بھی حرام ہے۔ عام حالت میں کسی عذر اور مجبوری کے بغیر اس پر بھی جھوٹ کا حکم جاری ہوگا۔

شریعتِ مقدسِ الٰہی مؤمنین سے یہ چاہتی ہے کہ وہ حتی الامکان صداقت کی راہ اختیار کریں اور ہر قسم کی غلط بیانی اور خلافِ واقع گوئی سے پرہیز کریں۔ جھوٹ کی یہ چاروں اقسام ان میں پائے جانے والے اختلاف کے باوجود جھوٹ کے زمرے میں آتی ہیں اور حرام ہیں۔ اس کی پہلی تین صورتیں ایک دُوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود جھوٹ کے زمرے میں آتی ہیں اور حرام ہیں۔ اس کی پہلی تین صورتیں تو ہرگز جائز نہیں ہیں، اس لئے کہ ضرورت اور مجبوری کی صورت میں توریہ کرنا بھی ممکن نہ ہوتو اس صورت میں:

"لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا".

"خدا کسی پر اس کی قوت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا"۔ (286:2)

مسئلہ: 724 جس طرح جھوٹ کی مختلف اقسام کے ظاہری پہلو اور معانی یکساں نہیں ہیں، اسی طرح ان کی حرمت بھی یکساں نہیں ہے۔ جس قدر معنی کے لحاظ سے اس کا قبح زیادہ ہوگا، اس کی حرمت بھی زیادہ ہوگی۔ مثال کے طور پر کسی جھوٹے حکم کو خدا کی طرف منسوب کرنا اور عام گفتگو میں کسی کی طرف جھوٹ منسوب کرنا ہرگز یکساں نہیں ہے، اس لئے کہ پہلا جھوٹ کفر یا کفر کی سرحد پر ہے اور دُوسرا ایک عام گناہ اور فسق ہے۔

مسئلہ: 725 کیا صرف ضرررساں جھوٹ ہی حرام ہے کہ اگر کوئی جھوٹ ضرررساں نہ ہوتو حرام نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن آیات اور روایات میں جھوٹ کی مذمت اور جھوٹ بولنے والوں کی سرزنش کی گئی ہے، وہ صرف ضرررساں جھوٹ سے مختص نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں جھوٹ کا ضرر

صرف یہی نہیں ہے کہ جس شخص سے جھوٹ بولا جائے، اس کو ضرر ہو بلکہ پہلا ضرر خود جھوٹ بولنے والے کو ہوتا ہے کہ اس نے خود کو غلط بیانی اور حقائق کو اُلٹا کر پیش کرنے کے جرم سے آلودہ کیا ہے۔ سچی بات، سچی سوچ، سچا عقیدہ اور سچا عمل یہ سب سچائیاں اللہ تعالیٰ پر سچے ایمان کا نتیجہ اور اس کی تقویت کا باعث ہیں اور ان میں کبھی کجی پیدا نہیں ہوسکتی، حتی الامکان یہ جھوٹ سے آلودہ نہیں ہوتیں۔

مسئلہ: 726 وہ جھوٹ جو گناہ ہے، صرف بات کی حد تک نہیں ہے بلکہ جھوٹا عمل، جھوٹی تحریر، جھوٹی خاموشی اور ہر وہ چیز جس کے ذریعے حقائق کو اُلٹا کر کے دکھایا جائے، جھوٹ اور گناہ ہے۔ اگر انسان جھوٹ کے سامنے خاموشی اختیار کرے تو یہ اس کی تصدیق ہے اور جھوٹ شمار ہوگی۔ اسی طرح کسی بے بنیاد چیز کو لکھنا یا اس کی تصدیق کرنا یا ہر وہ عمل اور اشارہ جو کسی حقیقت کی پردہ پوشی کرتے ہوئے اس کی غیر حقیقی تصویر پیش کرے، یہ سب جھوٹ اور گناہ ہیں، اگرچہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، ان کی قباحت کے مراتب مختلف ہونے کے لحاظ سے ان کا گناہ اور حرمت بھی یکساں نہیں ہے۔

مسئلہ: 727 جھوٹ یا توریہ صرف ایسے اضطرار یا تقیہ میں حلال ہوتے ہیں جو انسان کا اپنا پیدا کیا ہوا نہ ہو، اس لئے کہ:

"اِلَّا مَااضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ". (119:6)

کی رُو سے ایسے اضطرار میں حرام کو حلال قرار دیا گیا ہے جو انسان کے اپنے اختیار کے بغیر پیش آئے، اس لئے کہ آیہ شریفہ میں صیغہ مجہول استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "اگر تم مضطر ہو جاؤ"، نہ یہ کہ اپنے آپ کو مضطر بنا دو۔

بنابرایں جھوٹ اور توریہ صرف ایسے تقیہ اور اضطرار میں حلال ہیں جو آپ کا اپنا پیدا کردہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے اضطرار میں حرام ہے کہ بنیادی طور پر یہ فعل حرام ہے اور خود ساختہ اضطرار اس کے حلال ہونے کا موجب نہیں بن سکتا۔ اسے ترک کرنا اس لئے حرام ہے کہ جان یا مال جیسی چیز کی حفاظت، جو خود واجب ہے، اس پر موقوف ہے اور ممکن ہے کہ اسے ترک کرنا اس کے انجام دینے

سے زیادہ حرمت رکھتا ہو۔

مسئلہ: 728 آپس میں اصلاح کیلئے جھوٹ بولنا بذاتِ خود ایک اخلاقی ضرورت ہے، اس لئے کہ مؤمن پر واجب ہے کہ آپس کے اختلافات کو برطرف کرنے کیلئے ہر ذریعے کو بروئے کار لائے۔ آیہ شریفہ:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ".

"تمام مؤمن ایک دُوسرے کے بھائی ہی تو ہیں، پس اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرو" (10:49)۔

ان آیات کی رُو سے اصلاحِ ذات البین مسلمانوں کے اجتماعی اور معاشرتی فرائض میں سے ہے۔ وہ جھوٹ جو فساد نہ رکھتا ہو یا اس کا فساد اصلاح سے کمتر ہو، واجب ہے، جیسا کہ روایات میں بھی اس کی تصریح کی گئی ہے۔

صحیحہ عمار بن معاویہ میں آیا ہے کہ "اصلاح کرنے والا دروغ گو نہیں ہے" اور یہ کہ "ہر جھوٹ بولنے والے سے پوچھ گچھ ہوگی مگر تین چیزوں کے متعلق، جن میں سے ایک اصلاحِ ذات البین ہے ___ حدیثِ یحییٰ واسطی میں ہے کہ کلام کی تین اقسام ہیں: سچ، جھوٹ اور اصلاحِ ذات البین۔

غیبت

مسئلہ: 729 غیبت اسے کہتے ہیں کہ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں ایسی بات کی جائے جو اُسے ناپسند ہو۔ قرآنی آیات اور روایات میں اس کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ان روایات میں سے ایک روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ "غیبت زنا سے بھی شدید گناہ ہے، اس لئے کہ انسان زنا کرتا ہے اور بعد میں توبہ کر لیتا ہے تو خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کی توبہ قبول نہیں کرتا، جب تک اسے وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی اُس

نے غیبت کی ہے۔

اسی طرح آنحضرتؐ سے ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جو شخص اپنے مؤمن بھائی کی غیبت کرتا ہے اور اس کے عیب کو ظاہر کرتا ہے، اس راہ میں اس کا پہلا قدم ہی اسے جہنم میں لے جاتا ہے۔

اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ کمترین کفر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مؤمن بھائی کی کوئی بات اس لئے ذہن نشین کرے کہ اُسے ذلیل ورُسوا کر سکے۔ ان لوگوں کیلئے خدا کے ہاں کوئی نصیب نہیں ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص کسی مؤمن کے بارے میں ایسی بات کرے جو اُس نے اپنی آنکھ سے دیکھی یا کان سے سنی ہو اور بات کرنے کا مقصد اُسے بے آبرو کرنا اور اُس کی جوانمردی کو پامال کرنا ہو تو یہ شخص اُن لوگوں کے زمرہ میں آتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

'اِنَّ الَّـذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ' (19:24)

''یقیناً جو لوگ مؤمنوں کے درمیان برائی کو پھیلانا چاہتے ہیں، اُن کیلئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے''۔

جب اصلاحِ ذات البین کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: ''اگر کسی شخص کے بارے میں کوئی ایسی بات سنو جو اُس کی ناراضگی کا باعث ہو تو اسے کہو کہ فلاں شخص، غیبت کرنے والا، تمہاری ایسے ایسے تعریف کر رہا تھا''۔

اسی طرح کتاب الاخوان میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ ''اگر کوئی شخص اپنے دینی بھائی کے بارے میں سچی بات کرے اور اس کو غمگین کر دے تو وہ اللہ کے ہاں جھوٹا محسوب ہوگا۔ اگر کوئی شخص اپنے دینی بھائی کے بارے میں ایسی بات کرے جو اُس کیلئے سودمند ہو تو یہ شخص خدا

کے ہاں راست گو محسوب ہوگا‘‘۔

آیات میں غیبت کی بہت مذمت کی گئی ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ط‘‘.

اے ایمان والو!’’اور تم میں کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ جبکہ تم اسے بہت ہی ناپسند کرتے ہو‘‘۔(12:49)

ہم دیکھتے ہیں کہ’’بعضکم‘‘ کا لفظ استعمال کر کے تمام مسلمانوں کو ایک ہی شخص کی مانند قرار دیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس عظیم پیکر کا ایک عضو ہے اور ایک دُوسرے کی غیبت کرنا اپنے آپ کو داغدار بنانے کے مترادف ہے۔

’’وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ‘‘. (1:104)

’’ہلاکت ہے ہر غیبت کرنے والے،عیب جوئی کرنے والے کیلئے‘‘۔

’’لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ‘‘. (148:4)

’’اللہ پسند نہیں کرتا (ناپسند کرتا ہے)، بری بات ظاہر کرنے کو، مگر اس سے جو مظلوم واقع ہوا ہو‘‘۔

اس لئے کہ مظلوم کی آواز ظالم کی رُسوائی کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ ظلم کی کمی کا موجب بھی بنتی ہے۔

’’اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ‘‘. (19:24)

’’یقیناً جو لوگ مؤمنوں کے درمیان برائی کو پھیلانا چاہتے ہیں، اُن کیلئے دردناک عذاب ہے‘‘۔

مسئلہ: 730 آیات وروایات کی رُو سے صرف مسلمان کی غیبت حرام اور اس میں صرف

اسلامی اخوت ہی شرط ہے۔ بنابرایں آیات و روایات کی رُو سے شیعہ بھائیوں کی طرح ہمارے سنی بھائیوں کی آبرو بھی محترم ہے اوران کی غیبت بھی حرام ہے، اس لئے کہ آیہ شریفہ:

''فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ ط''.(11:9)

''اگروہ (شرک سے) توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں''۔

یہ آیت اخوتِ دینی اور اسلامی برادری کا واضح اور روشن معیار مقرر کررہی ہے۔ یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ شیخ مرتضٰی انصاری، جو متاخرین میں شیخ الفقہاء علی الاطلاق ہیں، شیعہ بچوں کی غیبت کو حرام اور سنی برادران کی غیبت کو جائز اور حلال سمجھتے ہیں اور شیعہ بچوں کی غیبت کی حرمت پر یوں استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت ''وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ''(220:2) میں ''فی الدین'' کا اضافہ کرکے، جو آیت میں نہیں ہے، شیعہ بچوں کو دینی بھائی ثابت کرکے:

''اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ ط''.(12:49)

''کیا تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ جبکہ تم ہرگز یہ پسند نہیں کرتے ہو'' کی رُو سے ان کی غیبت کو حرام قرار دیتے ہیں، حالانکہ ''فی الدین'' سورۂ توبہ میں ہے جو شرک سے توبہ کرکے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے تمام افراد کو ایک دُوسرے کا بھائی قرار دیتی ہے۔ یوں غلط اور بے جا استدلال کا نتیجہ غلط اور بے جا فتویٰ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری فقہ اور فقہاء قرآن شریف سے دُور ہیں۔

بہرحال غیبت کی حرمت کا ایک عمومی قاعدہ یہ ہے کہ ہر مکلّف مسلمان کی غیبت حرام ہے۔ ان کے بچوں کی غیبت حرام نہیں ہے مگر یہ کہ آگاہ ہونے کی صورت میں وہ آزردہ خاطر ہوتے ہوں،

اس لئے کہ کسی کو رنج دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر انہیں اس کا علم نہ ہو تو حرام نہیں ہے، اس لئے کہ وہ جو کام بھی انجام دیں، وہ حرام یا واجب نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا کرنا اور نہ کرنا ان کیلئے کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس قسم کے افعال میں ان کی غیبت ہوتی ہی نہیں ہے۔

غیر مسلموں اور منافقوں کی غیبت بھی صرف اسی صورت میں حرام ہے کہ اگر انہیں اس کا علم ہونے سے اذیت ہوتی ہو، اس لئے کہ کسی کو اذیت دینا جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اذیت کا مستحق ہو ورنہ عام طور پر ان کی غیبت حرام نہیں ہے۔

مسئلہ: 731 غیبت کی حرمت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے پوشیدہ گناہ ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف کسی کی آبرو جاتی ہے بلکہ دُوسرے لوگوں کو بھی گناہ کی طرف رغبت ہوتی ہے، اس لئے کہ گناہ جس قدر زیادہ منظر عام پر آئیں، اُسی قدر معمولی ہو جاتے ہیں اور ان کے ارتکاب کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ:

''اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ''. (19:24)

'جو لوگ مؤمنین میں برائی کو پھیلانا چاہتے ہیں، ان کیلئے المناک عذاب ہے'۔

''لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَہۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ''. (148:4)

''اللہ بری بات ظاہر کرنے کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کوئی مظلوم واقع ہو''۔

کی رُو سے ہر وہ کام جو لوگوں کے گناہوں کو بے نقاب کرے یا گناہوں کے رائج ہونے کا سبب بنے، حرام ہے۔

غیبت کی حرمت میں ایک اور پہلو کا اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے، جب وہ شخص جس کی غیبت کی جائے، غیبت سے آگاہ ہو کر آزردہ خاطر ہو، اس لئے کہ یہ بذاتِ خود ایک گناہ ہے۔

بنابرایں غیبت میں بعض اوقات حرمت کا ایک پہلو پایا جاتا ہے کہ اس سے کسی مسلمان کے پوشیدہ گناہ ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی اس میں حرمت کے دو پہلو پائے جاتے ہیں کیونکہ گناہوں کی تشہیر دُوسروں کیلئے بھی دعوتِ گناہ ثابت ہوتی ہے۔

بعض اوقات دو پہلوؤں میں ایک اور پہلو کا اضافہ بھی ہوجاتا ہے جو کہ غیبت شدہ شخص کی آزردگیِ خاطر ہے۔ ہر غیبت میں کم از کم حرمت کا پہلا پہلو یعنی دُوسروں کے پوشیدہ گناہوں کی تشہیر ضرور پایا جاتا ہے۔اس کے بعد دُوسرے اور تیسرے پہلو کی تشکیل ہوتی ہے۔

مسئلہ: 732 جس طرح ہر مسلمان پر دُوسرے مسلمانوں کے پوشیدہ گناہوں کو ظاہر کرنا حرام ہے، اسی طرح اپنے پوشیدہ گناہوں کا اظہار بھی حرام ہے، اس لئے کہ یہ بھی ''**الجھر بالسوء**''، ''برائی کا اظہار'' اور ''**ان تشیع الفاحشه**''، ''برائی کا پھیلنا'' ہے۔اس میں بھی اپنی آبرو کو ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ گناہوں کی تشہیر بھی ہوتی ہے جس سے دُوسروں کیلئے گناہ کی راہیں کھل جاتی ہیں۔جس قدر گناہ کے خریدار بڑھتے جائیں گے، اُن کے پھیلاؤ کا پیمانہ وسیع ہوتا چلا جائے گا، خصوصاً اگر یہ پوشیدہ گناہ ایسے لوگوں کے ہوں جو عام لوگوں کی نظر میں ایمان کے ارکان سمجھے جاتے ہیں۔

بنابرایں شرعی عدالت میں بھی گناہ کا اقرار حرام ہے اور اس سے زیادہ حرام یہ ہے کہ حاکم شرعی کسی کو اقرارِ گناہ کی ترغیب دے، خصوصاً اگر اس گناہ پر حد یا تعزیر جاری ہوتی ہو، اس لئے کہ اگر گناہگار کو پاک کرنا مقصود ہو تو اس کا راستہ توبہ ہے اور یہ اُس کا اپنا کام ہے۔اگر مقصود حد یا تعزیر جاری کرنا ہو تو وہ دو عینی شاہدوں کی شہادت کے ذریعے جاری ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ غامدیہ نامی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں زنا کا اقرار کیا تو آپؐ نے اُسے حکم دیا کہ جاؤ اور استغفار کرو۔اس طرح اقرار پر حد جاری کرنے کی جگہ استغفار کو مقرر فرمایا۔

مسئلہ: 733 جو شخص اپنے گناہ کا اظہار کرتا ہے یا اس کے آشکار ہونے کی پروا نہیں کرتا، تو اس لحاظ سے اس کی غیبت جائز ہے۔ لیکن اگر یہ دُوسروں کو گناہ کی طرف مائل کرنے کا سبب بنے تو حرام ہے، اس لئے کہ غیبت کی حرمت انفرادی اور اجتماعی حق پر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے حق کو خود ضائع کر دے تو معاشرے کا حق پھر بھی اپنی جگہ پر ثابت اور برقرار رہے گا۔

مسئلہ: 734 بعض صورتوں میں یہ اجتماعی اور معاشرتی حق بھی باقی نہیں رہتا۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ جس شخص کی غیبت کی جارہی ہو، وہ ایسا ظالم ہو جسے معاشرے میں رُسوا کرنا ضروری ہو تا کہ اس کے ظلم کے سامنے رُکاوٹ پیدا کی جائے یا اس کے مقام اور شخصیت کو لوگوں کی نظر میں گرایا جائے تا کہ لوگ اس سے دُوری اختیار کریں۔ ''**الا من ظلم**''، ''سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو''، اسی صورت کے پیش نظر ہے۔

مسئلہ: 735 یہ مظلومیت بھی دو پہلو رکھتی ہے: ایک ذاتی اور دُوسرا عمومی، جس میں مسلمانوں کی ایک جماعت یا اسلام مظلوم واقع ہوتے ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں میں ظالم کا ذاتی حق (آبرو کی حفاظت) ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ عمومی معاشرتی حق (معاشرے میں برائی کی تشہیر نہ ہو) بھی باقی نہیں رہتا۔

دُوسرے الفاظ میں اہم اور مہم (کم اہمیت والی چیز) کے درمیان تصادم کی صورت میں اہم مقدم ہے جو اس صورت میں ظالم اور ظلم کے خلاف اعلانیہ جنگ ہے۔

مسئلہ: 736 اگر کسی شخص پر ہونے والا ظلم اُس کی تشہیر کے مفاسد کے مقابلہ میں کم ہو تو اس صورت میں بھی تصادمِ اہم و مہم کے قانون کی رُو سے اس کی تشہیر حرام ہے بلکہ اس ظالم کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے جو اس ظلم سے بدتر نتائج کا موجب نہ ہو۔

مسئلہ: 737 اگر گناہ یا ظلم کی تشہیر کے نتائج خود ظلم اور گناہ کے مفاسد کے برابر ہوں تو اس صورت میں ان کی تشہیر جائز ہوگی۔ اگر یہ نتائج خود اس ظلم کے مفاسد سے کمتر ہوں تو اس صورت میں

اس کی تشہیر واجب ہوگی۔

مسئلہ: 738 غیبت اور اسی طرح دُوسرے گناہوں میں جب چند گناہ ایک دُوسرے سے ٹکرا رہے ہوں تو جس کا فساد سب سے کم ہے، اُسے اختیار کیا جائے گا۔فساد کے کم یا زیادہ ہونے کا موازنہ قرآن وسنت کی رُو سے کیا جائے گا، اس لئے دُوسرے موازین کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اب غیبت کے چند اور استثنائی موارد بیان کئے جاتے ہیں، جہاں غیبت حلال یا واجب ہو جاتی ہے:

مسئلہ: 739 کسی شخص کی ایسے شخص کے سامنے غیبت کرنا جو اسے گناہ سے روک سکتا ہو یا واجب پر مجبور کر سکتا ہو، تو ایسی غیبت صرف جائز ہی نہیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کی رُو سے واجب بھی ہے، اس لئے ایسی غیبت میں برائی کی تشہیر کا خطرناک پہلو بھی نہیں پایا جاتا اور غیبت شدہ شخص کی آبرو ریزی بھی اس ترکِ واجب یا فعل حرام کے نتیجہ کے مقابلہ میں ناچیز ہے۔

مسئلہ: 740 اگر کسی شخص کی غیبت کر کے اُسے کسی خطرے سے نجات دی جاسکتی ہو تو یہ غیبت واجب ہے، بشرطیکہ اس کی تشہیر کے مفاسد اس خطرہ سے زیادہ
خطرناک نہ ہوں۔یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات امام جعفر صادق علیہ السلام زرارہ کی لوگوں کے سامنے غیبت کرتے تھے تاکہ اُنہیں ان کے دُشمنوں کے شر سے محفوظ رکھ سکیں۔

بہرصورت ہر وہ غیبت جس کا فائدہ اور مصلحت غیبت شدہ شخص یا معاشرہ کیلئے اس کے مفاسد سے زیادہ ہو، ایسی غیبت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہوتی ہے۔

مسئلہ: 741 اگر کوئی شخص آپ سے کسی معاملہ، شرکت، شادی بیاہ یا کسی اور کام کے مفید ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں مشورہ کرے اور اس کی رہنمائی کرنے سے دُوسرے فریق کی غیبت لازم آتی ہو تو اس صورت میں اس مشورہ کرنے والے کے مفاد اور مصلحت اور اس کی رہنمائی کو اس کی آبرو اور احترام پر مقدم حاصل ہے اور اس کی غیبت واجب ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس مشورہ

لینے والے کی ساری زندگی تباہ ہو جائے۔

مسئلہ: 742 اگر یہ مشورہ لینے والا آپ سے نہیں بلکہ کسی اور سے مشورہ لے رہا ہو، جو اس کی صحیح رہنمائی نہ کر سکتا ہو تو اس صورت میں بھی اس کی رہنمائی اور نہی از منکر کے پیشِ نظر آپ پر واجب ہے کہ اسے اس کی کم از کم غیبت کر کے حقیقت سے آگاہ کریں۔ اس کے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کی داستانیں سنانا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: 743 غیبت صرف پوشیدہ گناہوں کو بے نقاب کرنے کا نام نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اعلانیہ گناہ کرتا ہے یا چپکے سے گناہ کر کے خود اُن کی تشہیر کرتا ہے تو اس کے گناہوں کو بے نقاب کرنا حرام نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے گناہ پہلے سے ہی بے نقاب ہیں۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں اس کی غیبت حرام نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے اس کی آبروریزی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس کی غیبت معاشرے میں برائی کے پھیلنے کا سبب بنتی ہو تو اس لحاظ سے حرام ہو جائے گی یا یہ کہ وہ شخص کسی خاص محفل میں گناہ کرتا ہو اور یہ پسند نہ کرتا ہو کہ اس محفل سے باہر لوگ اس کے گناہ سے آگاہ ہوں۔

مسئلہ: 744 جو شخص کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کرتا ہو، اس کی غیبت صرف اسی گناہ کی حد تک جائز ہے۔ دُوسرے پوشیدہ گناہوں میں اس کی غیبت حلال نہیں ہے۔ اگر اس کے اعلانیہ گناہ کو کسی ایسی جگہ بیان کیا جائے جہاں لوگ اس سے آگاہ نہ ہوں اور بالخصوص اگر یہ کام گناہ کے پھیلاؤ کا موجب بنتا ہو تو ان صورتوں میں بھی اس کی غیبت حلال نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے اس کے پوشیدہ گناہوں کی نسبت اس کی غیبت حرام ہے۔

مسئلہ: 745 اگر کچھ شاہد کسی کے خلاف جھوٹی یا ایسی شہادت دیں جس کی وہ صلاحیت نہیں رکھتے تو مشہود علیہ (جس کے خلاف شہادت دی گئی ہے) کی آبرو کی حفاظت ان جھوٹے یا غیر صالح شاہدوں کی آبرو کی حفاظت سے واجب تر ہے۔ ایسے شاہدوں کی کم از کم پردہ دری کر کے مشہود علیہ کی آبرو کی حفاظت واجب ہے۔

مسئلہ: 746 فاسق اور جھوٹے راویٔ حدیث کا پردہ چاک کرنا بھی اسی طرح واجب ہے، اس لئے کہ اس میں حفاظتِ حدیث کی شرائط موجود نہیں ہیں۔ اس کی اس خامی سے پردہ اُٹھانے کی ضرورت اس لئے ہے تا کہ سادہ لوح بلکہ محقق افراد بھی اس کی روایت کو قبول کر کے اس دروغ پردازی میں مبتلا نہ ہو جائیں اور نہ ہی دُوسروں کو مبتلا کریں۔

مسئلہ: 747 وہ واعظین اور خطباء جو محراب اور منبر پر مقدس اور تنہائیوں میں کچھ اور ہوتے ہیں، اُن کا حکم بھی وہی ہے جو اُوپر گزر چکا ہے، اس لئے کہ ایسے واعظ اور علماء درحقیقت ایسے بھیڑیئے ہیں جو گڈریئے کا رُوپ اختیار کئے ہوئے ہیں اور جس ماحول میں یہ لوگ نام نہاد تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہیں، وہاں ان کو رُسوا کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ: 748 اسی طرح دین میں بدعت گزاری کرنے والے افراد کو رُسوا کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ یہ ایسا فتنہ ہے جو قرآن شریف کی متعدد آیات کی رُو سے قتل سے بھی بدتر ہے۔ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت ہے کہ جب میرے بعد تم بدعت گزاروں اور شک وشبہ ایجاد کرنے والوں کو دیکھو تو ان سے اعلانیہ بیزاری کا اظہار کرو اور جہاں تک ہو سکے، انہیں سب و طعن و بہتان کا نشانہ بناؤ تا کہ اسلام میں خرابی اور فساد ایجاد کرنے کا ان کا خواب پورا نہ ہو سکے اور لوگ ان سے اجتناب کرتے ہوئے ان کی باتوں اور بدعتوں کے جال میں نہ آئیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی اور تمہارے درجات میں اضافہ ہوگا۔

مسئلہ: 749 ہر مزدور، سرکاری ملازم، تاجر، کاشتکار، ڈاکٹر، معلم یا ہر وہ شخص جس کی طرف لوگ اپنے مختلف دینی یا دُنیوی کاموں کیلئے رجوع کرتے ہیں، اگر بے ایمان اور خائن ہو اور لوگوں کیلئے نقصانات کا باعث ہو تو اس صورت میں صرف لوگوں کے ساتھ اس کے رابطہ کی حد تک اس کا پردہ چاک کرنا چاہئے۔ دُوسرے تمام موارد جو مذکور ہوئے ہیں، ان میں بھی ایسے ہی ہے۔

مسئلہ: 750 جن افراد کی حقیقت کو ظاہر کرنا اور ان کا پردہ چاک کرنا جائز یا واجب ہے، یہ

صرف اسی صورت میں ہے جب افشا گری کرنے والا اس کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ بایں معنی کہ وہ خود آگاہ اور عالم ہو یا صالح اور بابصیرت مؤمن ہو ورنہ ہر کس و ناکس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اصلاحِ معاشرہ میں لوگوں کی آبروریزی کر کے ایک افراتفری کی صورتِ حال پیدا کرتا رہے، جیسا کہ بعض احمق اور نادان، انقلابی ہونے کے گھمنڈ میں آ کر لوگوں کی عزت اور آبرو کو پامال کرتے رہتے ہیں۔

''وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا''.(104:18)

''اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام کرتے ہیں''

حالانکہ اسلامی معاشرے کی پاکیزہ فضا کو غیبت اور تہمت سے آلودہ کر کے لوگوں کی عزت و آبرو کے لئے خطرات پیدا کرتے ہیں جو بذاتِ خود فساد فی الارض اور مواخذہ کے قابل ہے۔

مسئلہ: 751 غیبت میں جو چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کے پوشیدہ گناہ کو بے نقاب کیا جائے۔ پس اگر دو یا چند افراد کسی کے پوشیدہ گناہ سے آگاہ ہوں تو ان کا آپس میں اس گناہ کے حوالے سے اس شخص کے بارے میں گفتگو کرنا غیبت کے لحاظ سے حرام نہیں ہے، مگر یہ کہ اہانت اور مسخرہ پن کے زمرہ میں آتی ہو، اس لئے کہ غیبت کے مذکورہ خاص معنی کے علاوہ ایک اور عمومی معنی یہ بھی ہیں جو حدیث میں یوں بیان ہوئے ہیں:

''ذِکْرُکَ اَخَاکَ بِمَا یَکْرَھُہٗ''.

''اپنے دینی بھائی کی عدم موجودگی میں اس کا اس طرح ذکر کرنا کہ اگر اُسے علم ہو تو وہ ناپسند کرے'' اور آیہ شریفہ کی رُو سے:

''وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ''.(12:49)

''اور برادر مؤمن کی غیبت ''مردہ'' بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے''۔

''مردہ'' اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ غائب ہے اور اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور اس کا گوشت

کھانے سے مراد اس کا پردہ چاک کرنا اور اس کی آبروریزی ہے جو صرف گناہ کی صورت میں منحصر نہیں ہے، چاہے غیبت سننے والے اس سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں۔

مسئلہ: 752 اگر کسی کے ایسے گناہ یا عیب کو بے نقاب کیا جائے جو واقعاً اس میں پایا جاتا ہو تو اسے غیبت کہتے ہیں۔لیکن اگر کسی کی طرف ایسے گناہ کی نسبت دی جائے جو اس میں نہیں پایا جاتا تو یہ غیبت نہیں بلکہ تہمت اور افترا ہے، مثلاً اگر کسی شخص کے لواط یا زنا کے مرتکب ہونے کا علم نہ ہو یا علم ہو لیکن اس پر شرعی شہادت موجود نہ ہو،اس کے باوجود اس کی طرف لواط یا زنا کی نسبت دی جائے تو یہ افترا اور تہمت ہے۔اگر مجتہدِ عادل کے سامنے ایسی تہمت لگائی جائے تو اس پر واجب ہے کہ درصورتِ امکان اس افترا پرداز پر حد جاری کرے اور اسے اسّی کوڑے لگوائے،اس لئے کہ جو لوگ کسی کی طرف گناہ کی نسبت دیتے ہیں اور پھر اسے شرعی شہادت سے ثابت نہیں کر سکتے، یہ لوگ قرآن کی نص کی رُو سے حدِ افترا کے مستحق ہیں:

”فَاِذْلَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنْدَاللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ“. (13:24)

”پس اگر وہ گواہ نہ لائیں، وہ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں“۔

مسئلہ: 753 جھوٹ کی مانند غیبت اور تہمت بھی صرف بات کی حد تک محدود نہیں بلکہ تحریر، اشارہ، سکوت اور تصدیق کرنا یہ سب بھی غیبت اور تہمت کے زمرے میں آتے ہیں، اس لئے کہ ”یغتب“ ،یعنی ”غیبت کرے“ سے مراد ہر وہ کام ہے جو کسی مسلمان کے پوشیدہ گناہ کو برملا کرتا ہو۔

مسئلہ: 754 بعض اوقات بعض لوگ چالاکی اور نام نہاد شرعی حیلوں کی آڑ میں کسی مسلمان کی عزت وآبرو کو اس طرح پامال کردیتے ہیں جو غیبت سے بھی بدتر ہوتی ہے،مثال کے طور پر یہ کہ ”فلاں کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا،اُس کے بارے میں کچھ کہنا تو غیبت ہے“،اس طرح غیبت نہ کرنے کے باوجود ہر قسم کی برائی کو اس کی طرف منسوب کردیتا ہے۔اگر کوئی شخص ایسے چند پوشیدہ گناہوں میں

ملوث بھی ہوتو ایسی باتوں سے ہر قسم کے گناہ کو اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

مسئلہ: 755 غیبت کرنے کی طرح غیبت سننا بھی حرام ہے کہ:

''اَلسَّامِعُ لِلْغِیْبَةِ اَحَدُ الْمُغْتَابِیْنَ''.

مگر یہ کہ نہی از منکر کرنا مقصود ہو۔

مسئلہ: 756 غیبت سننا اور اس سے روکنا صرف اس صورت میں واجب ہے جب سننے والے کو یہ معلوم ہو کہ یہ غیبت حلال اور جائز نہیں ہے۔ اگر اسے اس کے حرام یا حلال ہونے کا علم نہ ہو تو اس صورت میں بھی نہی از منکر کرنے کا حق نہیں رکھتا، اس لئے کہ اس کا منکر ہونا معلوم نہیں ہے۔ اس کا سننا بھی احتمالاً جائز ہے، اگر چہ احتیاطاً غیبت کے حرام ہونے کے کلی اصول کی رُو سے کسی کی بھی غیبت کو نہ سنا جائے۔ مگر اس کے باوجود اس مشکوک غیبت کو حرام سمجھنا بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ناجائز غیبت کرنے والے بہت زیادہ اور دُوسرے بہت کم ہیں، لہٰذا یہ احتیاط بہت ضروری ہے کہ کسی بھی غیبت کو نہ سنا جائے، مگر یہ کہ اس کے حلال ہونے کا علم ہو، اس لئے یہ غیبت کی حرمت کے دلائل کی عمومیت اس مشکوک غیبت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ پس جب تک اس کے حلال ہونے کا یقین پیدا نہ ہو جائے، اسے سننا حرام ہے، اگر چہ اسے حرام قرار دے کر نہی از منکر کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: 757 بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ''انشاء اللہ غیبت نہیں ہے'' کہہ کر غیبت کو حلال کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ کسی کو **واجب الغیبہ** سمجھ کر اس کی غیبت کو جائز ہی نہیں بلکہ واجب بھی سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے انحرافات اور گمراہیوں سے خدا محفوظ رکھے کہ انسان ایسے بیہودہ خیالات کی بنیاد پر حرامِ خدا کو حلال کرنے لگ جائے۔

مسئلہ: 758 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث کی رُو سے ہر مؤمن دُوسرے مؤمن پر تیس حق رکھتا ہے اور وہ اس وقت تک ان سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ انہیں ادا نہ کرے یا دُوسرا خود انہیں معاف نہ کر دے۔ وہ تیس حق یہ ہیں:

1۔ اس کی لغزش سے درگزر کرے۔

2۔ پریشان حالی میں اس پر رحم کرے۔

3۔ اس کے عیوب کو پوشیدہ رکھے۔

4۔ اس کی لغزش کی تلافی کرے۔

5۔ اس کا عذر قبول کرے۔

6۔ اس کی غیبت کی تردید کرے۔

7۔ ہمیشہ اسے نصیحت کرے۔

8۔ اس سے محبت کرے۔

9۔ اس سے کیئے ہوئے عہد و پیمان اور اس کی امانت کی حفاظت کرے۔

10۔ بیماری میں اس کی عیادت کرے۔

11۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تجہیز و تدفین میں شرکت کرے۔

12۔ اس کی درخواست کو قبول کرے۔

13۔ اس کے ہدیہ کو قبول کرے۔

14۔ اچھے کاموں میں اس کی مدد کرے۔

15۔ اس کی نعمت کا شکر گزار رہے۔

16۔ اس سے صلہ رحمی کرے۔

17۔ اس کے ناموس کی حفاظت کرے۔

18۔ اس کی حاجت کو پورا کرے۔

19۔ حتی الامکان اس کی خواہش کو عملی جامہ پہنائے۔

20۔ اگر اسے چھینک آئے تو اسے **یرحمک اللّٰہ** (خدا تم پر رحم کرے) کہے۔

21۔ اس کی گمشدہ چیز کو تلاش کرنے میں اس کی رہنمائی کرے۔

22۔ اس کے سلام کا جواب دے۔

23۔ اس کے ساتھ خوش کلامی سے پیش آئے۔

24۔ اس کی نعمت کا جواب دے۔

25۔ اس کی قسم کی تصدیق کرے۔

26۔ اس کے دوست سے بھی دوستی رکھے اور دشمنی نہ کرے۔

27۔ اس کی مدد کرے، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ (ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے باز رکھا جائے اور مظلوم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کے حق کی بحالی میں اس کی مدد کرے)۔

28۔ مشکلات میں اسے تنہا نہ چھوڑے۔

29۔ اسے رسوا نہ کرے۔

30۔ جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہو اس کے لئے بھی وہی پسند کرے اور جو کچھ اپنے لئے پسند نہیں کرتا، اس کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

اگر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا ان میں سے ایک حق بھی ترک کر دے تو وہ قیامت کے دن اس کا مطالبہ کرے گا اور خدا بھی اس (حق ضائع کرنے والے) کے خلاف حکم صادر کرے گا۔

مسئلہ: 759 ان حقوق میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ہم آہنگ اور متقابل ہیں کہ اگر آپ کا کوئی دینی بھائی انہیں آپ کی نسبت ادا نہ کرے تو آپ پر بھی اس کی نسبت ان کی ادائیگی واجب نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بہرصورت واجب ہیں، مثلاً اگر وہ آپ کی مظلومیت کی حالت میں آپ کی مدد نہ کرے تو آپ پر پھر بھی واجب ہے کہ اس کی مدد کریں یا یہ کہ اس نے آپ کی غیبت میں حفاظت نہیں کی تو آپ پر اس کا حفظ الغیب واجب ہے یا اگر آپ کی ناموس، عزت اور مال

وغیرہ کی حفاظت نہ کرے تو آپ پر اس کے مال، عزت اور ناموس کی حفاظت پھر بھی واجب ہے۔ شرعی موازین کی رُو سے یہ بات معلوم اور واضح ہے کہ ان میں سے کونسا حق مستقل اور کونسا متقابل اور ہم آہنگ ہے۔

مسئلہ: 760 اگر کسی کی غیبت، غیبت کرنے والے کی نظر میں جائز اور حلال ہو اور سننے والے کی نظر میں ناجائز اور حرام ہو تو اس صورت میں سننے والے پر اس کا سننا حرام ہے لیکن اس کے باوجود وہ غیبت کرنے والے کو نہی از منکر کرنے کا حق نہیں رکھتا، اس لئے کہ نہی از منکر اس صورت میں واجب یا جائز ہوتا ہے جب اس فعل کو انجام دینے والے کی نظر میں بھی وہ فعل منکر ہو۔ لیکن اگر غیبت کو حلال جاننے والا اس کی غیبت کو حلال جاننے میں خطا پر ہو تو پہلے اسے سمجھانا چاہئے کہ وہ غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے باوجود وہ غیبت کرتا رہے تو اس صورت میں اس کی غیبت سننے کی حرمت کے ساتھ ساتھ غیبت کرنے والے کو نہی از منکر کرنا بھی واجب ہے۔

مسئلہ: 761 غیبت کی شدید حرمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ غیبت کرنے والا غیبت شدہ شخص کے بارے میں دو زبانیں رکھتا ہو، بایں معنی کہ اس کے سامنے اس کی تعریف کرتا ہو اور اس کے پسِ پشت اس کی ناجائز غیبت کرتا ہو۔ جس طرح لوگوں کو برائی سے روکنا اور خود اُسی برائی کے مرتکب ہونے کا گناہ اس برائی کے گناہ سے بڑا ہے کیونکہ:

"كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ".

"اللہ کے ہاں یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم ایسی بات کہو جس پر تم خود عمل پیرا نہیں ہوتے ہو"۔ (3:61)

اسی طرح "ذولســــانیــن"، یعنی دو زبانوں والے شخص کے اس عمل کا گناہ بھی بہت بڑا ہے۔ روایت میں ہے کہ قیامت کے دن ایسے شخص کے منہ میں دو آتشیں زبانیں ہوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ جو شخص اپنے مؤمن بھائی کے سامنے اُس کی تعریف اور پس پشت اُس کی ناجائز غیبت کرے تو ان دونوں کے درمیان رشتہ اخوت ٹوٹ جاتا ہے۔ امام محمد باقرؑ سے

روایت ہے کہ کس قدر برا ہے وہ شخص جو دو چہرے اور دو زبانیں رکھتا ہے کہ اپنے بھائی کے سامنے اس کی تعریف کرتا ہے اور پسِ پشت اسے کاٹتا ہے۔

مسئلہ: 762 کسی کے پوشیدہ گناہوں کو اس کے اور ایسے لوگوں کے سامنے بے نقاب کرنا جو ان سے آگاہ نہیں ہیں، غیبت کی مانند حرام ہے بلکہ ممکن ہے کہ بعض اوقات اس کی حرمت غیبت سے بھی زیادہ ہو، اس لئے کہ غیبت میں اسے اس کا علم نہیں ہوتا مگر یہاں اس کے اور دُوسروں کے سامنے اس کے گناہوں کو ظاہر کرنا اس کی آزردگی کا سبب بھی بنتا ہے، اگرچہ بعض حالات میں غیبت اس سے بھی بدتر ہوتی ہے، اس لئے کہ اس صورت میں تو وہ خود موجود ہے اور اپنا دفاع کرسکتا ہے جبکہ غیبت میں اس کا امکان نہیں ہوتا، خصوصاً اگر اسے اس کا علم نہ ہو۔ یہاں بھی غیبت کے استثناء ساری تفصیلات کے ساتھ جاری ہوتے ہیں۔

مسئلہ: 763 کسی مسلمان کی ہر قسم کی بلا جواز اہانت حرام ہے، اسی طرح عیب جوئی یا ورنمّامی یعنی چغل خوری بھی ''هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ'' (11:68) کی رُو سے ان گناہوں میں آتے ہیں جو موجبِ لعنت ہیں۔ اسی طرح کسی کا تمسخر اُڑانا بھی حرام ہے۔

''يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ'' (11:49)

''کوئی قوم کسی قوم اور عورتیں عورتوں سے تمسخر نہ کریں''۔

یہ سب غیبت کی مانند صرف بات اور لفظ کی حد تک محدود نہیں ہیں اور ہر طرح کا اشارہ، فعل، تحریر وغیرہ، جو اس قسم کے آثار رکھتے ہوں، اسی زمرے میں آتے ہیں۔ کسی مسلمان کو بلا جواز اذیت و آزار پہنچانا مکمل طور پر حرام ہے۔

''وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا''. (58:33)

''اور جولوگ مؤمنین اور مؤمنات کو ان کے کسی ایسے کام کے بغیر جو اذیت کا جواز فراہم کرے، اذیت پہنچائیں تو ان لوگوں نے بہتان اور بڑا گناہ اُٹھایا ہے''۔

اس آیت کی رُو سے کسی مسلمان کو صرف اسی صورت میں اذیت پہنچائی جا سکتی ہے جب اس سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو جو موجبِ سزا و سرزنش ہو۔ اس کے بغیر اسے اذیت پہنچانا ایسا ہے گویا عملی طور پر اس پر بہتان لگایا گیا ہو، اس لئے کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ایسا گناہ کیا ہے جو اس اذیت کا جواز فراہم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ مؤمنین کے معاشرہ کو اس قدر پاکیزہ ہونا چاہئے کہ کسی کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ دُوسروں کو اذیت پہنچائے مگر یہ کہ شرعاً اس کا مستحق ہو۔

مسئلہ: 764 جس طرح کسی شخص کی غیبت حرام ہے، اسی طرح کسی قوم یا گروہ کی غیبت کرنا بھی حرام ہے، مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شہر، دیہات یا محلّہ کے لوگ ایسے ویسے ہیں یا یہ کہنا کہ ان میں چند یا ایک شخص ایسا ویسا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں سب بدگمانی کا شکار ہو جائیں گے۔

قماربازی (جوا کھیلنا)

مسئلہ: 765 قمار سے مراد ہر وہ کھیل ہے جس میں ہار جیت ہو، چاہے اس میں مالی شرط ہو یا نہ ہو۔ یہ دونوں صورتوں میں حرام ہے، اس لئے کہ دونوں صورتوں میں لہو ہے اور اگر مالی شرط لگائی جائے تو اس میں مفت خوری کے پہلو کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ جو آیات اور روایات لہو کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، ان میں مالی ہار جیت کی شرط نہیں پائی جاتی بلکہ مالی ہار جیت کی صورت میں اس کے گناہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سورۂ مبارکہ مائدہ آیت 90 اور 91 میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

''يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ

وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ''.

''شراب، میسر (جوا)، انصاب اور ازلام تو ہیں ہی پلید شیطانی عمل، پس ان سے اجتناب کرو۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ شراب اور میسر کے ذریعے تمہارے درمیان دُشمنی اور عداوت پیدا کرے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے، پس کیا تم باز آنے والے ہو؟''

یہ آیات اس مدعا پر روشن دلیل ہیں کہ شیطان ان اعمال کے ذریعے دُشمنی اور اللہ سے دُوری پیدا کرنا چاہتا ہے، لہٰذا انہیں ترک کرنا ضروری ہے۔ بنابرایں ہر وہ عمل جو آپس میں بغض وعداوت کا سبب ہو اور انسان کو خدا سے غافل کر دے، حرام ہے۔ میسر (جوا) ہر صورت میں مالی ہار جیت کے بغیر بھی موجبِ بغض وعداوت اور نماز اور دُوسرے واجبات سے دُوری کا باعث ہوتا ہے۔

مسئلہ: 766 میسر یعنی جوئے کی تمام اقسام حرام ہیں، چاہے جوئے کے مخصوص آلات اور مالی ہار جیت کے ساتھ ہو، جو پہلے درجہ کا جوا ہے، یا مالی ہار جیت کے ساتھ، اگرچہ جوئے کے مخصوص آلات کے ساتھ نہ ہو۔ یہ جوئے کا دُوسرا درجہ ہے یا جوئے کے مخصوص آلات کے ساتھ مالی ہار جیت کے بغیر یعنی تیسرے درجہ کا جوا ہو یا چوتھے درجہ کا جوا ہو جس میں مخصوص آلات اور مالی ہار جیت کے بغیر جوا کھیلا جائے۔ یہ چاروں لہو ہونے کے لحاظ سے برابر اور گناہ ہیں، اگرچہ شدت اور مراتب میں مختلف ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے میسر کی تفسیر میں فرمایا:

''کُلُّمَا اَلْهٰی عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ فَهُوَ الْمَیْسِر''.

''جو چیز بھی اللہ کی یاد سے غافل کرے، وہ میسر ہے'' کہ یہاں پر مراد یہ ہے کہ اللہ کی یاد دل میں نہیں رہتی اور دل پژمردہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 767 میسر میں لہو کی حالت جس قدر زیادہ اور شدید ہوگی، اس کا گناہ بھی اُتنا ہی زیادہ ہوگا۔ انہی میں سے شطرنج بازی بھی ہے جسے فکری ورزش کا نام دے کر حلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ یہ تباہ کن اور ویران گر جوا جو بعض اوقات کئی دن بلکہ کئی ہفتے یا کئی مہینے تک طول پکڑ لیتا ہے، انسان کو بہت سے واجباتِ الٰہی اور زندگی کے ضروری کاموں سے روکے رکھتا ہے۔ اگر فکری ورزش کے خیال سے اسے حلال سمجھ لیا جائے تو پھر کسی جوئے کو بھی حرام نہیں ہونا چاہئے مگر یہ کہ اس میں مالی ہار جیت ہو، حالانکہ اس قسم کے تمام کھیلوں خصوصاً شطرنج میں حرمت کی اصلی وجہ مالی ہار جیت نہیں بلکہ حیثیت کی ہار جیت، اتلافِ وقت اور واجبات سے مانع ہونے کی وجہ سے انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ مبارکہ مائدہ کی مندرجہ بالا آیات میں ان کی حرمت کے چار اسباب بیان کئے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک حرمت کا مستقل سبب ہے اور مالی ہار جیت کی صورت میں لہو کی حیثیت سے پیدا ہونے والی حرمت میں ایک اور حرمت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: 768 جس طرح غیبت اور دُوسرے محرمات میں بعض حالات میں استثناء پایا جاتا ہے، قمار میں بھی ایسا ہے۔ معتبر نصوص کی رُو سے نشانہ بازی، تیراکی، گھوڑ دوڑ اور دوڑ میں مالی ہار جیت حلال ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی فوجی قوت میں اضافہ کرنا ہے۔

آجکل گھوڑ دوڑ کی جگہ ٹینکوں، جنگی ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں کی دوڑ لے لے گی اور نشانہ بازی میں بھی گزشتہ زمانے کی تیر اندازی کی بجائے بندوق، توپ اور میزائل کی نشانہ بازی اور تیراکی اور دوڑ میں بھی عام تیراکی اور دوڑ کے علاوہ اگر ان کی کوئی ترقی یافتہ صورت موجود ہو تو وہ بھی اس میں آجائیں گی۔

مسئلہ: 769 میسر کے لغوی معنی 'آسانی' یا 'آسانی کی جگہ' ہیں۔ ان آیات میں اس سے مراد وہ چیز ہے جو بآسانی دُشمنی، عداوت، اللہ کی یاد اور نماز سے دُوری کا باعث ہو۔ اسی طرح مال و آبرو کی

ہار جیت اور دُشمنی پیدا کرنے والے غلبہ کا بھی آسان ذریعہ ہے۔

چونکہ ان تمام گناہوں کے اسباب و وسائل بھی گناہ ہیں جن میں آسان ترین وسائل شراب اور میسر ہیں، اس لئے ان کا گناہ بھی زیادہ ہے۔ ہر وہ کام جو انسان کو حرام میں ڈالنے یا واجبات سے روکنے کا موجب ہو، حرام ہے۔ اصطلاح میں اسے ''اثم'' کہا جاتا ہے جس سے مراد ہر وہ کام ہے جو واجبات کی ادائیگی میں انسان کو سست اور محرمات کے ارتکاب میں تیز کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں خمر اور میسر کے بارے میں سوال کے جواب میں یہ کہا گیا ہے:

''قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا''. (219:2)

''ان دونوں میں بہت بڑا اثم ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فوائد بھی ہیں اور ان کا اثم ان کے فائدے سے بڑا ہے''۔

جب اثم سے مراد واجبات کی ادائیگی میں سست کرنے والا کام ہو تو اثم کبیر سے مراد وہ کام ہوگا جو واجب کی ادائیگی سے مکمل طور پر روک دے اور فعل حرام کا موجب ہو۔ مالی شرط کی صورت میں حرام خوری اور حرام خورانی کا پہلو بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کی حرمت صرف بغض و عداوت، نماز اور ذکرِ خدا سے غفلت کی وجہ سے ہوگی۔ اگر کوئی چیز انسان کو ان محرمات کے نزدیک کرتی ہو تو وہ بھی حرام ہے۔

ان چار گناہوں کے اسباب کی مانند دیگر تمام گناہوں کے نزدیک کرنے والے اسباب بھی ''اثم'' کے زمرے میں آتے ہیں اور حرام ہیں۔ ''اثم کبیر'' تو بہت بڑی چیز ہے، اس لئے کہ بغض و عداوت اور ذکرِ خدا اور نماز سے غفلت کا شمار بڑے گناہوں میں ہوتا ہے جن میں سے پہلے دو گناہ اجتماعی اور معاشرتی اور دُوسرے دو گناہ براہِ راست اللہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جو شخص ان چار گناہوں کا مرتکب ہو، گویا تمام گناہوں کی جڑ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

مسئلہ: 770 اس حرام اور باطل میسر کے مقابل حلال، واجب اور برحق میسر ہے:

''وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ''. (133:3)

''اوراپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف تیزی سے بڑھو جو متقین کیلئے تیار کی گئی ہے'' کی رُو سے مغفرتِ الٰہی کی طرف جلدی کرنا واجب ہے۔ جو چیز اس کی بآسانی انجام دہی کا سبب ہو، وہ دُوسرے اسباب کی نسبت واجب تر ہے۔

مسئلہ: 771 ہر وہ کام جو واجبات کی ادائیگی میں انسان کو سست کردے، بالکل روک دینا تو بڑی بات ہے، وہ 'اثم' ہے اور ہر قسم کا اثم قرآنی آیات کی رُو سے پر حرام ہے۔

نا چ، گانا اور موسیقی

مسئلہ: 772 ان تینوں میں سے ہر ایک، اور ان کی مانند ہر چیز، اگر لہو ہو تو حرام ہے ورنہ حرام نہیں ہے۔ ''لہو'' کے دو پہلو ہیں: ایک زندگی کے عام واجبات سے روکنا اور دُوسرا عبادتی واجبات سے روکنا۔ یہ دونوں پہلو انسان کو اس کے الٰہی واجبات کے ادا کرنے سے روکنے میں یکساں ہیں، خصوصاً عیش وعشرت اور طرب کی وہ محافل جن میں رقص وموسیقی اور گانے وغیرہ جیسے عناصر بھی موجود ہوں، خاص طور پر اگر ان میں مردوں اور عورتوں کی شرکت بھی ہو تو یہ محافل یقینی طور پر لہو اور چند لحاظ سے حرام ہیں۔

مسئلہ: 773 لہو بات جسے قرآن شریف میں لہوالحدیث کہا گیا ہے اور ہر قسم کا لہو عمل جو قرآنی آیات کی رُو سے حرام قرار دیا گیا ہے، ان میں ہر وہ بات اور عمل

آجاتے ہیں جن میں لہو کے مندرجہ بالا دونوں یا ان میں سے کوئی ایک پہلو پایا جاتا ہو۔ سورۂ لقمان کی آیت 6 میں ارشاد ہوتا ہے:

''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ

اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّیَتَّخِذَھَا ھُزُوًا ط اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ''۔

''بعض لوگ لہو بات خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو نادانستہ طور پر اللہ کی راہ سے گمراہ کریں اور اس کا تمسخر اُڑائیں، ان کیلئے ذِلت ناک عذاب ہے''۔

اس آیت کی رُو سے جو چیز لہوالحدیث میں گناہ کا اصلی محور ہے، وہ اللہ کی راہ کو حقیر جاننا، گمراہ کرنا اور گمراہ ہونا ہے، مثلاً انسان ایسے بیہودہ اور بے معنی قصے کہانیوں وغیرہ کا دلدادہ ہوجائے کہ نتیجہ کے طور پر حق کی باتوں سے دُور ہوجائے۔

مسئلہ: 774 بنابرایں یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ حوزہ ہائے علمیہ میں رائج علوم، جن کا محور اور بنیاد قرآن شریف نہیں ہے اور وہ طالب علموں کو قرآنی علوم سے دُور کرکے ان پر علومِ قرآن کے دروازے بند کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں، یہ سب علوم لہوالحدیث کے مصداق ہیں۔ ان میں دل لگانا گناہ اور گمراہی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے حوزہ ہائے علمیہ اور مدارس میں قرآن شریف ایک اجنبی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس پر توجہ دی بھی جائے تو ایک فرعی (آپشنل) درس کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اگر کبھی قرآن شریف اور حوزوی خیالات، جنہیں علم سمجھا جاتا ہے، میں تصادم کی صورت رُونما ہوجائے تو قرآنی آیات کی تاویل کی جاتی ہے: ''خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں''۔

مسئلہ: 775 ''لہو'' جو دل کو لے اُڑتا ہے، جس سے دل مردہ ہوجاتا ہے اور ایمانی رُوح کا خون ہوجاتا ہے یا وہ شہوت سے آلودہ ہوجاتی ہے اور انسان واجبات کی ادائیگی میں سست یا اس سے روگرداں ہوجاتا ہے، یہ لہو موسیقی، رقص اور گانے میں چار پہلو رکھتا ہے: کوئی حسین وجمیل عورت گانا گائے، رقص کرے اور جو کچھ گائے وہ بھی لہو ہو، ساتھ ہی ساز بھی بجائے جو کہ لہو ہے، کبھی اس میں

تین، دو یا ایک پہلو بھی ہوتا ہے۔

مسئلہ: 776 بعض اوقات خوش الحانی کرنے والا جو کچھ کہہ رہا ہوتا ہے، وہ نہ صرف دل کی موت کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اسے زندہ بھی کرتا ہے۔ لیکن وزن کے اعتبار سے طرب انگیز ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ معنوی لحاظ سے صالح اور موجبِ نصیحت ہوتا ہے، اس کے طرب انگیز وزن کی لہو والی حالت محو یا کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں حرام نہیں ہے، جیسے خوش الحانی اور دلنواز صدا کے ساتھ قرآن شریف کی تلاوت کرنا یا مرثیہ وغیرہ پڑھنا۔

مسئلہ: 777 بعض اوقات معاملہ برعکس ہوتا ہے کہ آواز بذاتِ خود لہو نہیں ہوتی لیکن جو کچھ گایا جا رہا ہو، وہ لہو ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ معنی کے لہو ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ بہر حال لہو جہاں بھی پایا جائے، چاہے موسیقی میں ہو یا آواز میں یا رقص میں یا معنی میں ہو، ان تمام صورتوں میں حرام ہے۔

مسئلہ: 778 لہو کو انجام دینا، اس سے فائدہ اُٹھانا اور لہو کی محفل میں بیٹھنا، اگرچہ آنکھیں اور کان بند بھی کر لئے جائیں، چاہے اسے ایک شخص کے سامنے انجام دیا جائے یا بہت سے لوگوں کے مجمع میں، بہر صورت اور ہر لحاظ سے حرام ہے۔

مسئلہ: 779 گناہ کی محفل میں شرکت کرنا حرام ہے، اگرچہ انسان خود اس سے آلودہ نہ ہو مگر یہ کہ نہی از منکر اور نصیحت کرنے کی غرض سے ہو، جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت 68 میں ایک عام قانون کے طور پر بیان کیا گیا ہے:

وَاِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ ؕ وَاِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ.

''جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں منفی غور و فکر کرتے ہیں تا کہ انہیں بے اثر یا

رَد کرسکیں تو ان سے روگردانی کرو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو'' ۔

اس آیت میں پہلے تو ان کافروں کی محفل میں بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے جو آیاتِ الٰہی میں منفی غور وفکر کرتے ہیں اور آخر میں ظالمین کے ساتھ بیٹھنے کو مکمل طور

پر ممنوع کر دیا گیا ہے۔اسی لئے مجلس گناہ، جس قدر بدتر ہو، اُسی قدر اس میں شرکت بھی حرام ہے۔

سورۂ مبارکہ نساء کی آیت 140 میں گناہ کی محفل میں شرکت کرنے والوں کو گناہ کا عمل انجام دینے والوں کی مانند قرار دیا گیا ہے:

''وَقَدْنَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَاسَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَاوَيُسْتَهْزَاُبِهَافَلَا تَقْعُدُوْامَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْافِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا''.

''اور یقیناً کتاب میں تم پر نازل کر دیا گیا ہے (اس سے مراد سورۂ انعام کی مندرجہ بالا آیت ہے) کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے یا تمسخر اُڑایا جا رہا ہے تو ہرگز ان کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ یقیناً اگر تم اس غیر صالح مجلس میں بیٹھو تو انہی کی مانند ہو گے۔ یقیناً اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کرے گا'' ۔

اگرچہ ان آیات میں کفر و استہزاء کی مجالس میں شرکت کو حرام قرار دیا گیا ہے لیکن آیۂ انعام میں آیت:

''فَلَا تَقْعُدْبَعْدَالذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ''(68:6)

نے ظالموں کے ساتھ ہم نشین ہونے کو بھی مکمل طور پر حرام قرار دیا ہے۔ ایسی محافل میں شرکت کرنا منافقت کی ایک صورت ہے، اس لئے کہ اگر انسان گناہ کو انجام دینے والوں کے ساتھ ہم آہنگ اور

راضی نہیں ہے تو ان کے ساتھ ہم نشینی کا کیا مقصد ہے؟

بنا برایں صرف کفار کے ساتھ کفر کی مجلس اور شراب خوروں کے ساتھ شراب خوری کی مجلس میں شرکت کرنا ہی حرام نہیں بلکہ عمومی طور پر تمام ظالمین کے ساتھ ہر قسم کے ظلم کی مجلس میں شرکت کرنا اس ظلم کی تصدیق کہلائے گی اور شرکت کرنے والا دیکھنے والوں کی نظر میں اس گناہ کے مرتکب ہونے والوں کے زمرے میں آئے گا۔ البتہ نہی از منکر یا وعظ و نصیحت کرنے کیلئے ان محافل میں شرکت کرنا حرام نہیں بلکہ واجب بھی ہے لیکن صرف واجب کی ادائیگی کی حد تک۔ اس سے زیادہ ان مجالس میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: 780 جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ لہو کی تمام صورتیں حرام ہیں، حتیٰ کہ اگر شکار میں بھی ہو۔ پس اگر کسی سفر میں جانور کے گوشت کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود جانوروں کی زندگی سے کھیلنے کیلئے شکار کیا جائے تو یہ سفر اور شکار دونوں حرام ہیں۔

مسئلہ: 781 کبوتر بازی بھی اگر لہو کی صورت اختیار کر لے تو حرام ہے ورنہ ایک حلال تفریح کے طور پر کبوتر اُڑانا، جو واجبات کی ادائیگی سے مانع نہ ہو، حرام نہیں ہے۔ 1ے

ظالموں کی مدد کرنا

مسئلہ: 782 ظالم کو ظلم میں مدد دینا بھی گناہ ہے، جو ظلم کی شدت یا ضعف کے لحاظ سے مختلف مراتب رکھتا ہے۔ آیہ شریفہ کی نص ہے:

"وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ". (2:5)

"اثم اور عدوان (گناہ اور ظلم و زیادتی) میں ایک دُوسرے کی مدد نہ کرو"۔

ے1 پتنگ بازی، بسنت، میراتھون ریس اور دیگر تفریحی سرگرمیوں کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر وہ لہو کی صورت اختیار نہ کریں، کسی کے لئے تکلیف کا سبب نہ ہوں اور ان کو انجام دیتے وقت شرعی حدود و قیود کی خلاف ورزی نہ ہو تو وہ جائز ہیں۔ (ہمدانی)

ایک اور آیت میں ہے:

''مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّکُنْ لَّهٗ کِفْلٌ منها''.

''جو کوئی برے کام میں کسی کا ساتھ دے (شفاعت کرے) تو اس کیلئے بھی اس میں سے ایک حصہ ہے''۔(83:4)

اس آیت کی رُو سے ہر قسم کے ظلم اور گناہ میں داخل ہونا ممنوع ہے اور ایسا کرنے والے کو ظلم اور گناہ کے عامل کے ساتھ ہم آہنگ، یکساں اور شریک قرار دیا گیا ہے۔

مسئله: 783 اگر ظالم سے تعاون کا نتیجہ اس کے ساتھ تعاون نہ کرنے کے نتیجہ سے واجب تر ہو تو اس صورت میں اس سے تعاون کرنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب بھی ہے، مثلاً اگر کسی چھوٹے ظلم میں اس کی مدد کر کے قتل جیسے کسی بڑے ظلم کا سد باب کیا جا سکے تو ایسا کرنا واجب ہے۔

مسئله: 784 ایسے شخص کی تعریف کرنا بھی گناہ ہے جو تعریف کے قابل نہ ہو یا اس سے بھی بدتر یہ کہ مذمت کا مستحق ہو، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت 188 میں ہے:

''لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ''.

''ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے نہیں کیا ہے، اس پر ان کی تعریف کی جائے، پس ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ یہ لوگ عذاب سے بچنے والے ہیں اور ان کیلئے المناک عذاب ہے''۔

بنابرایں ایسے لوگوں کی تعریف کرنا جھوٹ ہونے کے علاوہ ایسے شخص کی مدح سرائی بھی ہے جس کی مدح سرائی خدا کی رضا کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر حقائق کو اُلٹا کر پیش کرنا بذاتِ خود گناہ ہے، اگرچہ اس کی قباحت اس کے آثار کے لحاظ سے مختلف ہو۔



نجوم، پامسٹری وغیرہ

مسئلہ: 785 علم نجوم اور قیافہ شناسی میں اگر غیب گوئی کا پہلو پایا جائے تو یہ حرام ہیں، اس لئے کہ غیب گوئی خدا اور خاصانِ خدا کا خاصہ ہے۔ ہتھیلی یا چہرے کا مطالعہ کرکے یا فال گیری کے ذریعے غیب گوئی کرنے والے اپنے غیب نما خیالات کے ذریعے زندگی کی معمول کے مطابق سالم اور پرسکون راہوں کو دُشوار بنا دیتے ہیں اور اس حرام ذریعے سے مفت خوری کے گناہ کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔

مسئلہ: 786 جادو اور شعبدہ بازی کی تمام اقسام قرآن اور حدیث کی نص کی رُو سے حرام ہیں۔ ان کے ذریعے یا دیگر غیر شرعی وسائل کے ذریعے جرائم وغیرہ کی اطلاع دینا افتراء اور بذاتِ خود ایک جرم ہے جو شرعاً قابل مواخذہ ہے، مثلاً ان جیسے کسی ذریعہ سے کسی پر زنا، چوری یا قتل وغیرہ کی تہمت لگانا شرعاً حرام اور قابل مواخذہ ہے۔

مسئلہ: 787 امکان کی صورت میں جادو وغیرہ کو بے اثر بنانا واجب ہے۔ حدیث کی رُو سے اس کا بہترین طریقہ قرآن شریف کی ایک سو آیات کی تلاوت کرنا ہے۔ فرعونی جادوگروں کے بارے میں قرآن شریف میں ہے:

''قَالَ مُوْسٰی مَاجِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ط اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ''.

''جو تم لائے ہو، جادو ہے، یقیناً اللہ اسے باطل کردے گا''۔ (81:10)

جب عصائے موسیٰ علیہ السلام سحر کو باطل کرسکتا ہے تو قرآن شریف تو عصائے موسیٰؑ سے بھی برتر ہے جبکہ ہر قسم کے جادو فرعونی جادوگروں کے جادو کے مقابلہ میں بہت چھوٹے ہیں۔ قرآن شریف ہر قسم کے جادو کو بے اثر اور باطل کردیتا ہے اور بارہا یہ بات تجربہ سے ثابت ہوچکی ہے۔ قرآن شریف کی ایک سو آیات کی تلاوت کرنے سے صرف اس صورت میں جادو بے اثر ہوتا ہے جب ایمان اور عقیدہ کے ساتھ تلاوت کی جائے۔



گالی دینا وغیرہ

مسئلہ: 788 مؤمن کو گالی دینا اور برا بھلا کہنا حرام ہے، اس لئے کہ ایک تو یہ اس کی اذیت کا موجب ہے اور دُوسرے یہ کہ جھوٹی نسبت ہے جو اس کی طرف دی گئی ہے۔ مزید برآں یہ موجب بغض و عداوت بھی ہے بلکہ کافر کو گالی دینا بھی حرام ہے، اگر یہ موجب ہو کہ وہ مقدساتِ اسلامی کو برا بھلا کہے۔ آیہ شریفہ کے مطابق:

"وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ". (108:6)

''جو لوگ غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں، انہیں گالی نہ دو کہ وہ بھی نادانستہ اللہ کو گالی دیں گے''۔

مسئلہ: 789 اگر ایک مؤمن دُوسرے کو گالی دے تو اس کی گالی کے جواب میں گالی دینا حرام ہے، اگرچہ پہل کرنے والے کا گناہ زیادہ ہے، جیسا کہ حضرت امام رضاؑ سے دو افراد کے بارے میں سوال کیا گیا جنہوں نے ایک دُوسرے کو گالی دی تھی، آپؑ نے فرمایا کہ پہل کرنے والا زیادہ ظالم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جواب دینے والا بھی ظالم ہے۔

واجبات کی اُجرت لینا

مسئلہ: 790 واجبات کی اُجرت لینا بالکل حرام ہے، چاہے یہ واجبات عینی ہوں یا کفائی، اس لئے کہ جو کام شریعت نے اُجرت کے بغیر، سوائے اُخروی اجر کے، آپ پر واجب کیا ہے، اُس کی اُجرت لینا مفت خوری ہے، اگرچہ جس کیلئے اس واجب کو انجام دیا گیا ہو، اسے اس کی ضرورت ہو اور اس کے انجام دینے والے کو اس کے اخراجات بھی برداشت کرنا پڑیں، مثلاً امر بالمعروف اور نہی از منکر یا احکامِ واجبہ کی تعلیم یا واجباتِ میّت کی ادائیگی وغیرہ پر کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے اور اس قسم کے تمام موارد میں آپ کو طرفِ مقابل یا اس کے ولی سے اُجرت طلب کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر آپ

ضرورت مند ہوں تو بیت المال پر واجب ہے کہ آپ کے اخراجات کی کفالت کرے۔

مسئلہ: 791 یتیم کی سرپرستی سے متعلق اُمور کو انجام دینا ان کاموں میں سے ہے جن کی اُجرت لینا قطعاً حرام ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے جب وہ کام ان کاموں میں سے ہو جن پر عام طور پر مزدور وغیرہ نہ لگایا جاتا ہو۔ اس کی قوی دلیل یہ آیت ہے:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ. (6:4)

اگر یتیم کا ولی غنی اور خوشحال ہو تو اس پر یتیم کے اُمور کی اصلاح اور سرپرستی کی اُجرت نہ لینا واجب ہے اور اگر فقیر اور ضرورت مند ہو تو اپنی ضرورت اور یتیم کے مفادات کے پیش نظر اس کے مال میں سے کچھ لے لے۔

مسئلہ: 792 وہ واجباتِ کفائی جو معاشی نظام کی حفاظت کیلئے ہیں، اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں، اس لئے کہ معماری، مزدوری، زراعت، طبابت اور ان جیسے دُوسرے کام اسی صورت میں کئے جاسکتے ہیں جب ان سے زندگی کی معاشی ضروریات پوری ہوسکتی ہوں۔ صرف واجباتِ عبادتی کی مزدوری لینا حرام ہے، جیسا کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر، احکامِ واجبہ کی تعلیم، واجباتِ میّت اور ولایتِ یتیم کی مانند۔ لیکن معاشی واجبات کی اُجرت لینا حرام نہیں ہے بلکہ ان کا وجوب بھی صرف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب ان سے معاشی ضروریات کی تکمیل ہوسکتی ہو ورنہ یہ مفت خوری اور حرام ہے، مگر یہ کہ کام کرنے والا اور جس کیلئے کام کیا جائے، دونوں ایک دوسرے سے برابر اُجرت کے طالب ہوں اور ایک دُوسرے سے اپنے عمل کا معاوضہ طے کریں۔

معاشی اُمور سے متعلق ہر کام صرف اسی صورت میں اور اسی وجہ سے واجبِ کفائی مقرر کیا گیا ہے جب وہ خود عمل کرنے والے کی اور دُوسروں کی معاشی ضروریات کو پورا کرسکتا ہو، مثلاً ''**تجارۃ عن تراض منکم**''، جو اہم ترین واجباتِ کفائی میں سے ہے، صرف اسی صورت میں

بامعنی ہے، جب نافع ہواور زندگی کو چلاسکتی ہوورنہ تجارت نہیں بلکہ بطالت اور بیگاری ہے جو بیکاری سے بھی بدتر ہے۔

مسئلہ: 793 جس طرح ہر انسان پر فعل حرام انجام دینا حرام ہے، دُوسروں کواس پر مائل کرنا بھی حرام ہے اور جس طرح خود حرام کھانا اور پینا حرام ہے، دُوسروں کو حرام کھانا اور پلانا بھی اسی طرح حرام ہے۔

سونا اور ریشم

مسئلہ: 794 مرد پر ریشمی لباس پہننا اور سونے سے آرائش کرنا حرام ہے، مگر ضرورت کی حالت میں۔

مسئلہ: 795 مردوں پر عورت کا مخصوص لباس پہننا حرام ہے۔اس طرح عورتوں پر مردوں کا مخصوص لباس پہننا حرام ہے۔اسی طرح لباسِ شہرت پہننا بھی حرام ہے اوراس سے مراد وہ لباس ہے جو لوگوں کے اُنگلیاں اُٹھانے، تہمت، غیبت یا تمسخر کا موجب ہو۔

رِشوت

مسئلہ: 796 فیصلہ میں رشوت لینا اور رشوت دینا گناہانِ کبیرہ میں سے ہیں، چاہے اس کی وجہ سے ہی حاکم شرع صحیح حکم صادر کرے۔رشوت صرف مال دینے کی صورت میں نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ کام جو حاکم کو سربلند اور خوشحال کرے اوراس کے فیصلہ پر اثر انداز ہو، رشوت اور حرام ہے، اگرچہ یہ مالی رشوت نہیں بلکہ معنوی رشوت ہو۔

مسئلہ: 797 جس کام کی اُجرت حکومت یا کسی اور کی طرف سے لی گئی ہو، اس پر پیسے لینا اور دینا حرام ہے، مثلاً وہ سرکاری ملازم جس پر لوگوں کا کام کرنا واجب ہے اور وہ اپنے کام کی حکومت سے تنخواہ لیتا ہے، اس پر اپنے فرایض کی ادائیگی کے بدلہ میں لوگوں سے پیسہ لینا حرام ہے۔اگر جلدی کام انجام دینے کیلئے پیسہ لے مگراس سے دُوسروں کے حق میں تاخیر ہوتی ہو تو یہ حرام ہے۔لیکن اگر

دُوسروں کا حق ضائع نہ ہو تو فرائض کے اوقات سے زیادہ کام کی حیثیت سے یہ پیسہ لینا حرام نہیں ہے۔ بہرصورت مفت خوری کی تمام اقسام حرام ہیں، اگرچہ حرمت کے مراتب مفت خوری کے مراتب کے لحاظ سے مختلف ہیں۔

مسئلہ: 798 حکامِ شرع اور دُوسرے علمائے دین اگر ضرورت مند ہوں تو ان کی ضروریات کو بیت المال سے پورا کرنا چاہئے۔ انہیں لوگوں سے ایک پائی بھی لینے کا حق نہیں ہے، خصوصاً قضاتِ شرع (اسلامی حکومت کے جج صاحبان) کو تو بیت المال سے اس قدر ملنا چاہئے کہ ہر قسم کی دُوسری منفعت طلبی کا بہانہ زائل ہو جائے تاکہ کوئی زر و زور کا مالک ان کے فیصلہ پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

مسئلہ: 799 قضاوت کے علاوہ دُوسرے موارد میں اپنا جائز اور مسلم حق لینے کیلئے مال دینا حرام نہیں ہے، اگرچہ لینے والے پر یہ مال لینا حرام ہے، جیسا کہ ربا ہر حالت میں حرام ہے لیکن مجبوری کی حالت میں ربا دینا حرام نہیں ہے۔

منشیات

مسئلہ: 800 ہر نشہ آور چیز کا بنانا، کھانا پینا یا دُوسروں کو کھلانا پلانا، خریدنا، بیچنا اور اس سے متعلق دُوسرے تمام افعال مثلاً اس کیلئے مکان یا دُکان کرایہ پر دینا حرام ہیں۔

وہ چیزیں جن کا استعمال عموماً حرام ہوتا ہے

مسئلہ: 801 موسیقی اور جوئے وغیرہ کے آلات، جن کا فائدہ عام طور پر حرام ہے، ان کے متعلق ہر قسم کا نقل و انتقال حرام ہے، چاہے قیمت یا مزدوری کے ساتھ ہو یا بلا معاوضہ۔

گمراہ کن وسائل

مسئلہ: 802 کتابیں، کیسٹیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اگر لہو اور گمراہی کے وسائل ہوں تو نشہ آور اور دُوسری حرام اشیاء کی مانند ان کا کاروبار بھی حرام ہے۔

☆☆☆

کھانے پینے کی نجس چیزیں

مسئلہ: 803 کھانے کے تیل یا اس طرح کی دُوسری اشیائے خورد و نوش اگر نجس یا غصبی وغیرہ ہونے کی وجہ سے ان کا کھانا پینا حرام ہو تو ان کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ البتہ غصب کے علاوہ دُوسری صورتوں میں نجس ہونے کی وجہ سے حرام ہے لیکن غصب کی صورت میں کسی صورت میں بھی حلال نہیں ہے۔

جن حلال چیزوں کو حرام میں استعمال کیا جائے

مسئلہ: 804 جس شخص کے بارے میں علم ہو کہ وہ شراب بنانے کیلئے انگور خرید رہا ہے، اس کے ہاتھ انگور فروخت کرنا حرام ہے۔ اسی طرح ہر حلال چیز جسے خریدار حرام میں استعمال کرے، اس کا بیچنا شفاعتِ سیئہ ''بری شفاعت'' اور: **''وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''**۔(2:5) کی رُو سے حرام میں تعاون کرنے اور اس کا وسیلہ بننے کی وجہ سے مکمل طور پر حرام ہے۔

مسئلہ: 805 قتل وغارت کے وسائل قاتلوں اور غارت گروں کے ہاتھ فروخت کرنا حرام ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر، اس لئے کہ یہ بھی حرام میں تعاون کرنے اور اس کا وسیلہ بننے کی صورت ہے جو ممنوع اور حرام ہے۔

بے قیمت اشیاء یا افعال کا حکم

مسئلہ: 806 بے قیمت چیزوں کی خرید و فروخت اور لغو بے قیمت کاموں کی اُجرت دینا، سفاہت، بے عقلی اور مفت خوری اور مفت خورانی کی وجہ سے حرام ہے۔

شرط لگانا

مسئلہ: 807 شرط بندی کی تمام اقسام، جو لوگوں کے درمیان رائج ہیں، حرام ہیں، چاہے یک طرفہ شرط ہو کہ اگر تم فلاں کام کرو تو تمہیں اتنا پیسہ دوں گا۔ لیکن اگر اس کام میں اس شخص کیلئے کوئی

عاقلانہ فائدہ موجود ہوتو اس صورت میں یہ جعالہ ہوگا جو جائز ہے۔ اگر یہ شرط دوطرفہ ہوتو اس صورت میں یہ قمار یعنی جوا ہوگا۔لیکن عام طور پر جوشرط بندیاں دیکھنے میں آتی ہیں،ان میں شرط میں مقرر کئے گئے پیسے کے مقابل کوئی عاقلانہ منفعت اس مشروط فعل کے انجام دینے والے کیلئے نہیں ہوتی، لہٰذا یہ مفت خوری اور مفت خورانی کی وجہ سے حرام ہے۔کبھی اس میں جوئے کے پہلو کا اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔مثال کے طور پراگر کوئی کہے کہ ''خدا کیلئے مجھ پرواجب ہے کہ اگرتم پانچ کلوگرام انگور خرید سکو تو میں تمہیں ہزار روپے دوں گا''اس لئے کہ اس طرح مال کھلانا نہ صرف پسندیدہ کام نہیں بلکہ اسراف ہونے کی وجہ سے حرام بھی ہے۔اگر حلال بھی ہوتو نذر کرنے والے کیلئے یہ ہرگز کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔نذر میں یہ ضروری ہے کہ نذر کرنے والے کیلئے اس میں مادی یا معنوی فائدہ ہو اور جعالہ میں بھی،جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے،ضروری ہے کہ یہ معاہدہ عاقلانہ ہوتا کہ یہ عقد درست ہو۔

حیلہ گری اور دھوکہ دہی

مسئلہ:808 ہرقسم کی حیلہ بازی اور لوگوں کو دھوکہ دینا حرام ہے۔سب سے بدتر یہ کہ یہ حیلہ بازی شرعی احکام کی آڑ میں ہو۔اگر عام معمولی حیلہ بازی ہو تو بھی حرام ہے،اس لئے کہ مفت خوری یا لوگوں سے اپنے حق سے زیادہ مال حاصل کرنے کیلئے ہرقسم کی دھوکہ دہی اور حیلہ بازی:

''وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ''.(188:2)

''اور اپنے اموال کو آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ''۔

کی رُو سے حرام ہے۔

مسئلہ:809 سورۂ مبارکہ اعراف کی آیہ شریفہ کی رُو سے تمام گناہوں کو مختصر طور پر پانچ اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:

''قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ

سُلْطٰنًاوَّاَنْ تَقُوْلُوْاعَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ“ (33:7)

ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:

مسئلہ: 810 ”الفواحش“ سے مراد حد سے بڑھے ہوئے گناہ ہیں جن کی دو اقسام ہیں: ایک یہ کہ گناہ انجام دینے والے سے بڑھ کر کسی اور تک جا پہنچتے ہیں، جیسے قتل، چوری، تہمت، غیبت، فساد اور گمراہ کرنا وغیرہ۔ دُوسری قسم یہ ہے کہ گناہ بذاتِ خود معمولی حد سے بڑھا ہوا ہو، مثلاً شراب نوشی وغیرہ۔ بعض اوقات گناہ میں فحش کے یہ دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ مذکورہ گناہوں میں سے شراب نوشی کے علاوہ دُوسرے تمام گناہوں میں یہ دونوں پہلو موجود ہیں۔

مسئلہ: 811 ”ماظهر منها وما بطن“، ”ان میں سے جو ظاہر ہو اور جو پوشیدہ“، فحش کی مندرجہ بالا دو اقسام کے علاوہ آیت نے اس کی ظاہر اور باطن کے نام سے بھی دو اقسام بتائی ہیں۔ باطن سے مراد عقیدتی فحش جیسے شرک اور دُوسرے عقیدتی انحراف ہیں جبکہ ظاہر سے مراد ظاہری بت پرستی اور دیگر ظاہری گناہ وغیرہ ہیں۔

مسئلہ: 812 ”الاثــم“۔ ہر وہ کام، گفتگو، بیکاری اور نیت وعقیدہ جو انسان کو واجب فعل کی ادائیگی یا محرمات سے اجتناب میں سست کر دیں، سب ”اثم“ کے زمرہ میں آتے ہیں جس میں بہت سے گناہ داخل ہیں، اس لئے کہ صرف گناہ ہی نہیں بلکہ جو چیز انسان کو گناہ کے نزدیک کرے یا گناہ کو اس کیلئے آسان کر دے، وہ سب ”اثم“ ہیں جنہیں قرآن شریف کی 48 آیات میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

مسئلہ: 813 ”البغی بغیر الحق“ یعنی ناحق ظلم کرنا جو کسی کے ظلم کے جواب میں نہیں بلکہ ابتدائی ظلم ہے اور اس سے مراد کسی سے ناجائز طور پر کسی چیز یا کام کا مطالبہ کرنا بھی ہے۔ نیز ہر ناجائز مطالبہ اور ایسا ظلم جو کسی کے ظلم کا جواب نہیں ہے، ”البغی بغیر الحق“ ہے جو کہ حرام ہے۔

مسئلہ: 814 ”وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا“.

’’اور یہ کہ تم ایسی چیز کو اللہ کا شریک قرار دو جس کیلئے اللہ نے ربوبی تسلط قرار نہیں دیا ہے‘‘۔

اللہ تعالیٰ نے کسی بھی موجود، حتیٰ کہ کسی نبی کو بھی ربوبی تسلط عطا نہیں کیا ہے بلکہ سب کے سب اس کے محتاج ہیں اور رسلِ الٰہی صرف اس کا پیغام پہنچاتے ہیں۔شرک چاہے بت پرستی کی صورت میں ہو یا توحید میں انحراف کی صورت میں یا ریا کاری کی شکل میں، حرام ہے، اگرچہ ان سب کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔

مسئلہ:815 ’’وَاَنْ تَقُوْلُوْاعَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ‘‘یعنی’’اور یہ کہ تم اللہ کی طرف ایسی بات کی نسبت دو جو تم (قرآن وسنت کی رُو سے) نہیں جانتے ہو‘‘۔

بنابرایں وہ تمام احکام جن کی بنیاد قرآن وسنت نہ ہو اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کیا جائے، وہ اس آیت میں داخل ہیں۔مصیبت ہے اُن علماء پر جو کتاب و
سنت کی دلیل کے بغیر اللہ کی طرف کسی حکم کی نسبت دیتے ہیں۔

مسئلہ:816 بہرحال تمام بیرونی گناہ’’**ماظھر**‘‘اور تمام اندرونی گناہ’’**مابطن والاثم والبغی بغیر الحق**‘‘، یہ تمام گناہ اس ایک آیت میں بیان کردیئے گئے ہیں اور ان کی تفصیل قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہے۔آنکھ، زبان، منہ، شرمگاہ اور دُوسرے تمام اجزائے بدن کے گناہ جو ظاہری ہیں اور تمام رُوحانی گناہ یعنی برا عقیدہ، بری نیت، برا ارادہ باطنی گناہ ہیں۔ یہ سب ظاہری اور باطنی گناہ اس ایک آیت میں بیان کردیئے گئے ہیں۔گناہانِ صغیرہ وکبیرہ کو بھی قرآن وسنت میں بیان کردیا گیا ہے۔

والحمدللّٰہ ربّ العالمین